تلاش
اللہ
ممتاز مفتی

ممتاز مفتی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

297.4 Mumtaz Mufti
Talaash / Mumtaz Mufti.- Lahore: Al-Faisal Nashran , 2006.
272p.
1. Tasawaf　　I. Title card
ISBN 969-503-425-x

فروری 2006ء
محمد فیصل نے
تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت: -/225 روپے
AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street,Urdu Bazar,Lahore.Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com
e.mail : alfaisalpublishers@yahoo.com

فہرست

۱۱۔ پلاؤ کی دیگ

۱۲۔ دشمنی یا خوف

۱۳۔ انوکھا شہنشاہ

ممتاز مفتی کی یاد میں

ہمیں چھوڑ جانے سے چند روز قبل ممتاز مفتی مجھ سے کہنے لگے۔

''یار عکسی! تیرے لوک ورثہ دا کیہ فائدہ!''

''یار، یاد رکھنا، جب میں مرجاؤں تو دو شہنایوں والے اور ایک ڈھول والے کو بلوالینا اور گھر کے باہر خوب شادیانے بجانا، خوشی منانا۔ وعدہ کرو یار، ایسا ہی کرو گے۔''

والد سے کیا ہوا وعدہ تو میں نہ نبھا سکا۔

لیکن آج اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہمیں ممتاز مفتی کا سوگ نہیں منانا چاہیے بلکہ انھیں Celebrate کرنا چاہیے۔

So let us celebrate MUMTAZ MUFTEE

He was a gift to all us from ALLAH

مجھے یہ زعم تھا کہ میں ممتاز مفتی کے تمام رفقاء کو ذاتی طور پر جانتا پہچانتا ہوں اور پھر ان میں سے بیشتر تو میرے بھی دوست ہیں۔ لیکن یہ زعم ان کی وفات پر پاش پاش ہوگیا۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے اُمڈ پڑے۔ اچھے خاصے عمر رسیدہ بزرگ دھاڑیں مار مار رو رہے تھے۔ کچھ چیخ چیخ کر پکار رہے تھے:

''باپو، باپو! میں یتیم ہوگیا۔''

میں حیرت سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کیونکر یتیم ہوگیا؟ میں سوچتا رہا۔

میرا خیال تھا لوگ آئیں گے، مجھے سہارا دیں گے، گلے لگائیں گے، دلاسہ دیں گے،

غم بانٹیں گے۔ الٹا مجھے ہی ان سب کا دکھ بانٹنا پڑ گیا۔ اور تو اور وہ مولوی حضرات جنھوں نے ''لبیک'' کے چھپنے پر مفتی جی کے خلاف فتوے جاری کیے۔

یہ کون ہے جو بیت المکرم کو ''کالا کوٹھا'' کہتا ہے۔ اس کی یہ جسارت کہ حج کا تمسخر اڑائے کہ ''کوٹھے والا مجھے آنکھیں مار رہا ہے۔''

ان ہی میں سے ایک مولانا ممتاز مفتی کے قلم کو اسلام کی تلوار سے تشبیہ دینے لگا۔

میں حیرت سے سنتا رہا۔

اسی موقع پر جیب کترے بھی پیچھے نہیں رہے۔ جیب کتروں کا ایک پورا گروہ جنازے کے دوران ممتاز مفتی کے پرستاروں کو لوٹتا رہا۔ بہت سوں کی جیبیں کٹ گئیں۔

ایک صاحب جن کی جیب کٹ چکی تھی، فرمانے لگے: کیا مذاق ہے۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے بھی ہاتھ دکھا گئے۔ پاس ہی کھڑا احمد بشیر بولا:

نہیں صاحب! ممتاز مفتی جاتے جاتے سب کو کچھ دے گئے۔ جیب نہیں اپنا دل ٹٹولیں۔'' اور یہ کہیں کہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔

ممتاز مفتی جیب کتروں کو بھی کچھ دے گئے ہیں۔

ممتاز مفتی کو بچپن سے اپنے گھر کے ماحول سے سخت نفرت تھی۔ جب ان کے والد مفتی محمد حسین نے دوسری شادی کر لی تو ممتاز مفتی کی والدہ صغرا بی بی کی حیثیت گھر میں نوکرانی کے برابر رہ گئی۔

اپنے والد کے خلاف شدید غم و غصہ تھا۔

گھر چھوڑ کر چلے گئے۔

کتنے ہی برس، کئی سال بیت گئے۔ والد مفتی محمد حسین 90 برس کو پہنچے۔ لیکن ممتاز مفتی نہ ان سے ملے نہ کلام کیا۔

وہ ایسے ہی اگر کبھی کسی سے روٹھ جاتے تو برسوں بات نہ کرتے۔ بہت غصے والے تھے۔

بڑی بڑی خطائیں معاف کر دیتے۔ لیکن کسی چھوٹی سی بات پر روٹھ جاتے۔

ایف اے اور بی اے میں انگریزی امتحان میں ہمیشہ فیل ہوتے رہتے۔ کہتے تھے تعلیم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔

لیکن 1935ء میں بطور انگلش ٹیچر ملازم ہو گئے۔

اسکول میں انگریزی پڑھانے لگے۔

RECESSION کا دور تھے۔ چالیس روپے تنخواہ پائی۔

باپ INSPECTOR OF SCHOOLS تھا۔ کسی نے یوں ہی چھیڑ دیا۔ مفتی سفارشی ہے۔ باپ نے کہلوا بھیجا۔ گھر واپس آ جاؤ۔ بس اسی دن اسکول سے استعفی دے دیا۔ نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ شہر ہی چھوڑ دیا۔

ممتاز مفتی باغی تھے۔ والد، گھر بار، رشتہ دار، عزیز و اقارب سب کو چھوڑ چکے تھے۔ کسی رشتہ دار کی جرأت نہ تھی کی ممتاز مفتی کو ملے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ جس قدر باپ سے نفرت تھی، اسی قدر مجھ سے پیار تھا۔ کہتے، دیکھو اچھی! نہ تمہارا کوئی تایا ہے نہ پھوپھا، نہ ماما ہے نہ چاچا۔ بس ایک میں ہوں تمہارا ابا۔ میں ہی تمہارا دوست، اور میرے سب دوست بھی تمہارے دوست ہیں۔ والد سے نفرت اب پورے معاشرے کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔

اسی دور میں ممتاز مفتی نے گہما گہمی، چپ اور اسمارائیں جیسا ادب تخلیق کیا۔ وہ نفسیاتی افسانے جسے لوگ ''جنسی کہانیاں'' بھی لکھتے ہیں، دراصل ممتاز مفتی کی معاشرے کے خلاف کھلی بغاوت تھی، معاشرے کی گھٹن، رسم و رواج کی پابندیاں اور گرامر و زبان کی قیود کے خلاف۔ ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقا کا یہ اہم دور تھا۔

وہ صرف جنسی حوالے سے FREUDIAN نہ تھے بلکہ HATRED FATHER جو FREUD کے فلسفے کا اہم ستون ہے، ان پر پورا پورا لاگو ہوتا ہے۔

ان کی شخصیت میں تضاد ہی تضاد تھا۔

غصیل اور باغی ہونے کے باوجود ممتاز مفتی شرمیلے تھے۔ ڈرے ڈرے، سہمے سہمے، خوف زدہ، انتہائی احساس کمتری کے شکار۔

کبھی کسی بڑے افسر سے نہ ملتے۔

دفتر میں چپڑاسیوں اور کلرکوں کو دوست رکھتے۔ انھیں یار کہتے۔ انھیں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔

افسر سے خوف یا پھر شدید غصہ رکھتے۔

ایک افسر کو گھونسہ مارنے پر کئی سال معطل رہے۔

پیشاب کی حاجت ہو تو کبھی OFFICERS' TOILET نہ جاتے، TOILET STAFF تلاش کرتے ہمیشہ یا باہر کسی جھاڑی میں بیٹھنا گوارہ کر لیتے۔

1950ء کے لگ بھگ ممتاز مفتی میں تبدیلی آ گئی۔ اب وہ ایک مشہور افسانہ نویس تھے اور ریڈیو پاکستان میں بطور سکرپٹ رائٹر کام کرتے تھے۔ مختار صدیقی، مسعود قریشی، اشفاق احمد، یوسف ظفر، باقی صدیقی، محمد حسین ان کے ہم عصر دوست تھے۔

فطرت تو نہ بدلی، وہی شدت وہی غصہ۔ طبیعت کا تضاد اور حساس پن تو ویسا ہی رہا لیکن رخ بدل گیا۔

نہ جانے کسی بابے کی دعا تھی یا کسی بزرگ کی نگاہ یا خود قدرت اللہ شہاب کا چمتکار! یہ تو میں نہیں جانتا لیکن تبدیلی یقینی تھی۔

ممتاز مفتی کی تلاش ذات نے رخ تبدیل کر لیا۔ شخصیت کی صفات تو نہ بدلیں، البتہ ارتقاء نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی، ایک نیا راستہ اپنا لیا۔

پھر ممتاز مفتی بابوں اور خانقاہوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ عقیدت کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔

لیکن اس سفر میں ہر موڑ پر قدرت اللہ شہاب سے ان کے گہرے مراسم یا خط و کتابت رہی۔ آہستہ آہستہ ممتاز مفتی کی شدت مجذوبانہ رنگ اختیار کر تی گئی۔ ممتاز مفتی مجذوب ہو گئے۔

شکر ہے خدا کا کہ پورے پورے مجذوب نہ ہوئے لیکن کسی درجہ تک۔ ایسے ہی جیسے نارنجی میں کچھ کچھ مالٹے کا ذائقہ ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی میں بھی ایک مجذوب تھا۔

اسی دور میں ممتاز مفتی نے لبیک اور الکھ نگری جیسا ادب تخلیق کیا۔ خانہ کعبہ کو کالا کوٹھا یا

اللہ کو کوٹھے والے سے تشبیہ دینا کسی مجذوب کی تحریر تو ہو سکتی ہے، ہوش مند ادیب کی نہیں۔ اور کسی مجذوب ہی کو یہ قبولیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایسی گستاخانہ باتیں لکھے اور صاف بچ نکلے۔ آپ اور میں پورے ہوش میں ایسی تحریر نہیں لکھ سکتے۔

پھر ایک دن اچانک قدرت اللہ شہاب چل بسے۔ ممتاز مفتی کے خواب ادھورے رہ گئے۔ عقیدت کے وہ تانے بانے جو ممتاز مفتی نے قدرت کی ذات کے گرد بُن رکھے تھے، ٹوٹ گئے۔ بے محل وقوع بے جہت ہو گئے۔ وہ اجلی کرن، پاکستان کا عروج جس کا ممتاز مفتی کو یقین تھا کہ وہ قدرت کی زندگی ہی میں حقیقت بن جائے گی، بکھر کر رہ گئی۔ ممتاز مفتی کا مدار چھن گیا۔

قدرت کے مرنے کے چند ہی سال بعد ممتاز مفتی کا محبوب بیٹا عکسی مفتی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ عکسی نے دوسری شادی کر لی۔

ممتاز مفتی کو دوسری شادی سے سخت چڑ تھی۔ اس نے اپنے والد کو کبھی معاف نہیں کیا تھا۔

بیٹا دوسری شادی کرتے ہی گھر چھوڑ گیا تو ممتاز مفتی بالکل تنہا رہ گیا، تن تنہا۔ اس کی نفرت بے معنی ہو کر رہ گئی۔

اس کی موج در موج محبت اور عقیدت کا نہ کوئی ساحل رہا نہ کنارہ۔

وہ اکیلا تن تنہا OLD MAN & THE SEA کی طرح چپو مار مار کر اپنی کشتی ٹھیلتا رہا۔ اس میں زندگی کی امنگ اب بھی باقی تھی۔

آخری سانس تک ممتاز مفتی کی آنکھوں میں چمک تھی۔ قلم میں تلوار جیسی کاٹ تھی۔ وہ علی پور کا ایلی تھا۔ ہار ماننا اس کا شیوہ نہ تھا۔

لیکن اب مفتی دھیما پڑ چکا تھا۔ مجذوبیت رنگ بدل کر فقیری میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک بوسیدہ بستر پر پڑا رہتا یا پھر رنگین ٹکڑیوں والی رلی پر بیٹھ کر کچھ لکھتا رہتا۔ کچھ سوچتا رہتا۔ لوگ یوں ہی کھچے چلے آتے۔ لوگوں کی سیوا اس کا مسلک بن چکا تھا۔ ایک گھنے درخت کی طرح اس کا سایہ دور دور پھیل چکا تھا۔ لیکن اس کی تلاش ختم نہ ہوئی تھی، حالانکہ وہ

بہت تھک چکا تھا۔ اس کی آرزو جوان تھی۔ اس کی جستجو میں چمک تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا نہ تھا۔ اس کا سفر جاری تھا۔

''قلم میں لامکاں کی آرزو رکھنا
90 یا نو سو سال، آخر ٹوٹ جاتی ہے
گئے ممتاز مفتی جی
ازل سے تا ابد پھیلی
کہانی رو پڑی ہے''

ممتاز مفتی کی زندگی دراصل ایک طویل تلاش ہے۔ ان کی آخری تصنیف کا نام بھی ''تلاش'' 1905ء سے لے کر 1945ء تک جو کچھ ان پر بیتا، اس کا نام ایلی رکھا۔ یہ پہلا حصہ ممتاز مفتی کی عالم اشہادہ کی روئیداد ہے۔ علی پور کا ایلی تلاش ذات کا ناول ہے۔

1950ء سے 1990ء تک کی آپ بیتی کو الکھ نگری کا نام دیا۔ یہ دوسرا حصہ ممتاز مفتی کا عالم الغیب کا سفرنامہ ہے۔ لبیک اور الکھ نگری دراصل تلاش خدا کی روئیداد ہے۔ دونوں ہی ممتاز مفتی کی تلاش ہیں۔ وہ مشاہدات ہیں جن میں سے ممتاز مفتی گزرا اور جن کی بدولت مفتی ''ممتاز'' ہو گیا۔ اور دونوں تصانیف میں بلاشبہ بہت تضاد ہے۔

خود ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

> ''علی کے ایلی کے دھواں دھار اندھیرے آنے والی کرن کو مزید چمک بخشیں گے۔ ایلی کے اندھیرے اور الکھ نگری کے چمکیلے خواب ایک دوسرے سے جس قدر مختلف ہیں، اسی قدر ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کی اہم کڑیاں ہیں۔ یہ ایک ہی عمل کے دو ASPECT ہیں، دو رخ ہیں۔

اس عمل کے دوران کئی شخصیات، کردار، روحانی بابے، بزرگ، عامل پروفیسر حتیٰ کہ خود قدرت اللہ شہاب سنگ میل تو ضرور ہیں، منزل نہیں۔ ممتاز مفتی کا سفر یہاں ختم نہیں ہوتا، جاری ہے۔

ممتاز مفتی کی تلاش جاری ہے۔

ان کی وفات کے بعد ایک لڑکی نے فیصل آباد سے مجھے خط لکھا۔ لکھتی ہیں

> ''ممتاز مفتی کبھی مر نہیں سکتے۔ آج بھی وہ اپنی تحریروں کے اندر زندہ ہیں۔ اپنے جذبے کی پوری سچائی کے ساتھ، اپنی خوبصورت عقیدت کے ساتھ۔ ان کی تلاش بھی ان کی طرح ہی خوبصورت تھی۔ ان کو خدا ملا یا نہیں، یہ تو وہ جانتے ہوں گے مگر شاید آپ؟ مگر میری تمنا تھی کہ کاش! خدا میرے پاس ہوتا تو میں انھیں دے دیتی۔''

اب سے بہت سال پہلے کی بات ہے جب میں گارڈن کالج میں پروفیسر تھا۔ ایک روز کالج کے چند طالب علم میرے گھر آئے اور ممتاز مفتی سے کہنے لگے، ''اچھا تو آپ عکسی مفتی کے باپ ہیں۔''

یہ سن کر میرے والد کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

اسی شام اپنے ایک دوست سے کہنے لگے۔

''یار! آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا، لوگ ممتاز مفتی کو بیٹے کے حوالے سے پہچانیں گے۔''

بس مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کہا، والد صاحب! اب پتہ چلا جو دل کو لگی۔

آخر میرا حوصلہ دیکھیں! پچھلے 38 برس سے آپ ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہوں۔ کالج میں پروفیسر ہوں، شعبہ نفسیات کا سربراہ ہوں، کئی قسم کے پاکھنڈ کرتا ہوں لیکن پھر بھی لوگ یہی کہتے ہیں، وہ ''ممتاز مفتی کا بیٹا۔''

بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا:

SIR پچھلے 38 برس میں نے زندگی آپ کی طرز پر گزاری ہے، اب میں اپنے طور پر رہنا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دیں۔

ممتاز مفتی نے تھوڑی دیر سوچا اور کہنے لگے۔

جاؤ عکسی! اجازت ہے۔

اسی دن میرا اور ممتاز مفتی کا راستہ الگ ہو گیا۔
اب میں 52 برس کا ہوں
کئی سال گزر چکے ہیں
لیکن آج مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ممتاز مفتی کا بیٹا ہوں۔
ممتاز مفتی ہی میری پہچان ہے۔
ممتاز مفتی ہی میرا ورثہ ہے۔
اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی اعزاز نہیں۔

عکسی مفتی
31 Oct - 1995
اسلام آباد

☆

یہ کتاب

یہ کتاب نہ فلسفہ بگھارتی ہے۔
نہ علمیت چھانٹتی ہے۔
نہ دانشوریاں پیش کرتی ہے۔

اگر آپ سنجیدہ اور مدلل مُطالعہ کے خواہش مند ہیں تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ یہ کتاب نہ پڑھیں، خوانخواہ وقت ضائع ہوگا۔

سچی بات یہ ہے کہ یہ کتاب کتاب ہی نہیں۔ میں نے بڑی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب نہ بن جائے ''بکش'' نہ ہو جائے۔ بوجھل نہ ہو جائے، اونچی باتیں نہ کرے جو سر کے اوپر سے گزر جائیں۔

یہ کتاب آپ سے باتیں کرے گی۔ ہلکی پھلکی باتیں۔ چھوٹے چھوٹے موضوعات پر باتیں۔ ممکن ہے آپ کو اس کی کچھ باتوں سے اتفاق نہ ہو۔ ایسا ہو تو ازراہ کرم اس کی بات کو پلے نہ باندھیں۔ جھگڑا نہ کریں۔ صاحبو! دلیلوں سے کبھی کوئی قائل نہیں ہوا۔ اختلاف رائے تو ہوتا ہی ہے۔ اسی سے تو زندگی رنگ بھری ہے۔

اس کتاب کا نام غلط ہے۔ غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے۔ قاری کہے گا اگر تلاش ہے تو منزل بھی ہوگی۔ لیکن یہ ایسی تلاش ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ صرف تلاش ہی تلاش ہے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ کس چیز کی تلاش ہے۔ کبھی شک پڑتا ہے کہ مسلمان کی تلاش ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ شاید دور حاضرہ کی حقیقت کی تلاش ہے۔ کبھی ایسے لگتا ہے کہ یہ تو سچ کی تلاش ہے۔ حتمی سچ کی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی سچائیوں کی۔ سوچوں کی سچائیاں، عمل کی

سچائیاں، ایمان کی سچائیاں، برتاؤ کی سچائیاں، رسمی سچائیاں، پرانی سچائیاں، نئی سچائیاں۔

کسی نے بوٹے سے پوچھا: بوٹے بوٹے! یہ بتا کہ تو اگنے میں اتنی دیر کیوں لگاتا ہے؟

بوٹا بولا، اس لیے کہ زمین کی کشش مجھے اگنے نہیں دیتی۔

ہائیں! ایسا ہے۔ بری بات!

بوٹا بولا، نہ زمین کو برا نہ کہو۔

کیوں نہ کہیں۔

اس لیے کہ اگر زمین مجھے اگنے سے نہ روکے تو میں کبھی نہ اگ سکوں۔

وہ کیا بات ہوئی؟

رکاوٹ نہ ہو تو حرکت ممکن ہی نہیں۔ یہ قانون فطرت ہے۔ صاحبو! رکاوٹیں دراصل رحمتیں ہیں۔ رکاوٹیں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ جن کے پہنچ جانے کا خطرہ ہو، ان کے راستے میں رکاوٹیں آتی ہیں۔ اگر بڑے رکاوٹیں کھڑی نہ کریں تو چھوٹوں میں احتجاج پیدا نہ ہو۔ Revolt نہ ہو۔ حرکت پیدا نہ ہو۔

اور حرکت نہ ہو تو زندگی نہ ہو، کچھ بھی نہ ہو۔

یہ دنیا تصویر کی طرح فریم میں ٹنگی رہے۔

یہ زندگی کیا ہے؟

قیام اور حرکت کا اک کھیل ہی تو ہے۔

کبھی قیام آ جاتا ہے اور آتے ہی حرکت پر دفعہ 144 لگا دیتا ہے۔ خبردار! حرکت نہ کرنا، حرکت گناہ ہے۔ حرکت شیطانیت کا کھیل ہے۔

پھر حرکت کا ریلا آتا ہے، سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

کائنات کی پیدائش کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں:

"پہلے قیام ہی قیام تھا۔ پھر ہم نے ایسی پھونک ماری کہ سب کچھ متحرک ہو گیا۔ آسمان الگ ہو گئے۔ زمینیں الگ ہو گئیں۔ سیارے بھنبھیریوں کی طرح گھومنے لگے۔ سورج بھڑ بھڑ جلنے لگے۔ چاند زمینوں کے گرد چکر کھانے لگے۔ ماد ے وایسا دھچکا لگا کہ آج تک اس پھونک کا زور ختم نہیں ہوا۔ آج بھی کائنات بلبلے کی طرح پھیلے جا رہی ہے۔ پھیلے جا رہی ہے۔ ہر چیز حرکت میں ہے۔ مسلسل حرکت۔

یہ کتاب چھوٹوں کے لیے ہے۔

عرصہ دراز سے ہمارے ہاں بڑوں نے اقتدار پر قبضہ کر رکھا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر براجمان ہوئے بیٹھے ہیں۔ مناپلی بنا رکھی ہے۔ اخلاقیات پر، مذہب پر، سوجھ بوجھ پر۔ بڑے کہتے ہیں، ہم جانتے ہیں۔ لہٰذا ہر بات پر ہم سے پوچھ کر کی جائے۔ وہ چھوٹوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ چھوٹے بالغ ہو جائیں، پھر بھی انھیں فرد کی حیثیت نہیں دیتے۔ بڑوں کی نگاہوں میں وہ چھوٹے ہی رہتے ہیں۔ اس بے قدری کی وجہ سے چھوٹوں میں منفی رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ یوں ہمارا مستقبل داغدار ہو جاتا ہے۔

ہاں تو یہ کتاب چھوٹوں کے لیے ہے، لیکن در پردہ بڑوں کو متوجہ کرتی ہے۔ پنجابی میں ایک مثل ہے۔ دھیوڑیے گل سن، نیوڑیے کن کر۔ مطلب یہ کہ ساس بظاہر اپنی بیٹی کو جھاڑ جھپٹ کرتی ہے۔ یہ محض دکھاوا ہوتا ہے۔ دراصل وہ بہو کو سرزنش کر رہی ہوتی ہے۔ یہ کتاب بھی کہتی ہے، چھوٹے گل سن، بڑے کن کر۔

دقت یہ ہے کہ بڑے کن نہیں کرتے، سنتے نہیں۔ انھیں بولنے سے فرصت ہو تو سنیں۔ صاحبو! بڑوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں۔ جو سمجھتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے، اسے سننے کی کیا ضرورت ہے اور جو سنے ہی نہیں، اسے کون سمجھائے۔ یہ کتاب جگہ جگہ اسلام کی باتیں کرے گی۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ مصنف اسلام کو سمجھتا ہے۔ بے شک اس نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ چار ایک سال ہو گئے، علما کی کتابیں پڑھی ہیں۔ دینی رہنماؤں کی تفسیریں پڑھی ہیں۔ لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی۔ لگتا ہے جیسے اسلام بھی اللہ کے جملہ بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔ بہر حال اس مطالعے کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کو نہیں سمجھتے لیکن سمجھتے ہیں کہ سمجھنے میں ان کی پہچان ہو گئی ہے۔

یہ کتاب بھی سمجھ میں آ گئی ہے کہ مروجہ اسلام کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو اس سے ثواب کمایا جا سکتا ہے اور دوسرے اسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ ثواب کمانا بھی تو استعمال کرنے کی ہی ایک صورت ہے۔

بہرحال لوگ اسے بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔ حکمران اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ سیاستیے اپنی سیاست چمکانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لیے علمائے دین پیش پیش ہیں۔ انھوں نے عالم کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے دین کو جو سراسر عمل ہے، علم میں بدل دیا ہے۔ بڑے بڑے پگڑ باندھ کر چغے پہن کر آنکھوں کو کاجل اور داڑھی کو خضاب سے رنگ کر عالم دین بن بیٹھے ہیں اور اب اس بات کے خواہاں ہیں کہ اقتدار پر قابض ہو جائیں۔

ہم نے اس کتاب کا دیباچہ چھوٹوں سے لکھوایا ہے۔ یہ عمر میں چھوٹے ہیں، ویسے بڑے Talented ہیں۔ ان میں ایک شاعرہ ہے، بڑی شاعرہ جو بھاں بھار کھڑی خود کو اور گرد و پیش کو دیکھ رہی ہے۔ ''بھاں بھار'' ہی اس کتاب کی روح ہے۔ چونکہ یہ کتاب ایلس ان ونڈر لینڈ ہے۔ ایک دیباچہ نگار افسانہ نویس ہے۔ ایک ادب بولتی ہے، لکھتی نہیں۔ ایک سوچوں بھری پٹاری ہے، مگر اظہار کے حق میں نہیں۔ بہرحال جیسی کیسی بھی ہے، یہ کتاب حاضر خدمت ہے۔

ممتاز مفتی

ستمبر 1995ء

☆

باب 1

جذبۂ احترام

کتنا بڑا المیہ ہے کہ میں 88 سال کا ہو گیا ہوں لیکن آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے۔ میں نے علماء دین سے پوچھا ہے، اسلامی کتابیں پڑھی ہیں، لیکن بے کار۔ عالم بات کو اور بھی الجھا دیتے ہیں۔ کتابیں فلسفے چھانٹتی ہیں۔

نہیں نہیں۔ میں غیر مسلم نہیں ہوں۔

اللہ کے فضل سے مسلمان ہوں۔

میں نے مسلمان گھرانے میں پرورش پائی ہے۔

45 سال سے میں اس ملک کا شہری ہوں جو آئین کے مطابق اسلامی جمہوریہ ہے۔

اس کے باوجود مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے۔

یقین کیجیے میں پڑھا لکھا فرد ہوں۔

کئی ایک ممالک کے مسلمان دیکھے ہیں۔ ان سے ملا ہوں۔ اسلام پر ان کے لیکچر سنے ہیں۔

اس کے باوجود مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے۔

اسلامی کتابیں

اسلامی کتابوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مجھ جیسے مبتدیوں کے لیے نہیں لکھی جاتیں۔ یا علماء کے لیے لکھی جاتی ہیں یا جذبات میں لتھڑے ہوئے قاری کے لیے۔ دینی کتابوں میں موٹے موٹے عالمانہ الفاظ ہوتے ہیں۔ فقہ کے بڑے بڑے مسائل ہوتے

ہیں، مراقبے ہوتے ہیں، مجاہدے ہوتے ہیں، ذکر ہوتے ہیں، اذکار ہوتے ہیں جو مجھے جیسے عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آتے۔

ایک بار مجھے رائے ونڈ کے تبلیغی میلے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ جگہ جگہ علماء تقریریں کر رہے تھے۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ اگرچہ تقریر میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ جوش ہوتا ہے، جذبہ ہوتا ہے، خطابت ہوتی ہے، نعرے ہوتے ہیں لیکن اثر نہیں ہوتا۔ دلیلیں تو ہوتی ہیں مگر پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ لیکن ایسے ہوتا ہے کہ بحث یا دلیل سے کبھی کوئی قائل نہیں ہوا۔ آج کل سیمینار کا رواج عام ہو رہا ہے۔ مقرر تقریریں جھاڑتے ہیں، سامعین اونگھتے ہیں۔ تقریر میں ''پلیٹ فارم اش'' (Plate Formish) عنصر ہوتا ہے۔ نمائش ہوتی ہے، شوکت نفس ہوتی ہے۔ جس بات میں نمائش کا عنصر ہو، التزاماً دوسروں پر اثر ڈالنے کی کوشش ہو، وہ بات دل کو نہیں لگتی۔

علماء کی تقریریں پہلے سے تیار کی ہوئی ہوتی ہیں۔ رٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ تھیٹریکل ہوتی ہیں۔ صرف ہونٹوں سے ڈیلور (Deliver) کی جاتی ہیں۔ ان میں دل شامل نہیں ہوتا۔ دل شامل نہ ہو تو اثر کیسا؟ تبلیغی میلے میں جگہ جگہ پنڈال بنے ہوئے تھے۔ تقریریں ہو رہی تھیں۔ دھواں دھار تقریریں۔ جذبات کے فوارے چل رہے تھے۔ پھوار اڑ رہی تھی۔ نعرے لگ رہے تھے۔ جوش و خروش ایسا جیسے لام لگی ہو۔ میلا لگا ہوا تھا۔ سبھی کچھ تھا، صرف تبلیغ نہیں تھی۔

تبلیغی میلے میں بیسیوں کتابوں کے سٹال لگے ہوئے تھے۔ یہ سٹال اسلامی کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک سٹال پر میں نے چند ایک کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں۔ ایک کتاب کی ''قیمت'' پوچھی۔ سٹال والے نے کہا ''ساٹھ روپے۔''

میں حیران رہ گیا۔ اس کی لکھائی چھپائی اور ضخامت کی کتاب کی قیمت کسی طور ڈیڑھ سو روپے سے کم نہیں ہو سکتی۔

''اتنی کم قیمت!'' میں نے حیرت سے پوچھا ''علمی ادبی کتابوں کی قیمت تو اس سے کئی گنا ہوتی ہے۔''

وہ مسکرایا، بولا: ''اسلامی کتابوں کی قیمتیں کم ہوتی ہے۔ چونکہ اسلامی کتابیں پاکستان میں بہت زیادہ بکتی ہیں۔ لہٰذا ان کی Mass Production ہوتی ہے۔ لاگت کم آتی ہے۔ منافع کی شرح کم رکھی جاتی ہے..... آپ کون سے کتاب خریدنا چاہتے ہیں؟'' سٹال والے نے پوچھا۔

''میں ایک ایسی کتاب خریدنا چاہتا ہوں جس میں سادہ انداز میں بتایا گیا ہو کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے؟''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ بولا ''کیا آپ غیر مسلم ہیں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا ''اللہ کے فضل سے میں مسلمان ہوں۔''

''آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟'' اس نے کہا۔

''دراصل میں پیدائشی مسلمان ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''منہ زبانی مسلمان!'' وہ ہنسنے لگا۔ بولا: ''جس نے کلمہ پڑھ لیا، وہ مسلمان ہے۔''

''بالکل! میں نے بھی کلمہ پڑھ لیا ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے؟''

''تو اسلام پر کتابیں پڑھیے۔'' وہ بولا۔

''پڑھی ہیں، بہت پڑھی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے کنفیوز ہو گیا ہوں۔ ویسے بھی کتاب اور چیز ہے، مسلمان اور چیز۔'' میں نے جواب دیا۔

تذکرے

''اچھا!'' وہ بولا ''تو پھر آپ تذکرے پڑھیں۔''

''تذکرے! وہ کیا ہوتے ہیں؟''

''وہ صوفیوں اور بزرگوں کی زندگیوں پر کتابیں ہوتی ہیں۔''

''ان کی سوانح ہوتی ہیں کیا؟''

''ہاں ہاں! سوانح ہوتی ہیں۔''

میرے ذہن میں امید کی ایک کھڑکی کھل گئی۔

چار ایک تذکرے پڑھنے کے بعد مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ تذکرے سب ایک جیسے تھے۔ ان میں تین باتیں نمایاں تھیں۔ ایک تو سر کار قبلہ تھے جو احترام کے گاڑھے شیرے میں بری طرح سے لت پت تھے، اس حد تک کہ انسانی خدو خال نظر نہیں آتے تھے۔

وہ انسان نہیں لگتے تھے۔ جیسے کوئی اور مخلوق ہوں۔ فرشتے اور انسان کے درمیان کی مخلوق میرے دل میں صوفیا اور اولیائے کرام کی بڑی عزت ہے، اس لیے کہ وہ عظیم انسان تھے۔ عظیم انسان وہ ہوتا ہے جو انسان ہو، اعلیٰ کردار کا مالک ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان ایک کردار ہے جو اللہ کے احکامات پر عمل کرنے سے وجود میں آتا ہے۔

کسی تذکرے میں صاحب تذکرہ کے اعلیٰ کردار کی بات نہ کی گئی تھی۔ صرف کرامات تھیں۔ کرامات ہی کرامات جیسے وہ جادوگر ہوں۔ کوشش کی گئی تھی کہ صاحب تذکرہ کو سپرمین کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

جہاں تک مجھے علم ہے، اسلام میں سپرمین نہیں ہوتا۔ کسی سپرمین کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں بشریت کا درجہ بہت بلند ہے۔ انبیاء بھی انسان تھے اور حضور اعلیٰ کی عظمت اس لیے ہے کہ وہ عظیم انسان تھے۔ اس حقیقت کو غیر مسلم بھی تسلیم کرتے ہیں۔

تذکروں میں احترام کا گاڑھا ملبہ ہوتا ہے۔ آدھی کتاب تو القابات اور حضوریات سے بھری ہوتی ہے۔ احترام ہی احترام۔

احترام

صاحبو! دعا کرو کہ کوئی محترم نہ بنے۔

سیانے کہتے ہیں، احترام ایک دیوار ہے جو محترم اور احترام کرنے والے کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ جو قرب پیدا ہونے نہیں دیتی۔ جو خوف پیدا کرتی ہے۔ خوف مثبت نہیں، منفی جذبہ ہے اور احترام کا جذبہ باہمی محبت کے امکانات کو کم کر دیتا ہے۔

مثلاً باپ بیٹے کا رشتہ لیجیے۔ بیٹے پر لازم ہوتا ہے کہ وہ باپ کا احترام کرے۔ اسی وجہ

سے باپ اور بیٹا کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے۔

ایک دانش ور نے کیا خوب کہا ہے: ''اگر دو فرد پاس پاس بیٹھے ہوں لیکن ایک دوسرے سے کہنے کے لیے ان کے پاس کوئی بات نہ ہو تو جان لیجیے کہ وہ باپ اور بیٹا ہیں۔''

رشتے کے لحاظ سے اتنے قریب، برتاؤ کے حوالے سے اتنے دور۔ یہ جذبہ احترام کا اعجاز ہے۔ پتہ نہیں ایسے کیوں ہوا کہ باپ کو محترم بنا کر اولاد سے دور کر دیا گیا۔ اس دوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ فادر ہوسٹیلٹی (Father Hostility) کا جذبہ پیدا ہوا اور اس Love Rate تعلق کی وجہ سے آج جنریشن گیپ کا مسئلہ وجود میں آیا ہے۔

آج کے نوجوانوں پر نکتہ چینی کرو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ سارا قصور بڑوں کا ہے۔ انھوں نے ہماری تربیت ٹھیک طرح سے نہیں کی۔ بڑوں نے ہمیں حقیر جانا۔ ہمیں بولنے نہیں دیا۔ ہمارے دلوں میں خوف کے جالے تن دیے۔ چھوٹے سچ کہتے ہیں، واقعی ہم نے انھیں بولنے نہیں دیا۔ جب بھی انھوں نے کچھ کہنا چاہا، ہم نے انھیں ''ہشت! بڑوں کے سامنے بولتا ہے'' کہہ کر چپ کرا دیا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ساری چالاکی ماں کی ہے۔ ماں کی Lust for Pssession اس قدر شدید ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ بچے باپ کے قریب ہوں، اس لیے کہ اگر باپ کے قریب ہو گئے تو ماں سے دور ہو جائیں گے۔ اس لیے وہ ایسا طریق کار اپناتی ہے کہ بچے باپ سے ڈریں، اس کے قریب نہ جائیں۔

ہمارے معاشرے میں ماں بچوں کو باپ سے ڈراتی رہتی ہے۔ ''نہ نہ نہ۔ ایسا نہ کرو بیٹا۔ اگر ابا کو پتہ چل گیا تو پٹ جاؤ گے۔''

''میں تیرے ابو کو بتا دوں گی کہ تو نے اس روز جھوٹ بولا تھا۔''

''خاموش! ابو آ رہے ہیں۔''

ہمارے گھروں میں ایسے جملے عام سنائی دیتے ہیں۔

بچے سمجھے ہیں کہ جھوٹ بولنا برا نہیں۔ بس ابو کو پتہ نہ چلے۔ ماں کے سامنے چاہے دنگا فساد کرو لیکن ابو کے سامنے نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے سمجھتے ہیں کہ باقی سب ٹھیک ہے لیکن

ابو بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

ماں بچوں کو خبردار کرتی رہتی ہے کہ ابو کا احترام لازم ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں کہتی کہ میرا احترام کرو۔ مجھ سے ڈرو۔ وہ بچوں کے دلوں میں اپنے لیے محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور باپ کے لیے خوف کا۔

ایک مغربی مزاح نگار نے ایک کتاب لکھی۔ نام تھا: "They and I"۔ نام پر میں حیران ہوا۔ یا اللہ یہ کیسی کتاب ہے۔ اس کا موضوع کیا ہوگا۔ پڑھ کا پتا چلا کہ گھر کے موضوع پر ہے۔ مصنف کا کہنا تھا کہ گھر ایک یونٹ نہیں ہوتا بلکہ دو یونٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک جانب ماں اور بچے اور دوسری جانب باپ اکیلا ''دے اینڈ آئی''۔

یہ افراق و تفریق احترام کی وجہ سے ہوتی ہے۔

ماں بچوں کو باپ سے ڈراتی ہے۔

باپ سمجھتا ہے کہ میرا احترام ہو رہا ہے۔

مجھے ''ماسٹر آف دی ہاؤس'' کا منصب مل رہا ہے۔

باپ کا ''شاون ازم'' تسکین پاتا رہتا ہے۔ اسے شعور نہیں ہوتا کہ جذبۂ احترام نیچے ہی نیچے محبت کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔

قرآن حکیم

دوستو! باپ بڑی ہی معصوم اور احمق مخلوق ہے۔

صاحبو! کیا تمھیں پتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں کس نے سب سے زیادہ ظلم ڈھائے ہیں؟ (1) ساس اور (2) باپ نے! بے شک ماں محبت کا سرچشمہ ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہے لیکن وہ سمجھتی ہے کہ یہ میرا ہے، صرف میرا۔ کسی دوسرے کو اسے اپنانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ پھر جب بہو گھر میں آجاتی ہے تو وہ بیٹے کو بہو کے ساتھ Share کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ وہ بہو کو اپنا حریف سمجھتی ہے۔ حسد یا جیلسی کا جذبہ جاگتا ہے اور وہ بہو پر بہانے بہانے سے چوری چھپے ہر ممکن ظلم ڈھاتی

ہے اور بیٹے کی ازدواجی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

باپ اپنے بیٹے کو کبھی مساوات کا حق دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ بیٹا چاہے بالغ ہو جائے، باپ اسے فرد کی حیثیت نہیں دے گا۔ سمجھے گا کہ یہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ میرے جسم کی ایک ناپاک چھینٹ سے پیدا ہوا ہے۔ بچہ ہے۔ ناتجربہ کار ہے۔ بے وقوف ہے۔

باپ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا خود کو باپ جیسا بنائے۔ باپ کے اصولوں پر چلے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بیٹا اپنے دور کے مطابق زندگی بسر کرے۔ ہر بڑا نئے دور کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ نئی جنریشن کے بارے میں سمجھتا ہے کہ وہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ کوئی باپ بیٹے کو برابری کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بیٹے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوگا لیکن اپنے خیالات کی قربانی نہیں دے گا۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میری بیوی کے جذبۂ احترام کی وجہ سے میں آج تک قرآن حکیم نہیں پڑھ سکا۔

میری عمر 88 سال کی ہو چکی ہے لیکن مجھے علم نہیں کہ اللہ نے بنی نوع انسان کے لیے کیا پیغام بھیجا ہے؟

یقیناً آپ میری بات پر ہنس دیں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اللہ سے میرا تعارف 1955ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں دوست بن گئے۔ یہ دوستی آج بھی قائم ہے۔ جب بھی میں فارغ ہوتا ہوں...... اکیلا تو وہ چپ چاپ میرے قریب آکر بیٹھتا ہے۔ پھر میں اسے اپنے دکھ درد سناتا ہوں اور وہ چپ چاپ سنتا ہے۔ سراپا ہمدردی بن کر مجھے حوصلہ دیتا رہتا ہے۔ اللہ سے دوستی کے باوجود ابھی تک مجھے علم نہیں کہ اللہ نے بندے کے نام کیا کیا پیغام بھیجے ہیں۔ کیا کیا احکامات جاری کیے ہیں۔ اس لیے کہ میں نے آج تک قرآن نہیں پڑھا۔ یقین جانئے میں سچے دل سے قرآن کو الہامی کتاب سمجھتا ہوں۔ جانتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اسلام سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اکیسویں صدی میں دنیا بھر کے سائنس دان، دانشور اور مفکر اس حقیقت کو جان لیں گے، مان لیں گے کہ اسلام واحد مذہب ہے جو دور حاضر کے لیے قابل قبول ہے۔ اس کے

باوجود اپنی بیوی کے جذبہء احترام کی وجہ سے میں نے آج تک قران کریم کا مطالعہ نہیں کیا، نہیں کر سکا۔

میری بیوی ایک نیک خاتون ہے۔

وہ باقاعدہ نماز پڑھتی ہے اگر کوئی نماز چھوٹ جائے تو وہ سارا دن جذبہ تاسف میں مبتلا رہتی ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ ثواب حاصل کرنے کے لیے وہ بلاناغہ تلاوت کرتی ہے۔

قرآن کریم کے لیے اس کے دل میں بڑا جذبہء احترام ہے۔

وہ قرآن کریم کو ریشمی جزدان میں ملفوف رکھتی ہے۔

ایک نہیں دو تین جزدانوں میں۔

وہ قرآن حکیم کو الماری کے سب سے اونچے خانے میں رکھتی ہے۔ درمیانے خانے میں رکھ دیا جائے تو وہ اسے احترام کے منافی سمجھتی ہے۔

اگر میں قرآن کو میز پر رکھ دوں تو وہ ناراض ہوتی ہے۔ کہتی ہے میز کوئی پاکیزہ جگہ نہیں ہے۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں قرآن کو سرہانے تلے رکھوں اور بیڈ بک کی طرح پڑھوں۔ بیڈ بک ایک ایسی کتاب ہوتی ہے جسے آپ سرہانے تلے رکھتے ہیں۔ جب بھی فارغ ہوئے۔ لیٹے تو کھول کر پڑھ لی۔ باقاعدگی سے سلسلہ وار نہیں، بلکہ جہاں سے کھلی وہیں سے پڑھنا شروع کر دیا۔

نوجوانی میں عام طور پر لڑکے لڑکیاں سرہانے تلے شعروسخن کی کتابیں رکھتے ہیں۔ جب بھی فارغ ہوئے، کتاب کھولی اور رومانی دنیا میں داخل ہو گئے۔

سنجیدہ قسم کے لوگ مشاہیر کے اقوال کو بیڈ بک بناتے ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں قرآن کریم کو بیڈ بک بناؤں کیونکہ میں اسے کتاب دانش سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے قرآن پڑھوں۔ لیکن کیا کروں! میری بیوی اس کی اجازت نہیں دیتی۔

بہشت

اس پر آپ کہیں گے کہ میاں تم تو رن مرید ہو۔

آپ درست فرماتے ہیں۔ واقعی میں رن مرید ہوں بلکہ الحمدللہ کہ میں رن مرید ہوں۔

ایک روز میرے دوست قدرت اللہ شہاب نے مجھ سے پوچھا: ''مفتی صاحب! کیا آپ بہشت میں رہنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا: ''کیا وہ بہشت جس میں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، کھانے کو پھل ملتے ہیں اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں مٹھی چاپی کرتی ہے۔ میں اس جنت کو Concieve نہیں کر سکتا۔ اس کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں دکھ نہیں، وہاں سکھ نہیں ہو سکتا۔ دکھ اور سکھ دو الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔''

شہاب بولے: ''نہیں! میں اس جنت کی بات نہیں کر رہا۔''

''تو پھر؟''

بولے: ''اس زندگی کی جنت کی بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ اس زندگی میں جنت میں رہنا چاہتے ہیں؟''

''بالکل چاہتا ہوں۔

بولے: ''بڑا آسان نسخہ ہے۔''

میں نے کہا: ''بتایئے۔''

بولے: ''اپنی بیوی کی ہر بات کے جواب میں 'ہاں جی' کہہ دیا کیجیے''۔ تو جناب گزشتہ آٹھ سال سے میں جنت میں رہتا ہوں۔ کاش کہ یہ اسم اعظم مجھے پہلے مل جاتا تو میں سالہا سال جہنم میں رہنے سے بچ جاتا۔''

میری بیوی ان پڑھ ہے لیکن وہ سمجھتی ہے کہ دنیاوی مسائل کو مجھ سے بہتر سمجھتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ سمجھتی ہے کہ میں دنیاوی باتوں میں قطعی طور پر بے سمجھ ہوں۔ اس نے

کبھی میری کسی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ میرے لکھنے لکھانے کے بھی خلاف ہے۔ کہتی ہے کیوں جھوٹی کہانیاں لکھ لکھ کر اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ ایک بار "نوائے وقت" کے ایڈیٹر صاحب ہمارا انٹرویو لینے آئے۔ کہنے لگے کہ میاں بیوی دونوں کا انٹرویو لیں گے۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ جب بیگم کی باری آئی تو اس نے سخت نکتہ چینی شروع کر دی۔ ایڈیٹر صاحب نے پوچھا، محترمہ! آپ کے میاں میں کوئی تو خوبی ہوگی؟ بیگم بولی، اگر کوئی ہوتی تو میں آپ سے کیوں چھپاتی بھلا۔ ان حالات میں ہماری سابقہ زندگی بسر ہوئی تھی۔

صرف قرآن کریم کی بات نہیں، میری بیوی کا حکم ہے کہ کوئی کتاب یا جریدہ فرش یا بستر پر نہ رکھا جائے، اس لیے کہ شاید اس میں کوئی آیت لکھی ہو۔

میرے لیے قرآن پڑھنے کی صرف ایک صورت ہے کہ کوئی ایسا نسخہ تلاش کروں جس میں عربی متن نہ ہو، صرف ترجمہ ہو۔

میں نے بڑی کوشش کی ایسا نسخہ مل جائے لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہوا۔

میرے ایک دوست ہیں محمد طفیل۔ پڑھے لکھے ہیں۔ ساری دنیا میں گھومے پھرے ہیں۔ انڈسٹریلیسٹ (Industrialist) ہیں۔ ماڈرن خیالات کے حامی ہیں۔ قرآن کریم کے پروانے ہیں۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ قران پر مرکوز کریں۔ قرآن سوچو۔ قرآن جیو۔ وہ قرآن کریم اور اس سے متعلقہ کتابیں لوگوں میں مفت بانٹتے رہتے ہیں۔

ایک روز میری عدم موجودگی میں میرے گھر آئے اور قرآن کریم کے چند قیمتی نسخے چھوڑ گئے۔ میں حیران ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہزاروں روپیوں کی کتابیں چھوڑ گیا ہے۔

اس کے بعد جب پہلی بار ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ آپ اتنے قیمتی نسخے مجھے کیوں دے رہے ہیں؟

بولے: "میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ کی تحریر میں اثر ہے۔ نوجوان آپ کی تحریریں پڑھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو Communication کا گفٹ عطا کیا ہے۔ میں یہ نسخے اس لیے آپ کو دے رہا ہوں کہ شاید آپ ان سے استفادہ

کر کے اپنی تحریروں میں قرآن کے پیغامات کا ذکر کریں۔"

میں ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔

میں نے کہا: "طفیل صاحب! میں تو دینی تعلیم سے بے بہرہ ہوں، جاہل مطلق ہوں، زبان پر قادر نہیں ہوں۔"

میری بیوی اتنے سارے جسیم قرآن دیکھ کر گھبرا گئی۔ بولی: "اب میں اتنے سارے جزدان کیسے بناؤں۔ اور میں انھیں کہاں رکھوں؟ الماریاں تو لٹریچر سے بھری ہیں۔ آپ یہ قرآن بصد شکریہ انھیں واپس کر دیں۔"

صاحبو! جان لو کہ یہ سب جذبۂ احترام کی وجہ سے ہے۔ ہمارا جذبۂ احترام اس قدر سفاک ہو چکا ہے کہ:

وہ ہمیں قرآن پڑھنے نہیں دیتا۔

باپ سے محبت کرنے نہیں دیتا۔

صوفیائے کرام کو انسان سمجھنے نہیں دیتا۔

ہمارا جذبۂ احترام ایسا ہی ہے جیسا کبھی انگلستان کے عوام میں جذبۂ ہمدردی جاگا تھا۔

لوگوں کو پتا چلا کہ سائنس دان تحقیقی تجربات کے لیے مینڈکوں کو کاٹتے ہیں۔

لوگوں نے احتجاج کیا کہ یہ ظالمانہ فعل ہے۔

عوام کا نمائندہ وفد سائنس دانوں سے ملا۔ انھوں نے سائنس دانوں کو خبردار کیا کہ جانوروں پر ظلم نہ کریں۔

سائنس دانوں نے وفد کو سمجھایا۔ کہنے لگے کہ یہ کام ہم بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے کر رہے ہیں۔ وفد نے کہا کہ بنی نوع انسان کی بہتری اور طرح سے بھی ہو سکتی ہے۔

سائنس دانوں کی سمجھ میں بات نہ آئی اور وہ مینڈکوں کو کاٹنے سے باز نہ رہے۔

لوگوں کا جذبۂ ہمدردی مزید جوش میں آ گیا۔ وہ لیبارٹریز کے گرد چھپ کر سائنس دانوں کا انتظار کرنے لگے۔ جو بھی سائنس دان آتا، اس پر حملہ کر دیتے۔

یوں مینڈکوں کی ہمدردی سے سرشار لوگوں نے سائنس دانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

ایسے ہی جذبہء احترام سے سرشار مسلمانوں نے قرآن کریم کو جزدانوں میں بند کر دیا۔ مسلمانوں کو قران کریم پڑھنے سے محروم کر دیا۔ قرآن کو بت بنا کر الماریوں میں مقفل کر دیا۔

صاحبو! جذبہء احترام بڑا طاقت ور جذبہ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر اللہ میاں ہمارے ہاتھ آ جائیں تو ہم جذبہء احترام کے تحت ان پر مشک کافور چھڑک کر، لوبان کی دھونی دے کر اپنی الماری کے اوپر والے خانے میں بت بنا کر سجا دیں گے۔

کچھ دیر کی بات ہے۔ رمضان شریف کے دن تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ ہمارے ڈبے میں اوپر تختے پر ایک نحیف و نزار مسافر لیٹا ہوا تھا۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ بیمار ہے۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا تھا جو ہمارے ساتھ نچلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

لڑکا بار بار اٹھ کر مریض سے پوچھتا تھا۔

مریض کو کھانسی چھڑ گئی جو بند ہونے میں نہ آتی تھی۔ اتفاق سے سٹیشن آ گیا۔ لڑکا گاڑی سے اترا اور مریض کے لیے ایک بوتل لے آیا۔ اس پر ڈبے میں بیٹھے ہوئے دو معزز آدمی اٹھے اور لڑکے کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔

ایک بولا، لڑکے تو رمضان شریف کی بے حرمتی کر رہا ہے۔

دوسرے نے کہا، ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

اس پر میں نے ان معزز صاحبان کی منت کی۔ میں نے کہا: ''مریض کا کھانسی سے برا حال ہو رہا ہے۔ از راہ کرم اجازت دے دیجیے۔''

انھوں نے حقارت سے میری جانب دیکھا۔ انداز میں تشدد تھا۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔

ایک صاحب بولے، اگر مریض کو کوک پلانا ہے تو اسے کسی دوسرے ڈبے میں لے جائیں۔ اس ڈبے میں رمضان شریف کی بے حرمتی نہیں ہو گی۔

ان کا جذبہء احترام خام نہیں تھا، دکھاوا نہیں تھا، اصلی تھا۔ ایک ساعت کے لیے مجھے

خیال آیا کہ شاید وہ مجھ سے بہتر مسلمان تھے۔

پھر مجھے شہادت کا واقعہ یاد آ گیا۔

برصغیر کی تقسیم سے پہلے کی بات ہے جب گورے ہم پر راج کرتے تھے۔

گرمی کا موسم تھا۔ رات کا وقت تھا۔ گورا صاحب بنگلے کے بیک یارڈ میں مچھر دانی لگائے سو رہا تھا۔ پٹھان چوکیدار راؤنڈ پر آیا۔ اس نے دیکھا کہ صاحب قبلے کی طرف پاؤں پسارے سو رہا ہے۔ چوکیدار نے جھنجھوڑا۔ بولا، ''صاحب جی! ادھر ٹانگیں مت کرو، ادھر ہمارا قبلہ ہے۔'' صاحب کو بات سمجھ نہ آئی۔ اس نے چوکیدار کی بات کو اہمیت نہ دی اور سرہانے پر سر رکھ کے پھر سو گیا۔

چوکیدار دوبارہ راؤنڈ پر آیا تو دیکھا کہ صاحب قبلے کی طرف ٹانگیں کیے سو رہا ہے۔ اس نے پھر صاحب کو جھنجھوڑا۔ اب کی بار صاحب چڑ گیا۔ اس نے چوکیدار کو سنائیں اور پھر لیٹ کر سو گیا۔ چوکیدار اس بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکا۔ اندر سے کلہاڑا اٹھا لایا اور صاحب کی گردن کاٹ دی۔ چوکیدار پر مقدمہ چلا۔ کچہری میں اس نے اقبال جرم کر لیا۔ بولا، ''ہم نے اسے دو بار خبردار کیا کہ ادھر ہمارا قبلہ ہے، ادھر ٹانگیں کر کے مت لیٹو، ہمارے قبلے کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ یہ باز نہ آیا تو ہم نے اس کا گردن کاٹ دیا۔''

چوکیدار کو پھانسی کی سزا ہو گئی۔ سارا شہر امڈ آیا۔ انھوں نے نعرے لگائے کہ یہ پھانسی نہیں شہادت ہے۔ چوکیدار کی قبر پر مزار تعمیر کیا گیا۔ شہید کا کتبہ لگا دیا گیا۔ وہاں باقاعدہ قوالی ہونے لگی۔ عرس منایا جانے لگا۔

رات کو لیٹے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ شاید چوکیدار مجھ سے بہتر مسلمان تھا۔ شاید اسلام جذبے ہی کا نام ہے۔ دیوار پر لگی ہوئی مکہ معظمہ کی تصویر میں حرکت ہوئی اور وہ تصویر سے نکل کر میرے سامنے صوفے پر آ بیٹھا۔

میں نے چیخ کر کہا: ''تو جو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ مجھے بتا کہ مسلمان کون ہے؟''

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی...... بے نیازی بھری مسکراہٹ۔

-☆-

باب :2

عالمِ دین

میرے دوست مجھ سے سخت نالاں ہیں۔ کہتے ہیں مفتی تو نے خوامخواہ کا پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔

میں کہتا ہوں، یارو! واقعی میں جاننا چاہتا ہوں کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے؟ اگر تمھیں معلوم ہے تو تم بتا دو۔ وہ سب صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ محمد عمر تو یوں نماز پڑھتا ہے جیسے فرض ادا کرنا مقصود ہے۔ جی نہیں لگایا۔ بس چلا دیتا ہے۔ ابھی شروع کی، ابھی ختم۔ کہتا ہے اگر ناغہ ہو جائے تو سارا دن یوں محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی کمی رہ گئی ہے۔

صوم وصلوٰۃ

عماد یوں ڈوب کر پڑھتا ہے کہ گرد و نواح کا ہوش نہیں رہتا۔ اسے نماز پڑھتے دیکھو تو لگتا ہے جیسے لذت سے لت پت ہو۔ چند ایک سال کی بات ہے کہ ایک بزرگ تشریف لائے۔ انھوں نے عماد کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ کہنے لگے، میاں آپ نماز نہیں پڑھتے، لذت حاصل کرتے ہیں۔

مسعود بولا: ”عالی جاہ! جب یہ نماز پڑھتا ہے تو لگتا ہے جیسے بڑا ہی شیریں آم چوس رہا ہو۔“

بزرگ کہنے لگے: ”ہم تو اسرار و رموز سے واقف نہیں ہیں، البتہ ہمارے سرکار قبلہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر عبادات میں لذت آنے لگے تو رک جاؤ۔ چونکہ لذت مقصود نہیں ہے، بلکہ رکاوٹ ہے۔“

بہر حال میرے دوست صوم صلوٰۃ کے پابند ہیں لیکن کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے۔ وہ میرے سوال کو سن کر ہنس دیتے ہیں۔ کہتے ہیں، دیکھو کوئی بھی تو نہیں جو جانتا ہو کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے؟

مسعود بولا: ”دیکھ مفتی! جس شہر میں تو رہتا ہے، یہاں سب مسلمان رہتے ہیں۔ سبھی پڑھے لکھے ہیں، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اللہ اور اس کے آخری پیغمبرﷺ کی عظمت کو سچے دل سے مانتے ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے۔ تو تو خوامخواہ اس جھگڑے میں پڑا ہے۔ اچھا فرض کرو، تمھیں پتا چل جاتا ہے کہ مسلمان کا مطلب کیا ہے تو کیا تو سنجیدگی سے اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال لے گا؟“

عمر نے قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا: ”یار چھوڑو! یہ مفتی تو سراسر منہ زبانی ہے۔ اس کی زندگی عمل سے یکسر خالی ہے۔ عمل کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں ہے اور مسلمان تو وہ ہوتا ہے جو سراسر عمل ہو۔ مثلاً عماد الدین ہے، یہ صاحب عمل ہے۔“

”اوں ہوں!“ مسعود نے کہا، ”عماد تو صرف صاحب عبادات ہے، صاحب عمل نہیں۔ مثلاً یہ ہاتھ کا کھلا نہیں۔ جب دینے کا وقت آتا ہے تو ہاتھ رک جاتا ہے۔ مسلمان کا ہاتھ نہیں رکتا، توفیق ہو یا نہ ہو، ہاتھ کھلا رہتا ہے۔“

عماد کھسیانی ہنسی ہنسا۔ بولا، ”میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں صحیح مسلمان ہوں۔ مجھے خود علم نہیں کہ مسلمان کون ہے۔ ہاں، مفتی! اگر تم چاہو تو ہم یہ مسئلہ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔“

”کن سے پوچھ سکتے ہیں؟“ عمر نے پوچھا۔

”ایک صاحب دین یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ عمر رسیدہ ہیں، صاحب علم ہیں، محترم ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہم ان سے فون پر بات کر کے حاضری کی اجازت طلب کر سکتے ہیں۔ ان سے بات چیت کے دوران ہم ان سے سوالات پوچھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ تمھیں مطمئن کر سکیں۔“

عماد نے صاحب دین سے اجازت حاصل کی اور اگلے روز ہم چاروں ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

دور حاضرہ

کچھ دیر کے بعد عالم دین ڈرائنگ روم میں تشریف لائے۔ بڑے اخلاق سے ہم سب سے ملے۔ حال احوال پوچھا اور پیشتر اس کے کہ ہم ان سے کوئی سوال پوچھتے، انھوں نے دور حاضرہ کی دین سے بے تعلقی بلکہ بے دینی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ان کی باتیں بڑی حد تک صحیح تھیں، قابل توجہ تھیں۔ لیکن ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے دور حاضرہ ہماری نئی نسل کا پیدا کردہ ہو۔ جیسے نئی نسل نے جان بوجھ کر دین کے خلاف سازش کی ہو اور بڑی پلاننگ اور محنت سے دور حاضرہ کو تشکیل دیا ہو۔

میں چاہتا تھا کہ ان کی خدمت میں عرض کروں کہ عالی جاہ! دور حاضرہ ہماری نئی نسل کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ عالمی حالات نے دور حاضرہ ہماری نئی نسل پر عائد کیا ہے۔ نئی نسل نے یہ ظلم ہم پر نہیں کیا، وہ تو خود مظلوم ہے اور علمائے دین کی ہمدردانہ توجہ کی مستحق ہے۔

صاحبو! زندگی بھر میں بڑے بوڑھوں سے دور حاضرہ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار سنتا آیا ہوں۔ جب میں 15-5 سال کا تھا تو ہمارے محلے کے بڑے بوڑھے دور حاضرہ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا کرتے تھے۔ یہ 20-1910 کی دہائی کی بات ہے۔ محلے کی بڑی بوڑھیاں دور حاضرہ کو بے نطق سنایا کرتی تھیں۔ وہ دور حاضرہ سے اس قدر زچ تھیں کہ اعلانیہ اسے بددعائیں دیا کرتی تھیں۔

اور جناب والا! ان دنوں ان کے لیے دور حاضرہ ہم تھے۔ محلے کے پانچ سے اٹھارہ سال کے بچے۔ ہم تعداد میں پندرہ بیس تھے۔ جب ہم اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوتے تو بڑے بوڑھے خصوصاً بوڑھیاں ہمارے وارے نیارے جاتے اور ہمیں اپنی محبت سے لت پت کیے رکھتے لیکن جونہی ہم گھروں سے نکل کر محلے کے چوگان میں پہنچتے تو ہم دور حاضرہ بن جاتے۔

محلے والوں کو ہم سے یہ شکایت تھی کہ ہم محلے کے چوگان میں کھیلا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نئی پود بے کار کھیل کود میں وقت ضائع کرتی ہے، حالانکہ ان کا کام ہے کہ وہ گھر

بیٹھ کر قرآن کریم پڑھیں یا سکول کا سبق یاد کریں اور بڑوں کے احکامات کے مطابق گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں، والدین کی خدمت کریں۔

دراصل ساری مشکل یہ تھی کہ محلے کے بچے گیند سے کھیلتے تھے اور محلے کے چوگان میں جہاں وہ کھیلتے تھے، چاروں طرف نالیاں بنی ہوئی تھیں جن میں گندا پانی بہتا تھا اور ہمارا گیند کوشش کے باوجود نالیوں میں گر جاتا اور گندے پانی سے بھیگ جاتا تھا۔ پھر اس گیند سے گندے پانی کے چھینٹے اڑتے اور چوگان سے گزرنے والے نمازیوں کے کپڑے پلید ہو جاتے یا ہم گیند کو ہٹ لگاتے تو چوگان کے اردگرد بنی ہوئی چھوٹی اینٹ کی حویلیوں کی کھڑکیوں سے گھروں کے اندر جا گرتا اور سارے گھر کو پلید کر دیتا۔

اس پر محلے کی بڑی بوڑھیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوتیں اور نئی پود کو صلواتیں سناتیں، دھمکیاں دیتیں، بددعائیں دیتیں۔ وہ گھنٹوں کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر بولتی رہتیں، بولتی رہتیں۔ جب وہ بول بلاوے سے تھک جاتیں اور اندر چلی جاتیں تو چھپے ہوئے، دبکے ہوئے، ڈرے ہوئے بچے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پھر میدان میں جمع ہو جاتے۔ پھر وہ سب انتقاماً بڑی بوڑھیوں کی نقلیں لگاتے، ان کا مذاق اڑاتے، پھبتیاں کستے اور بڑی بوڑھیوں کی زبان درازیوں سے انتقام لینے کے لیے بڑی محنت سے دس بارہ دنوں میں ایک پٹاخہ تیار کرتے۔ جب وہ تیار ہو جاتا تو بڑے اہتمام سے ایک خاص وقت مقرر کرتے، پھر سب سے بڑا لڑکا چوگان کے گرد کی کسی دیوار پر وہ پٹاخہ پورے زور سے دے مارتا۔ ایک دھماکا ہوتا جسے سن کر محلے کی بڑی بوڑھیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوتی اور بول بول کر اپنے گلے پھاڑ لیتیں اور محلے کے تمام بچے جو چھپے بیٹھے ہوتے، خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

بات اور تقریر

عالم دین صاحب بولے جا رہے تھے، بولے جا رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ رکیں تو ان کی خدمت میں عرض کروں کہ عالی جاہ! دور حاضرہ ہماری نئی نسل نے پیدا نہیں کیا۔ وہ تو عالمی حالات کی پیداوار ہے۔ ہماری نئی نسل تو مظلوم ہے اور آپ کی ہمدردی کی مستحق ہے۔

لیکن عالم دین کسی مقام پر رکتے تو میں بات کرتا۔ دراصل وہ بات نہیں کر رہے تھے بلکہ تقریر کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں کئی ایک تقریریں ازبر تھیں۔ ایک ختم ہوتی تو وہ دوسری اس کے ساتھ جوڑ دیتے، یوں تسلسل جاری رہتا۔

دفعتاً دیوار پر گھڑی نے بارہ بجا دیے۔ اس پر ہم چونکے۔ چونکہ ہم دس بجے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، لہٰذا پورے دو گھنٹے ہم سب اس انتظار میں بیٹھے رہے تھے کہ ان کی بات ختم ہو تو ہم ان سے سوال کریں۔

اس روز مجھے پتا چلا کہ عالمِ دین سے بات کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ سننے کے نہیں بلکہ کہنے کے شوقین ہیں اور ان کے پاس کہنے کی اتنی ساری باتیں ہیں کہ وہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔

نہ کوئی بحث کی نوبت نہ کوئی اذن سوال
فقیہ شہر کا جاہ و حشم زیادہ ہے

اگر بالفرض محال وہ آپ کا سوال سن بھی لیں تو وہ اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے اور جواب کو اس قدر Irrelevant بنا دیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ پھر وہ بات کو گھما پھرا کر اپنی کسی اور تقریر سے جوڑ کر اسے تقریر کی شکل دے دیں گے۔

بہتر مخلوق

صاحبو! میں علمائے کرام سے بے حد مایوس ہوں۔ وہ صرف دو باتیں کرنا جانتے ہیں...... دور حاضرہ پر تنقید اور ماضی کی مدح سرائی۔ صرف یہی نہیں! مجھے علمائے کرام کے خلاف کئی ایک شکایات ہیں۔ مجھے ان سے بنیادی شکایت یہ ہے کہ وہ مجھ جیسے نہیں ہیں، عوامی نہیں ہیں، ہم میں سے نہیں ہیں۔ ان کا پہناوہ اور طرح کا ہے، رہن سہن اور طرح کا ہے۔ آواز کی سُر تال اور طرح کی ہے آواز حلق کے نچلے پردوں سے نکلتی ہے...... نکلتی نہیں، نکالی جاتی ہے۔ بڑی مشق اور محنت سے نکالی جاتی ہے تاکہ اس میں ایک امتیازی شان پیدا ہو جائے۔

ان کی چال عوامی نہیں ہے۔ اس میں ایک امتیازی ٹھمک ہے۔ معززیت کی ٹھمک۔ ان کے میک اپ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ کوئی اور مخلوق ہوں، بہتر مخلوق...... انسان اور فرشتے کی درمیانی مخلوق یا جیسے وہ کسی تاریخی کاسٹیوم پلے کے اداکار ہوں۔ ان کا میک اپ اتنی بھاری ہوتا ہے کہ فلمی ستاروں کا میک اپ پیچھے رہ جاتا ہے۔

صاحبو! سیانے کہتے ہیں کہ اگر تم کسی پر اثر ڈالنا چاہتے ہو کہ کوئی تمھاری بات توجہ سے سنے، کانوں سے نہیں بلکہ دل کے کانوں سے، تو تم پر لازم ہے کہ پہلے تم ویسے بن جاؤ جیسے وہ لوگ ہیں جن پر تم نے اثر ڈالنا ہے۔ یہاں تک ویسے بن جاؤ کہ وہ لوگ سمجھیں کہ یہ شخص ہم میں سے ہے۔

امتیازات، مساوات

کووں پر اثر ڈالنا مقصود ہے تو پہلے بظاہر کوا بننا پڑے گا۔ مور بن کر اپنی رنگ دار دم جھلانے سے مقصد حاصل نہیں ہوگا، الٹا کووں میں ری ایکشن پیدا ہوگا۔

علمائے دین کو اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھیں اسی طبقے کو دین کی جانب مائل کرنا ہے جسے وہ رد کر رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات کو نہیں جانا کہ دور حاضرہ ہی ہمارا حال ہے جو جلد ہی ہمارا مستقبل بننے والا ہے۔ انھوں نے نہیں جانا کہ دور حاضرہ ایک دھارا ہے، ایسا دھارا جسے روکا نہیں جا سکتا جس پر بند نہیں باندھا جا سکتا جسے صرف Channalise کیا جا سکتا ہے، رخ دیا جا سکتا ہے۔

وہ اس خوش فہمی میں بیٹھے ہیں کہ ہم اپنا دور حاضرہ خود بنائیں گے۔ وہ جگہ جگہ دینی مدارس قائم کر رہے ہیں جن میں وہ بچوں کو دور حاضرہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں دنیاوی علوم سے محروم رکھتے ہیں اور اس طرح سے ان کی تربیت کرتے ہیں کہ بڑے ہو کر وہ بچے ان جیسے بن جائیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، بولنا چلنا عوام سے مختلف ہو جائے۔ ان بچوں میں بھی وہی امتیازی شان پیدا ہو جائے جو علمائے دین کا طرۂ امتیاز ہے۔

کاش کہ ہمارے علمائے دین کو شعور ہوتا کہ وہ ہم میں امتیازات پیدا کر رہے ہیں

حالانکہ مسلمان کی عظمت مساوات پر قائم ہے۔

صوفیائے کرام

اس کے برعکس صوفیائے کرام نے مساوات کو اپنایا۔ وہ جانتے تھے کہ جن لوگوں پر اثر ڈالنا ہے، ہمیں ویسا بننا پڑے گا، اس حد تک کہ وہ سمجھیں یہ شخص ہم میں سے ہے۔

صوفیائے کرام سینکڑوں میل دور، وسط ایشیا سے ہندوستان میں آتے تھے۔ یہاں پہنچ کر سچے دل سے اسے اپنا وطن سمجھتے، پورے طور پر ہمیں اپنا لیتے، ہماری بولی سیکھتے، ہمارا پہناوا پہنتے، ہمارا رہن سہن اپناتے، ہماری رسومات و رواج کو اپناتے، پھر وہ ہم سے بات کرتے۔ وہ اس بھید سے واقف تھے کہ جب تک ہم جیسے نہیں بنیں گے، ان کی بات ہم تک نہیں پہنچے گی۔ جب مکمل طور پر ہم میں رچ بس جاتے تو وہ ہماری زبان میں ہماری عوامی کہانیاں لکھتے۔ ان تصانیف میں وہ ہمارے لیے پیغامات رکھ دیتے تھے۔

ان کی تصانیف اتنی اپنائیت لیے ہوتیں کہ عوام انھیں حفظ کر لیتے۔ پھر تقریبات میں، محفلوں میں، داروں میں لوگ انھیں والہانہ پڑھتے اور سننے والے سر دھنتے۔

صوفیائے کرام نے کبھی اسلام کی تبلیغ نہیں کی تھی۔ انھوں نے کبھی بحث مباحثے نہیں کیے تھے۔ انھوں نے کبھی تقریریں نہیں کی تھیں۔ وہ اسلام کا ڈنکا نہیں بجاتے تھے۔ صرف اسلام کے لیے جیتے تھے۔ ان کے پاس دو ہتھیار تھے، اخلاق اور حسن کردار۔ ان دونوں ہتھیاروں میں مساوات کی دھار تھی جو لوہے کی دھار سے زیادہ کاٹ کرتی ہے۔

داتا صاحب نے کبھی کسی سائل سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ میاں تو ہندو ہے یا مسلمان۔ وہ صرف دینا جانتے تھے اور وہ واحد قادر مطلق، جو دینے پر قادر ہے، اپنے چاکر کی لاج رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں میں آدھا لاہور مسلمان ہو گیا۔ متعصب لوگ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔ وہ سچ کہتے ہیں لیکن یہ تلوار فولاد کی نہیں، اسلامی کردار کی تھی۔

صاحبو! جان لو کہ مساوات سے زیادہ خطرناک ہتھیار کوئی نہیں ہے۔

''اللہ ہا''

اس کے برعکس ہمارے علمائے کرام عوام میں گھلتے ملتے نہیں۔ وہ اپنی امتیازی شان برقرار رکھتے تھے۔ اٹھنے میں، بیٹھنے میں، کھانے میں، پینے میں، رہنے سہنے میں، بات چیت میں ان کا انداز الگ ہوتا ہے۔ ہونٹ سنوار کر بات کرتے ہیں۔ گلے کے نچلے پردے سے آواز نکالتے ہیں تاکہ وقار پیدا ہو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ بھی مخصوص سر تال سے کہتے ہیں۔ ''اللہ ہا''! ایسے لگتا ہے جیسے ان کا اللہ بھی ہمارے اللہ سے مختلف ہے جیسے ان کے اللہ نے بھی سر پر بڑا بھاری عمامہ لپیٹ رکھا ہو۔

جان انجان

ہمارے علمائے کرام جس سے بھی مخاطب ہوتے ہیں، ایسی امتیازی شان سے مخاطب ہوتے ہیں کہ سننے والے پر واضح ہو جائے کہ کوئی عام آدمی اس سے مخاطب نہیں ہے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جانتے ہیں۔ جس کے ذہن میں یہ گمان ہو کہ ''میں جانتا ہوں''، وہ لازماً سننے والے کو ''انجان'' سمجھے گا۔ یہ ایک قدرتی امر ہے۔ اگر آپ دوسرے کو انجان سمجھیں گے تو آپ میں احساس برتری جاگے گا۔ آپ کرسی پر بیٹھ جائیں گے، دوسرے کو اپنے سامنے کھڑا کر لیں گے۔

صاحبو! جان لو کہ اگر بات کرنے والا کرسی پر بیٹھا ہو اور سننے والا کھڑا ہو تو بات نہیں ہو سکتی۔

کہنے والا بات کہہ دے گا لیکن بات سننے والے تک نہیں پہنچے گی۔ کان بے شک سن لیں لیکن بات دل پر اثر نہیں کرے گی۔

سیانے کہتے ہیں کہ بات کہہ دینا ہی کافی نہیں۔ جب تک بات پہنچے گی نہیں بات نہیں بنے گی۔

صاحبو! آج کل لوگ باتیں کیے جا رہے ہیں، کیے جا رہے ہیں۔ کوئی ممبر پر کھڑا کیے جا رہا ہے، کوئی مائیک سے منہ لگائے کہے جا رہا ہے، کوئی سٹیج پر کھڑا کیے جا رہا ہے، کوئی

عہدے کے زور پر بات کرتا ہے، کوئی لیڈری کے زور پر۔ کوئی عمر رسیدگی کے زور پر، کوئی دین کے زور پر۔ سب بولے جا رہے ہیں، اپنی اپنی ڈفلی بجائے جا رہے ہیں۔ کسی نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ بات پہنچ بھی رہی ہے کہ نہیں۔ سب بچوں کی طرح بولے جا رہے ہیں، بولے جا رہے ہیں۔ بڑے بچے، بوڑھے بچے۔

ہاں تو ہمارے علمائے کرام عوام سے بات نہیں کر سکتے۔ بے شک تقریر جھاڑ سکتے ہیں۔ نصیحتیں کر سکتے ہیں۔ ''من نہ کردم شما حذر بکنید'' قسم کی نصیحتیں۔ خود گڑ کھاتے ہیں، دوسروں کو گڑ کھانے سے منع کرتے ہیں۔ وہ حکم چلا سکتے ہیں، دھونس دے سکتے ہیں لیکن بات نہیں کر سکتے۔

مساوات

بات صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو مساوات کا قائل ہے۔

صاحبو! ہمارے معاشرے میں بہت کم لوگ ہیں جو دوسروں کو مساوات کا درجہ دینے کے حوصلہ رکھتے ہیں۔ باپ بیٹے کو مساوات نہیں دیتا، نہیں دے سکتا۔ جب بیٹا جوان ہو جاتا ہے، عنفوان شباب میں قدم دھرتا ہے تو باپ کا اس کے متعلق رویہ دوغلا ہوتا ہے۔ دوسروں کے سامنے وہ بیٹے پر مان کرتا ہے، اکیلے میں وہ سمجھتا ہے کہ ''چھوٹا ہے''، ''ناسمجھ ہے''، ''احمق ہے''، میرے جسم سے نکلی ہوئی ایک ناپاک ''چھینٹ'' سے بنا ہے۔ باپ کی بات کو چھوڑیئے! کوئی بڑا چھوٹے کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

بڑے بوڑھے صدیوں سے چھوٹوں پر راج کرتے آئے ہیں۔

-☆-

باب: 3

نئی نسل

نئی نسل

ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ ہم نئی نسل میں کیڑے نہیں ڈال رہے بلکہ اپنے مستقبل میں کیڑے ڈال رہے ہیں۔ ہم نے اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ نئی نسل ہمارا مستقبل ہے۔ ہم نے کبھی اسے اہمیت نہیں دی، ہمیشہ اسے ''کنڈم'' کیا، ہمیشہ اسے رد کیا۔ ہم نے کبھی نئی نسل کو حالات حاضرہ نہیں سمجھا۔ ہم نے کبھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ بچے کا جوان بننا، نوجوان سے نوجوان بننا اور پھر بڑا بننا ایک Process ہے..... ایک ارتقائی عمل ہے جس میں فرد پر لازم ہے کہ وہ ہر اپنے دور کو جیے، ہر اپنے دور کو دل کھول کر اپنائے۔

اگر وہ اپنے ہر دور کو اپنا کر بڑا نہیں ہوگا تو اس کی تکمیل نہیں ہوگی۔ ہر باپ کی یہ خواہش رہی ہے کہ میرا بچہ بڑا ہو کر میرے جیسا بنے ہر باپ سمجھتا ہے کہ میرا دور جس میں، میں نے زندگی گزاری ہے، بہتر تھا اور ہر آنے والا دور بدتر ہے۔

کسی باپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں اپنے بیٹے کو ایسا بنا دوں کہ اس میں اپنے یعنی آنے والے دور کے مطابق جینے کی صلاحیت پیدا ہو۔ معاف کیجیے! آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ مفتی تقریر جھاڑ رہا ہے، کتابی باتیں کر رہا ہے۔ یقین جانئے! میں کتابی باتیں نہیں کر رہا، آپ بیتی باتی کر رہا ہوں جسے پنجابی میں ''ہڈ بیتی'' کہتے ہیں۔

ہڈ بیتی

یہ عظیم حقیقت مجھے میرے بیٹے نے سکھائی تھی۔ جب وہ 20 سال کا ہوا تو ایک روز وہ میرے پاس آیا۔ کہنے لگا، بابا! میں تجھ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا، پوچھ

کیوں ہے، شوق سے بات کر۔ جو بھی کہنا چاہتا ہے، کہہ، تجھ پر کوئی بندش نہیں ہے۔ کہنے لگا، بابا! بیس سال تک میں نے اپنی زندگی آپ کے خیالات کے مطابق گزاری ہے۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ باقی زندگی میں اپنے خیالات کے مطابق گزارلوں۔ اس کی یہ بات سن کر ایک دھماکا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے صور پھونک دیا گیا ہو۔ میرے پرخچے اڑ گئے۔ لیکن اپ اس بات کو نہیں سمجھیں گے جب تک میں آپ کو "باپ بیٹے" کی کہانی نہ سنا دوں۔

جب عکسی چار سال کا ہوا تو اس کی والدہ فوت ہوگئی اور ہم باپ بیٹا اکیلے رہ گئے۔ ان دنوں میں سکول ماسٹر تھا۔ سکول جاتا تو عکسی کو انگلی لگا کر ساتھ لے جاتا۔ جب تک میں پڑھاتا رہتا، عکسی دیوار سے لگ کر کھڑا رہتا۔ بازار جاتا تو اسے ساتھ لے جاتا۔ ہم دونوں اکیلے رہنے پر مجبور تھے۔ کوئی ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ عکسی کو علم نہ تھا کہ یہ باپ کے مکافاتِ عمل کا نتیجہ ہے۔ باپ نے جوانی میں کانٹے بوئے تھے۔ بیٹا لہولہان ہو رہا تھا۔ ہمارا کوئی والی وارث نہ تھا، رشتے دار نہ عزیز۔ ہم اکٹھے رہتے تھے، اکٹھے سوتے تھے، اکٹھے باتھ روم جاتے تھے۔ ہم باپ بیٹا نہ تھے، دوساتھی تھے۔

پھر عکسی بڑا ہوگیا اور میرا تبادلہ کراچی ہوگیا۔ وہاں میرا ایک دوست تھا قیصر۔ قیصر میرا بھانجہ بھی تھا اور دوست بھی۔ بھانجہ کم اور دوست زیادہ۔ قیصر لنڈورا تھا۔ دو سال اس نے ہمیں بھی لنڈورا بنائے رکھا۔ سارا دن ہم کراچی میں آوارہ گردی کرتے، بازاروں میں چلتے پھرتے، گنڈیریاں چوستے، سٹالوں پر کھڑے ہو کر کباب کھاتے، کافی ہاؤس میں پیالے پر پیالہ انڈیلتے اور پھر شام پڑتی تو کسی سینما ہاؤس میں فلم دیکھتے، روز بلاناغہ۔ یہ ساری عیاشی قیصر کی وجہ سے تھی، میں تو قلاش تھا۔ وہ امریکی دفتر میں افسر تھا۔

کوئی ہمیں دیکھ کر یہ جان نہ سکتا تھا کہ تینوں میں ایک باپ اور ایک ماموں ہے، ایک بھانجہ ہے، ایک بیٹا ہے۔ میں خود پر بڑا خوش تھا۔ میں خود کو شاباش دیتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں وہ باپ ہوں جس نے اپنے اور اپنے بیٹے کے درمیان کوئی احترام کی دیوار حائل ہونے نہیں دی۔ جس نے بیٹے پر حکم نہیں چلایا، اسے کوئی نصیحت نہیں کی۔ "من نہ کردم شما حذر بکنید" قسم کی نصیحت۔ میں وہ باپ ہوں جس نے بیٹے کو دوست بنائے رکھا، ساتھی بنائے

رکھا۔ میں دل ہی دل میں کہتا تھا، لوگو! میرے گلے میں ہار ڈالو، مجھے ایوارڈ دو۔ میں وکٹوریہ کراس (Victoria Cross) قسم کے ایوارڈ کا مستحق ہوں۔ ان خیالات میں جب مجھے میرے بیٹے نے کہا، بابا! بیس سال میں نے تیرے خیالات کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔ اب مجھے اجازت دے کہ باقی زندگی میں اپنے خیالات کے مطابق بسر کرلوں، تو ایک دھماکا ہوا، اچانک دھماکا۔ میرے پرخچے اڑ گئے۔ میری بوٹی بوٹی فضا میں بکھر گئی۔ میں نے کہا، جاؤ بیٹا جاؤ! اپنی عمر جیو، اپنا دور جیو۔ اس نے کہا، بابا! میں اپنے دوست بناؤں گا، میں اپنے ہم عمروں میں رہوں گا، میں اپنا دور جیوں گا۔ تین ماہ کے بعد وہ واپس آ گیا۔ میں نے کہا، عکسی! تم واپس کیوں آ گئے؟ بولا، بے کار ہے بابا! تمھارے ساتھ رہ رہ کر میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ تم نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ میرے ہم عمروں نے مجھے Reject کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، تم ہم میں سے نہیں ہو۔ یو ڈونٹ بیلانگ تو اس۔ تم ہمارے دور کے نہیں ہو۔ بڈھے طوطے، گٹ آؤٹ۔ بابا! جو جو حرکتیں وہ کرتے ہیں، میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا، ان میں شمولیت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان کی باتیں "چیچ" لگتی تھیں، احمقانہ، شہدی۔

اس روز میں نے شدت سے محسوس کیا کہ ہر نوجوان کے لیے اپنا دور جینا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ اپنا دور جینے کے بغیر کسی فرد کی تکمیل نہیں ہوتی۔ صاحبو! یہ صرف میری رائے ہی نہیں، آپ، میں، ہم سب اس حقیقت کو دیکھتے ہیں، جانتے ہیں، لیکن دیکھ کر آنکھ چرا لیتے ہیں۔ ہم میں اتنا حوصلہ نہیں کہ ایک ایسی حقیقت کو دیکھیں۔ ہم ہر Unpleasant حقیقت کو دیکھ کر اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اس کبوتر کے مصداق ہیں جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور کہتا ہے، خطرے کی کوئی بات نہیں، سب اچھا، سب اچھا۔

بلقیس کا طوطا

اسلام آباد میں ایک بہت بڑی شاعرہ رہتی ہے، بلقیس محمود۔ نظم کی شاعرہ ہے۔ میں بلقیس کا مداح ہوں۔ وہ ہمیشہ منفرد موضوعات پر لکھتی ہے۔ اس کی زیادہ تر نظمیں بارھویں کھلاڑی پر ہیں۔ اس کا بیٹا تاشی امریکہ چلا گیا تو بلقیس نے ایک نظم ان دنوں سے متعلق لکھی

جب اس کا بیٹا تاشی اسلام آباد میں اپنی امی ابا کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ ایک طویل نظم ہے۔ اس کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ صاحبو! یہ بھی جان لو کہ بلقیس کا گھر احترام اور رسم بھر (Traditional) گھر نہیں ہے۔ گھر کی فضا آزاد ہے، پیار بھری ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے بیٹے تاشی کے جذبات یوں رقم کرتی ہے:

..... مجھے لگتا ہے امی

میں
بڑھاپے سے بھری بستی میں آ کر
پھنس گیا ہوں
یہاں ہر شخص بوڑھا ہے
یہ چودہ سال کی بہنا
یہ سولہ سال کا بھائی
یہ دونوں آپ .....
یہ گہرے سلیٹی رنگ کی
بے رنگ سی دنیا
خدایا میں کہاں پر آ گیا ہوں
یہاں ہنسنا ہنسانا جرم لگتا ہے
یہاں پر زندگی کے گیت گانا
BAN ہے شاید
مرا کیا جرم ہے امی
مجھے لگتا ہے امی! آپ سب صیاد ہیں میرے
میرے پر کاٹ کر
پنجرے میں رکھ لینے کی اک خواہش
بس اک خوش رنگ سا طوطا

میاں مٹھو
کہ جب چاہا
میاں مٹھو میاں مٹھو کہا
بہلایا
خوش کر لیا
اپنے بڑھاپے کو
تعجب ہے مجھے امی
کہ اپنے دوستوں میں آپ ہنستی ہیں
مجھے سچ سچ بتائیں آپ کو ہنسنا بھی آتا ہے؟
کوئی حسن لطافت آپ میں بھی ہے؟؟
کوئی Sense of Humour
آپ میں بھی ہے؟؟؟
مجھے تو آپ سارے
دکھ کے مارے
بوڑھے بوڑھے لوگ لگتے ہیں
کہ جن کی ساری کوشش ہے
مجھے بھی توڑ کر رکھ دیں
دکھی
سنجیدہ
گہرے رنگ
میرے منہ پر بھی مل دیں

☆

میری امی مرے ابو

مجھے انگریزی گانوں کارٹونوں سے تو نہ روکیں
مجھے وہ ''ویلری بابا''
وہ چھوٹی چھوٹی زندہ زندہ لڑکیاں
''می شیل''...... وہ ''ڈی جے''
مکمل زندگی والا وہ ''فل ہاؤس''
یہ سب تو دیکھ لینے دیں
وہ سارے خواب
ساری خواہشیں
جو میرے اندر ہیں
انھیں باہر تو آنے دیں

☆

اہل مغرب

صاحبو! میں ایک سانثر نگار ہوں۔ میں آج کے دور کے نوجوانوں کے جذبات کی عکاسی ایسے نہیں کرسکتا جیسے شاعرہ کرسکتی ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، آج تک کسی شاعر نے اپنی کسی تخلیق میں یہ ظاہر نہیں کیا کہ آج کے دور میں نوجوانوں کے ہم بڑوں کے متعلق کیا جذبات ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ جنھیں ہم بڑے بوڑھے اخلاقی پابندیاں سمجھتے ہیں، ان کے بارے میں وہ کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم بڑے سمجھتے ہیں کہ یہ جو دور جدید ہے، یہ ہمارے نوجوانوں کے پیدا کردہ فتنہ ہے۔ یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ یہ فتنہ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں آیا، یہ آندھی تو ساری دنیا پر چل رہی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آندھی مغربی تہذیب کی پیداوار ہے۔ شاید کسی حد تک یہ بات درست ہو، لیکن ہمیں اس بات کا شعور نہیں کہ مغربی ممالک خود اس آندھی کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ وہ ہم سے زیادہ زچ ہورہے ہیں۔

ہپی کلچر

اہل مغرب خود حیران ہیں کہ یہ کیا ہورہا ہے، کیوں ہورہا ہے، کس اصول کے تحت ہورہا ہے۔ انھیں خود بات سمجھ میں نہیں آتی۔

آج سے چند سال پہلے مغرب میں ایک عجیب الخلق کلچر پیدا ہوگیا تھا جسے ہپی کلچر کہتے تھے۔ مغربی زندگی کے جو بنیادی ستون تھے، جو مغربی زندگی کے محور تھے، جن کے گرد زندگی گھومتی تھی، ہپی کلچران بنیادی روایتوں کے خلاف بغاوت تھی۔ انھوں نے دولت کی عظمت کو ٹھکرادیا۔ مغربی ممالک میں دوسری اہمیت سٹیٹس کو حاصل تھی۔ انھوں نے سٹیٹس کو بھی رد کردیا اور پر واسیوں یعنی خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرنی شروع کردی۔ ساری دنیا میں گھومتے پھرتے تھے، رات کو فٹ پاتھوں پر پڑ رہتے۔ یہ تحریک دراصل مغربی تہذیب کے بڑے راونوں کے خلاف احتجاج تھی، وارننگ تھی۔ دولت، سٹیٹس اور آرام پسندی کے خلاف وارننگ۔ اس تحریک نے چار چیزیں پیدا کیں:

لاحول ولا

ہمارے دینی رہنماء اس آندھی کو دیکھ کر لاحول ولا پڑھ پڑھ کر تھک گئے ہیں۔ ہمارے دینی رہنماؤں کی عادت ہے کہ وہ دور جدید کی ناگوار باتوں پر غور نہیں فرماتے۔ وہ انھیں مسائل نہیں سمجھتے۔ وہ انھیں ''لاحول ولا'' سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دور جدید اہل مغرب کی ایک شرارت ہے، اسلام کے خلاف ایک ساز ہے۔ ان کے ذہن میں اس مسئلے کا صرف ایک حل ہے، وہ یہ کہ اس شیطانی عمل کو روکو۔ انھیں یہ شعور نہیں کہ دور جدید ایک دھارا ہے اور دھارے کو کبھی روکا نہیں جاسکتا۔ البتہ اس کا رخ بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن انھوں نے کبھی اس دھارے کا رخ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔

ہمارے علمائے دین نے مغرب کو ہمیشہ شر سمجھا ہے حالانکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اہل مغرب میں ہماری نسبت خیر کا جذبہ زیادہ ہے۔ صاحبو! میں حکومتوں کی بات نہیں کررہا، لوگوں کی بات کررہا ہوں۔ اہل مغرب نے بڑی نیک نیتی سے آزادی اور

مساوات کی ایک پالیسی بنائی تھی۔ عورتوں کی آزادی، بچوں کی آزادی، خیالات کی آزادی، اظہار کی آزادی، جنس کی آزادی! لیکن بدقسمتی سے ان کے اس تجربے کو کامیابی حاصل نہ ہوئی، الٹا اس نے اک آگ لگادی۔ ایسی آگ جس کی جھلسن دنیا کے کونے کونے میں پہنچ چکی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آگ صرف ہمیں جھلسن رہی ہے۔ یہ ہماری بھول ہے۔ یہ آگ سب سے زیادہ خود اہل مغرب کو جلا رہی ہے۔ اہل مغرب اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ ان کا گھر اس آگ کی وجہ سے جل رہا ہے۔ وہ اس پرابلم سے نپٹنے کے لیے آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔ سوچ رہے ہیں، مائل بہ عمل ہیں۔

ہمارے علمائے دین سمجھتے ہیں کہ لاحول پڑھنے سے یہ مصیبت ٹل جائے گی۔ اس لیے وہ تقریریں کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں لوگو! مغرب پر لاحول پڑھو۔ نئی نسل پر لاحول پڑھو۔ دور حاضرہ پر لاحول پڑھو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ:

"ہر درد کی دوا ہے لاحول ولا قوۃ"

کاش انھیں علم ہوتا کہ لاحول کا مطلب کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ بڑے بوڑھے بھی لاحول کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اک زمانے تک میں بھی اس بارے میں غلط فہمی کا شکار رہا ہوں۔ جب بھی میرے دل میں کوئی شر بھرا خیال آتا، خصوصاً جنس کے متعلق! تو میں فٹ سے لاحول پڑھ دیتا۔ اے شیطان تو کیوں مجھے تنگ کرتا ہے۔ مجھے چھوڑ یار۔

اس احتجاج میں غصے کی نسبت اپنائیت کا رنگ زیادہ ہوتا تھا جیسے ہمارے ٹرک ڈرائیور اپنے ٹرک کے پیچھے ایک بورڈ لگا دیتے ہیں جس پر لکھا ہوتا ہے: "پپو یار تنگ نہ کر۔" پھر ایک دن اچانک بیٹھے بٹھائے مجھ پر لاحول کے معانی کا انکشاف ہو گیا کہ:

اللہ کی ذات کے سوا کوئی قوت وجود نہیں رکھتی۔ لہٰذا کسی سے ڈرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

میں تو حیرت زدہ رہ گیا۔ اس رات جب وہ خانہ کعبہ کی تصویر سے اتر کر صوفے پر آ بیٹھا تو میں غصے میں بھرا ہوا تھا۔ میں نے کہا، اگر تو ہی سب کچھ ہے، اگر تیرے حکم بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا تو یہ کیا ناٹک رچا رکھا ہے تو نے۔ کیوں اپنی مخلوق کو "حریان" کر رکھا ہے۔

میری بات سن کر وہ مسکرا دیا..... ایک دلنواز بے نیاز مسکراہٹ۔

اس روز سے بھی میرے دل میں شر بھرا خیال اٹھتا ہے تو میں لاحول نہیں پڑھتا بلکہ سچے دل سے جان لیتا ہوں، مان لیتا ہوں کہ مجھ میں شر کا عنصر موجود ہے۔ خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ایک نیچرل بات ہے۔ اسے زیادہ اہمیت نہ دو۔

جان لینا، مان لینا

سیانے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنی کمزوریوں، کجیوں، کمیوں کو جان لو، سچے دل سے مان لو تو ان کی شدت کم ہو جاتی ہے، وہ مدھم پڑ جاتی ہیں۔ اگر نہ مانو تو جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی شدت بڑھ جاتی ہے۔ وہ راون بن جاتی ہیں۔ انھیں اہمیت نہ دو "اگنور" کر دو "ڈیوائن ڈسڈین"۔

بڑے جب نئی نسل پر لاحول پڑھتے ہیں تو انھیں لاحول کے مفہوم کا احساس نہیں ہوتا۔ لاشعوری طور پر وہ سمجھتے ہیں کہ شیطان نئی نسل کو ورغلا رہا ہے۔

اگر وہ لاحول کے مفہوم پر غور کریں تو انھیں احساس ہو کہ یہ سب مشیت ایزدی ہے۔

یہ جو نئی نسل میں شدت پیدا ہو رہی ہے، یہ شیطان کا کارنامہ نہیں۔ شیطان بہکا سکتا ہے، وہ مخلوق کا رنگ بدلنے پر قادر نہیں۔

کسی صاحب نے نئی نسل کی شدت کے بارے میں کیا خوب بات لکھی تھی۔

کہنے لگے: "ہمارے دور میں اللہ نے اپنا پاؤں بریک پر رکھا ہوا تھا۔ اب ایکسلریٹر پر رکھ لیا ہے۔"

ہماری نئی نسل مردود نہیں، مظلوم ہے۔

ایک پاؤ بھر کے پیمانے میں سیر بھر انرجی ٹھونس دی گئی ہے۔

صرف ہم ہی نہیں، نئی نسل کے رویے پر ساری دنیا نالاں ہے۔ ان میں شدت ہے، بلا کی شدت ..... جیسے پاؤ بھر کی بوتل میں سیر بھر انرجی ٹھونس دی گئی ہو۔ ان میں بلا کی بے چینی ہے۔ قیام سے محرومی، حرکت، مسلسل حرکت، جلدی اور جلدی۔ جلدی چلیں، جلدی

پہنچیں، جلدی لوٹیں، جلدی جئیں، جلدی مریں...... ان کی کوئی منزل نہیں...... صرف جلدی۔ ان کا کوئی رخ نہیں، صرف حرکت۔

یہ شدت ان پر عائد کی گئی ہے۔

لگتا ہے جیسے پہلے اللہ تعالیٰ کا پاؤں بریک پر تھا، اب ایکسلریٹر پر رکھ دیا گیا ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں۔

تاریخ کائنات شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے تجربات اکثر کیا کرتا ہے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ برسات میں چیونٹیوں کو پر لگ جاتے ہیں۔ پھر وہ پروانے بن جاتے ہیں۔ مسلسل حرکت، دیوانہ وار حرکت۔

نئی نسل کو دیکھ کر مجھے ایسے لگتا ہے جیسے چیونٹیوں کو پر لگا دیے گئے ہوں۔

اخباروں میں اکثر خبریں آتی ہیں کہ نوجوان جرم کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ موٹر سائیکل 120 میل کی رفتار سے چلاتے ہیں۔ تفریحاً پلانڈ (Planned) چوریاں کرتے ہیں۔ ڈکیتیاں کرتے ہیں۔ مقصد لوٹ مار نہیں ہوتا، چوری نہیں ہوتی۔ صرف ایڈونچر۔ اس بات پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی جو میں نے چھٹی جماعت میں پڑھی تھی۔

بے قدری، بے کاری کا عذاب

ایک پہاڑی کی چوٹی پر تین دیو رہتے تھے۔ ہوا، پانی اور بجلی۔ پہاڑی کے نیچے ایک گاؤں تھا۔ ان دیوؤں نے گاؤں والوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ کبھی پانی برستا اور پانی کا ریلا گاؤں کو بہا کر لے جاتا۔ کبھی ہوا اس قدر زور سے چلتی کہ کھیت برباد ہو جاتے۔ کبھی بجلی کڑک کڑک کر گرتی اور گاؤں والوں کے مویشی مر جاتے۔

گاؤں والے ان دیوؤں سے بہت تنگ تھے۔

گاؤں کا ایک سیانا بڈھا کہنے لگا کہ بھائیو! یوں تو جینا محال رہے گا۔ کیوں نہ ہم ایک وفد پہاڑی کی چوٹی پر بھیجیں اور ان تینوں دیوؤں سے بات کریں۔ ممکن ہے وہ ہم سے سمجھوتہ کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ چنانچہ وفد بھیجا گیا۔

دیوؤں نے کہا، ''بھائیو! ہم تمھارے دشمن نہیں۔ الٹا ہم تو تمھاری خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دراصل مشکل یہ ہے کہ ہم کچھ کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تم ہمیں جو کام دو گے، ہم کریں گے۔ لیکن اگر تم نے ہمیں کرنے کے لیے کام نہ دیا تو ہم تمھاری بستی کو تباہ کر دیں گے۔''

مجھے ایسے لگتا ہے جیسے ہماری نئی نسل ان تین دیوؤں جیسی ہے۔ وہ کچھ کیے بغیر نہیں رہ سکتی اور چونکہ ہم نے انھیں بے قدری اور بے کاری کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے، اس لیے وہ ایڈونچر کی تلاش میں تخریب کی جانب چل نکلے ہیں۔ تمام تر قصور ہمارا ہے۔

مظلوم نسل

بھائیو! میں نے 88 سال کے دوران کئی ایک نئی نسلیں جوان ہوتے دیکھی ہیں۔ لیکن آج کی نئی نسل سے زیادہ مظلوم کبھی نہیں دیکھی۔ صلاحیتوں سے بھرپور، لیکن مظلوم۔ ہمارے معاشرے نے انھیں رد کر دیا ہے۔ انھیں مغرب کے ایجنٹ قرار دے دیا ہے۔ اسلام دشمن۔

میرے ایک دوست ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں، باکردار ہیں، سچے مسلمان ہیں اور تبلیغ کے حامی ہیں۔ ایک روز وہ میرے ہاں تشریف لائے، بے حد خوش تھے۔ ان کے ساتھ 20 سال کا ایک نوجوان تھا۔ اس کی جانب اشارہ کر کے بولے، ''الحمدللہ کہ ہمارا تبلیغی کام احسن طریقے سے چل رہا ہے۔''

''انھیں دیکھیے!'' انھوں نے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''آج سے ایک ماہ پہلے یہ جینز پہنتے تھے۔ پرنٹڈ شرٹ میں ملبوس تھے اور اب دیکھیے، الحمدللہ کہ ہم انھیں صراط مستقیم پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔''

میں نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر چینی داڑھی تھی۔ جسم میں گویا جان نہ تھی۔ آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔ بند بند پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے بلقیس محمود کی نظم کا بند یاد آ گیا:

مجھے لگتا ہے امی آپ سب صیاد ہیں میرے
میرے پر کاٹ کر
پنجرے میں رکھ لینے کی اک خواہش
بس اک خوش رنگ سا طوطا
میاں مٹھو
کہ جب چاہا
میاں مٹھو میاں مٹھو کہا
بہلایا
خوش کر لیا
اپنے بڑھاپے کو (اپنی انا کو)

اس میاں مٹھو کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر روؤں۔ اتنا روؤں کہ میری بصارت پانی بن کر بہ جائے۔ پھر جب میرے دوست پوچھیں، ''مفتی! تم تو اندھے ہو گئے ہو''..... تو میں کہوں، نہیں، میں اندھا نہیں ہوں۔ میں نے اتنا کچھ دیکھا ہے، اتنا کچھ دیکھا ہے کہ اب مزید دیکھنے کی ہمت نہیں رہی، حوصلہ نہیں رہا، اس لیے میں نے آنکھیں موند لی ہیں۔

نئی نسل پر جو ظلم بڑے اور علمائے دین کر رہے ہیں، اس میں مَیں بھی شامل ہوں، اس لیے کہ میں بھی تو بڑا ہوں۔

وقت یہ ہے کہ میں دو رُخہ ہوں۔ قدرت نے مجھے تماشا بنا رکھا ہے۔ میں بہ یک وقت بڑا بھی ہوں، چھوٹا بھی ہوں۔ صاحبو! لوگ سمجھتے ہیں کہ عمر ایک ہوتی ہے، جسمی عمر۔ یہ غلط ہے۔ عمریں تین ہوتی ہیں۔

''جسمی عمر''..... ''ذہنی عمر'' اور ''جذباتی عمر''۔ میری جسمی عمر 88 سال ہے، ذہنی عمر 30-35 ہوگی اور میری جذباتی عمر 17 سال سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ کوششوں کے باوجود آگے نہیں بڑھ سکی۔

چوں چوں کا مربّہ..... میرے گھر کو لیجیے!

چوں چوں کا مربّہ! اس وقت میرے گھر میں چار یونٹ بس رہے ہیں۔ میں اور میری بیوی دو بوڑھے ہیں۔ ہم پنجابی بولتے ہیں، پنجابی رہتے سہتے ہیں، پنجابی جیتے ہیں۔ میری تین بیٹیاں ہیں جو تیں پینتیس کے پیٹے میں ہیں۔ وہ اردو بولتی ہیں، اردو رہتی سہتی ہیں، اردو جیتی ہیں۔ میرا ایک بیٹا ہے جو پچاس کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کی شخصیت میں انگریز اور اللہ گڈ مڈ ہو رہے ہیں۔ وہ خیالات میں ماڈرن ہے لیکن اس کے اندر اللہ بولتا ہے۔ جب وہ سائنس کی بات کرتا ہے تو لگتا ہے جیسے سائنس ہی وہ واحد راستہ ہے جو ہمیں منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ جب وہ عقل کی بات کرتا ہے تو لگتا ہے کہ عقل رکاوٹ نہیں بلکہ راہبر ہے۔ لیکن جب وہ اللہ کی بات کرتا ہے تو ماڈرن ازم، سائنس اور عقل بلبلوں کی طرح پھٹ جاتے ہیں اور معرفت کا ایک ریلا سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔

آج کل وہ انگریزی کی ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ نام ہے:

"The Scientific Law of Allah"

میرے دو پوتے ہیں جو انگریزی بولتے ہیں، انگریزی سوچتے ہیں، انگریزی جیتے ہیں۔ آخر میں میری بیٹیوں کے بچے ہیں جو کوکا کولا تہذیب کی پیداوار ہیں۔ کوک پیتے ہیں، چاکلیٹ کھاتے ہیں، کارٹون دیکھتے ہیں، موم ڈیڈ بلاتے ہیں اور ہائی، یاہ، بولتے ہیں۔

اس لحاظ سے میرا گھر چوں چوں کا مربّہ ہے۔

میرا گھر ایک لوئر مڈل کلاس شہری کا گھر ہے۔

میری دانست میں تمام تر لوئر مڈل کلاس شہری گھر چوں چوں کا مربّہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹریڈیشنل گھروں میں، نوجوان گھر میں چوں چوں نہیں کرتے، کالج جا کر چراؤں کرتے ہیں۔ گھر میں منقار زیرِ لب رکھتے ہیں۔ یوں نوجوانوں کی زندگیاں دو رہو جاتی ہیں۔ میرے گھر میں کوئی ہیڈ آف دی فیملی نہیں، ساس نہیں، بہو نہیں..... جوائنٹ فیملی کی کوئی روایت نہیں۔

میرے پوتے اولیول (O-Level) اور اے لیول (A-Level) کے طالب علم ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ دیکھتے ہیں، زیادہ سنتے ہیں۔ ان کی ذہانت مجھ سے کم از کم چار گنا تیز ہے۔ ان کی معلومات مجھ سے دس گنا وسیع ہیں۔ سڑک سے موٹر گزرے تو وہ توجہ دیئے بغیر اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کہیں گے، ابو! یہ گاڑی جو ابھی سڑک سے گزری ہے، فلاں ''میک'' کی تھی۔ لیکن اس گاڑی کا فلاں پرزہ ڈھیلا ہے، ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ اگر گاڑی والے نے توجہ نہ دی تو کسی روز ٹھاہ ہو جائے گا۔ میرے پوتے جین پہنتے ہیں جس پر یہاں وہاں Patches لگے ہوئے ہیں۔ دکھاوے کے نہیں، اصلی۔ بڑی محبت سے شگاف بناتے ہیں تا کہ اصلی Patch لگ سکے۔

Visual Music

میرے پوتے پرنٹڈ شرٹس پہنتے ہیں۔ وہ موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ ڈسک انٹینا سنتے ہیں۔ ''آڈیو'' میں دلچسپی نہیں، Visual موسیقی سنتے ہیں۔ تال پر ٹانگیں جھلاتے ہیں۔ الیکٹرک گٹار بجاتے ہیں۔ سُر کے قابل نہیں، تال ہوایسی ہو کہ وجدان کی بجائے ہیسٹر یا پیدا کرے۔ ٹی وی پر وہ موسیقی پسند ہے جس میں چہرے خواہش کی شدت سے بھیانک ہو جائیں۔ نقش و نگار، خدوخال مٹ جائیں۔ ایک دیوانگی بھری Ecstacy چھا جائے۔ مناظر میں شدت ہو، تیزی ہو، تلخی ہو، ٹینشن ہو، لے میں طوفان آ جائے۔ میں اپنے گھر کی نئی نسل کا مداح ہوں لیکن جب موسیقی کا مرحلہ آیا تو میں اسے برداشت نہ کر سکا۔ میرے اندر کا بڑا بوڑھا یوں باہر نکلا جیسے لوٹے سے جن باہر نکلتا ہے۔ صاحبو! میں اس دور کا فرد ہوں جب موسیقی زخم پر مرہم کا کام کرتی تھی۔ کراہتوں کو تھپک تھپک کر سلا دیتی تھی۔ جب موسیقی دیکھنے کی نہیں، سننے کی چیز تھی۔ جب سر مہارانی تھی، تال باندی تھی۔

مسٹر سیدھی دل پر اثر کرتی ہے جو دکھ، درد، رومان، برہا اور وجدان کے جذبات ابھارتی ہے۔ اس کے برعکس تال صرف ٹانگیں جھلاتی ہے۔ ہیسٹرک مستی پیدا کرتی ہے۔ ایک ایسی دیوانگی جو ملاپ پر منتج ہوتی ہے۔ یہ ملاپ جذباتی نہیں ہوتا، روحانی نہیں ہوتا،

صرف جسمی، جنسی۔

برہنگی

یہ ٹانگیں جھلانے کی رسم بنی نوع انسان کو بڑی مہنگی پڑے گی۔ بالکل ایسے جیسے یورپی عورتوں کی برہنگی مہنگی پڑ رہی ہے۔ سوچیے! یورپی مرد کیا ہوتا جا رہا ہے۔

میرے ایک دوست کو چند ماہ کے لیے امریکا جانا پڑا۔ جب وہ واپس آیا تو مجھ سے کہنے لگا: ''یار مفتی! میں تو مارا گیا۔''

میں نے پوچھا، کیا ہوا؟

بولا، میرے ''ہتھ پلے'' کچھ نہیں رہا۔

کہنے لگا، نیا نیا وہاں گیا تو بیچ (Beach) پر برہنہ عورتوں کو دیکھ کر میری تو آنکھیں پھٹ گئیں۔ پاگل ہو گیا۔ روز بیچ پر جاتا، ٹہلتا رہتا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہتا۔

اب یہ حال ہے کہ تحریک نہیں ہوتی۔ میں اب کیا کروں۔

صاحبو! ہمارے عالمِ دین خوامخواہ فحاشی اور برہنگی کو دینی مسئلہ بنائے بیٹھے ہیں۔ یہ تو خالص فزی آلوجیکل مسئلہ ہے۔ جس چیز کو آپ بار بار دیکھیں گے، وہ اپنی کشش کھو دے گی۔ اتنی عام نظر آنے لگے کہ تحریک پیدا نہیں کر سکے گی۔

پہلے دن جب میں اسلام آباد آیا تو اس شہر کا حسن دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ اتنا حسن مجھ سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے سوچا، یا اللہ! میں اس شہر میں کیسے رہ سکوں گا۔ آج یہ صورت ہے کہ مجھے اسلام آباد کا حسن نظر نہیں آتا۔ اس کے uglyspots کو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔

میرے زمانے میں Segregation کا دور تھا۔ مرد الگ، عورتیں الگ۔ مرد عورت کے ایک دوسرے سے ملنے کے امکانات بہت کم تھے۔ ان دنوں چہرے کا نقاب سرک جاتا، چہرے کا تھوڑا سا حصہ، ایک آنکھ اور آدھا رخسار نظر آتا، تو شدت کی تحریک پیدا ہوتی جو کبھی کبھار عشق پر منتج ہو جاتی۔

اس دور میں ہمیں Segregation پر اعتراض تھا۔ یورپ ہماری اس رسم کا مذاق اڑاتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ علیحدگی نقصان دہ نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ یورپ نے اس غیر فطری رویے کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی، یہاں تک کہ یورپی خاتون آج برہنگی کی حد تک جا پہنچی ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ مغرب میں عورت مرد میں کشش پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لیے مرد لذت کے حصول کے لیے الٹے سیدھے غیر فطری راستے تلاش کر رہا ہے۔ یورپی سوسائٹی میں مختلف قسم کے Abbarations عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ان غیر فطری رویوں کو قانونی جواز حاصل ہو چکا ہے۔

مدھ اور حد

حیرت کی بات ہے کہ عورتوں نے ابھی تک نہیں سمجھا کہ بے پردگی اور جنسی آزادی ان کے لیے خودکشی کے مترادت ہے۔ سیانے کہتے ہیں، اسلام واحد مذہب ہے جو حدیں توڑنے کے خلاف ہے اور جس میں بشریت کا درجہ سب درجوں سے بلند تر ہے۔

حضور اعلیٰ ﷺ واحد ریفارمر تھے جنھوں نے فرمایا تھا کہ لوگو! بین بین رہو۔ مدھ میں جیو، حدیں نہ توڑو۔ نہ دنیا میں اس قدر ڈوب جاؤ کہ اللہ کے احکامات سے بے نیاز ہو جاؤ۔ نہ عبادات میں اس قدر ڈوب جاؤ کہ دنیا سے بے تعلقی پیدا ہو جائے۔

سیانے کہتے ہیں، اسلام اعتدال کا نام ہے، توازن کا نام ہے، ہم آہنگی کا نام ہے، ہارمنی کا نام ہے۔

پتا نہیں ہمارے راہبر اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔ انھوں نے مدھ کو نہیں بلکہ حد کو اپنا رکھا ہے۔ ہمارے علماء میں شدت ہے۔ انا ہے، وہ گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر گروہ یا سلسلہ سمجھتا ہے کہ جو راستہ ہم نے اپنا رکھا ہے، وہی صراط مستقیم ہے۔

وہ سب ہماری نوجوان نسل کو راستے سے بھٹکی ہوئی نسل سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اہل یورپ اسلام کے دشمن ہیں اور مغربی تہذیب دراصل اسلام کے خلاف ایک سازش ہے۔

چند سال ہوئے، میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ عنوان تھا: ''گرداس، داس گرو''۔ اس کہانی میں میں نے یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ پرانے زمانوں میں گرو کے پیچھے پیچھے چلنے کے خواہش مند تھے۔ اس لیے گرو کا کام تھا کہ آگے آگے چلے، راستہ دکھائے۔

ہماری نئی نسل کسی کے پیچھے چلنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ''میں خود'' کی قائل ہے۔ اس لیے اب گرو کا فرض ہے کہ خود میں داس کی سپرٹ پیدا کرے، لوگوں کے پیچھے چلے اور پیچھے چل کر ان کا رخ موڑے۔

آگے چل کر رخ موڑنا تو آسان بات ہے۔ پیچھے چل کر رخ موڑنا بڑی بات ہے۔

ہمارے رہبر تو صرف آگے چلنا جانتے ہیں۔ حکم چلانے کے عادی ہیں۔

کہانیاں

میری کہانی بے اثر رہی۔ میں ایک خام لکھنے والا ہوں۔ پھر یہ بھی ہے کہ آج کی دنیا میں کہانیوں کی کیا حیثیت ہے۔ لوگ کہانیاں تفریح کے لیے پڑھتے ہیں۔ ان سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔

بڑے کہانی نگاروں نے کہانیوں کے پردے میں بڑی بڑی حقیقتیں پیش کی ہیں۔

ایک بہت بڑا کہانی کار (AESOP) تھا۔

ایسکوپ نے ایک کہانی اس دور کی لکھی ہے جسے ''شولری'' یا شجاعت کا دور کہتے ہیں۔ وہ سورماؤں کا دور تھا۔ شوکت نفس کا دور تھا۔ چھوٹی سی بات پر عزت نفس مجروح ہو جاتی تھی۔ تلواریں نیام سے نکل آتیں اور تیغ زنی یعنی ''ڈوول (Duel)'' شروع ہو جاتی تلواریں چلتی رہتیں جب تک ایک گھائل نہ ہو جاتا۔ ڈوول میں داخلہ قانونی طور پر داخلہ ممنوع نہ تھا۔

ایسکوپ لکھتا ہے کہ سڑک چل رہی تھی۔ اسلحہ سے لیس گھڑسوار سورما آ جا رہے تھے۔

سڑک پر ایک دوطرفہ بورڈ آویزاں تھا۔

دفعتاً ایک سورما اس بورڈ کو دیکھ رک گیا۔ بولا، ''واہ کیسا خوبصورت نیلے رنگ کا بورڈ لگا

ہوا ہے۔'' سڑک کی دوسری جانب سے ایک اور سورما آ گیا۔ بولا: ''واقعی! بہت خوبصورت ہے۔ مگر اس کا رنگ تو سرخ ہے۔''

پہلا سورما بولا: ''ہم کہتے ہیں کہ اس کا رنگ نیلا ہے۔''

دوسرے نے کہا: ''ہم کہتے ہیں کہ اس کا رنگ سرخ ہے۔''

پہلے نے کہا: ''تم ہماری توہین کر رہے ہو۔ نکالو تلوار۔''

دونوں سورماؤں نے تلواریں نکال لیں اور ڈوول کے لیے تیار ہو گئے۔ اتنے میں ایک سیانا بوڑھا موقع پر آ پہنچا۔ بولا، ''بھائیو! کس بات پر ڈوول لڑنے لگے ہو؟''

پہلے سورما نے کہا: ''اس شخص نے ہماری توہین کی ہے۔''

''کیسے؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''ہم کہتے ہیں یہ بورڈ جو سڑک پر آویزاں ہے، نیلے رنگ کا ہے۔''

دوسرا سورما بولا: ''ہم کہتے ہیں کہ یہ بورڈ سرخ رنگ کا ہے۔''

بوڑھا بولا، آؤ، دیکھیں کہ بورڈ کا کیا رنگ ہے؟''

انھوں نے دیکھا کہ بورڈ پر ایک جانب نیلا رنگ کیا ہوا تھا، دوسری جانب سرخ۔

آج بھی دنیا میں بیشتر جھگڑے اسی بات پر ہوتے ہیں۔

ایک کہتا ہے: ''بورڈ نیلا ہے۔''

دوسرا کہتا ہے: ''نہیں، سرخ ہے۔''

کبھی کسی نے بورڈ کی دوسری جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہتے ہیں اسلام میں 72 فرقے ہیں۔ اس بورڈ پر 72 رنگ ہیں۔ کبھی کسی راہبر نے بورڈ کی دوسری جانب نہیں دیکھا۔ کسی راہبر نے یہ نہیں کہا کہ یہ اختلاف فروعات پر مبنی ہیں۔ روح ایک ہے، منزل ایک ہے۔

-☆-

باب 4:

بڑی سرکار

میرے ایک دوست ہیں، امتیاز بخاری۔ ان کا چہرہ بارہ دری ہے۔ اتنا چوڑا اور اس میں محرابیں ہی محرابیں۔ شخصیتوں میں دروازے عام ہوتے ہیں لیکن پیٹ دار ہوتے ہیں۔ کوئی بند، کوئی ادھ کھلا، کوئی کھلا۔

ہاتھ کی تسبیح

کچھ شخصیتیں ازلی طور پر چہروں پر دھری ہوتی ہیں۔ ایسی شخصیت کو پنجابی میں ''کھلی ڈلی'' کہتے ہیں۔ امتیاز بخاری ''کھلا ڈلا'' ہے۔

ایک بار وہ مجھ سے ملا تو اس کے ہاتھ میں ایک منی تسبیح تھی۔ ''ارے یہ کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ کہنے لگا: ''کیوں اسے کیا ہے؟''

میں نے کہا: ''یہ ایسے ہے جیسے راگ میں بے برجت سر لگی ہے۔''

کہنے لگا: ''بے برجت سر کیا ہوتی ہے؟''

میں نے کہا: ''کچھ سریں ایسی ہوتی ہیں جو راگ کے تاثر کو ابھارتی ہیں۔ جو بار بار لگائی جاتی ہیں۔ کچھ ایسی ہوتی ہیں جو راگ کے منافی ہوتی ہے، اس لیے ممنوع ہوتی ہیں۔ یہ تیری شخصیت سے ہم آہنگ نہیں بلکہ اسے جھٹلاتی ہیں۔''

اس سے پہلے بھی عمادالدین ایک بزرگ کو میرے گھر لائے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح تھی۔ وہ ہم سے باتیں کرتے جاتے تھے، ساتھ ساتھ تسبیح کے دانے گراتے جاتے تھے لیکن ان کے ہاتھ میں تسبیح بجتی تھی۔ رسمی بزرگ تھے، معزز تھے، ڈاڑھی تھی، گیسو تھے، جسم

پر چغہ تھا، کندھے پر صافہ لٹک رہا تھا۔

اگلے روز عماد بھی ایک منی تسبیح اٹھائے آ گیا۔

میں قہقہہ مار کر ہنسا۔

عکسی کہنے لگا: ''بابا! آپ تو خوامخواہ اعتراض کرتے ہیں۔ اب کی بار میں فرانس گیا تھا تو میں نے دیکھا کہ یورپ میں تسبیح اٹھائے رکھنا فیشن ہو گیا ہے۔ ہماری محترمہ (بی بی) بھی اٹھائے پھرتی ہیں۔''

امتیاز بخاری سے میں نے پوچھا: ''یہ بتا کہ یہ منی تسبیح فیشن ہے یا روحانیت؟''

بخاری بولا: ''یہ حکم ہے۔''

میں نے کہا: ''یار تو تو بشرے سے آزاد دکھتا ہے، پابند کیسے ہو گیا؟''

بولا: ''میرے ایک بزرگ دوست ہیں۔ ان کے حکم سے یہ تسبیح ہاتھ میں رکھتا ہوں۔''

میں نے کہا: ''کیا ان بزرگ دوست میں سینس آف ہارمنی کا فقدان ہے؟''

کہنے لگا: ''اس کے برعکس ان کا تو عقیدہ ہی ہارمنی ہے، توازن ہے، ہم آہنگی ہے۔''

میں نے کہا: ''لیکن یہ تسبیح تو تجھ سے ہم آہنگ نہیں۔ یہ نمائش ہے، دکھاوا ہے، Pretention ہے، دعویٰ ہے۔''

''وہ ان باتوں کو روا نہیں رکھتے۔'' بخاری نے جواب دیا۔ اس پر میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

میں نے کہا: ''یہ کیسا بزرگ ہے جو نمائشی تسبیح بھی چلاتا ہے، ساتھ ہی ہارمنی، ہم آہنگی توازن کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہمیں بھی زیارت کرا دے ان کی۔''

پروفیسر، سرکار قبلہ

یوں ہم رفیق احمد سے جا ملے۔

گوجر خان پہنچے تو پتا چلا کہ شہر کے سبھی لوگ انھیں جانتے ہیں اور انھوں نے انھیں پروفیسر کا لقب دے رکھا ہے۔

اس بات پر حیرت ہوئی کہ یہ کیسا بزرگ ہے جو سرکار قبلہ کہ جگہ خود کو پروفیسر کہلوا

ہے۔

مکان میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک ادھیڑ مگر Youngish آدمی پلنگ پر بیٹھا ہے۔ سر ننگا، کلین شیو، کرتا شلوار جیسے کوئی عام سا آدمی ہو۔ چہرے پر تحکم کی جگہ ذہانت ہے جس کی دھار زیادہ ہی تیز ہے۔ گلے کے نچلے پردوں سے بات نہیں کرتا۔ بات میں روانی ہے، معززیت کی ''رک رک'' نہیں۔

میں نے کہا: ''آپ پروفیسر ہیں؟''

بولے: ''پروفیسر تھا، پھر استعفیٰ دے دیا۔ اب اللہ کا نوکر ہوں۔''

میں نے کہا: ''پہلے سرکار کے نوکر تھے، اب بڑی سرکار کے ہو گئے۔''

ہنسے، بولے: ''ہاں۔''

میں نے کہا: ''یہ سودا اچھا نہیں کیا آپ نے!''

بولے: ''وہ کیسے؟''

میں نے کہا: ''بڑی سرکار تنخواہ دینے میں بڑی خسیس ہے۔''

ہنسے یوں جیسے عام آدمی ہنستے ہیں۔

میں نے سوچا: ''یہ تو واقعی پروفیسر ہیں، بزرگی وزرگی کوئی نہیں۔''

عقل کی پکی سڑک

پھر میں نے انھیں چھیڑا۔ میں نے پوچھا: ''آپ کو یہ مقام کیسے ملا جس پر آپ فائز ہیں؟''

بولے: ''عقل سے ملا۔''

''ارے!'' میں چونکا۔ بڑا غیر متوقع جواب تھا لیکن جواب میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔

میں نے کہا: ''حضور! ہم تو عقل کو راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔''

''آپ غلط سمجھتے ہیں۔'' وہ بولے۔

پھر انھوں نے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔

وہ حلق کے نچلے پردوں سے قرآن نہیں پڑھ رہے تھے جیسے کہ قاری پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ تو یوں قرآن پڑھ رہے تھے جیسے قرآن نہیں بلکہ کسی عرب شاعر کا کلام پڑھ رہے ہوں بلکہ یوں جیسے اللہ تعالیٰ سے خود باتیں کر رہے ہوں۔ ساتھ ساتھ ترجمہ بھی کرتے جاتے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے پروفیسر ہمیں قرآن سے اقتباسات سناتے رہے۔ لب لباب کچھ ایسا تھا کہ:

> ''لوگو! دیکھو، بار بار دیکھو۔ سوچو، بار بار سوچو، غور کرو، فکر کرو، آنکھیں بند کر کے ایمان نہ لاؤ۔ اللہ نے تمھیں عقل دی ہے۔ اپنی عقل سے کام لو۔
>
> ''پہلے بات کو تولو، آزماؤ۔ اگر تمھارے دلوں میں شکوک پیدا ہوتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ جو جو شکوک ذہن میں آتے ہیں، ان پر غور کرو۔ جو جو Alternations ذہن میں آتے ہیں، انھیں باری باری آزماؤ...... پھر تم جان لو گے کہ جو ہم کہتے ہیں، وہی سچ ہے۔''

یہ باتیں سن کر حیرت ہوئی۔ یہ کیسا اللہ ہے کہ ایک طرف تو اس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ دوسری طرف حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو نہ سہی، اسے مجبور نہ کرو۔

بہر حال، پروفیسر نے ہمیں عقل کی پکی سڑک پر ڈال دیا۔

چار ایک دن تو میں پروفیسر کی باتوں پر غٹ رہا، پھر شکوک نے سر اٹھایا۔

کیا دل کی کوئی اہمیت نہیں۔ وجدان کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیا اللہ کے اتنے بڑے عاشق جو گزرے ہیں، محمد ﷺ کے پروانے، صوفی، فقیر، قلندر...... کیا ان کا کوئی مقام نہیں۔ میں پھر ڈب جھلکے کھانے لگا۔ میں نے مسعود قریشی سے بات کی۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا، تمسخر بھرا قہقہہ۔

مسعود ایک عجیب و غریب قسم کی شخصیت ہے۔ بارہ مسالے قسم کی چیز ہے۔ اس میں

مختلف اور متضاد قسم کی خصوصیات ہیں۔ مثلاً اس میں عقل بھی ہے، جذبہ بھی ہے، ایمان بھی ہے، کفر بھی ہے، فکر بھی ہے، بے فکری بھی ہے۔ وہ مثبت بھی ہے، منفی بھی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ان تضادات کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک ہم آہنگی ہے۔ ہارمنی ہے۔

مسعود قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا: ''مفتی! تو بڑا کنفیوزڈ آدمی ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ اللہ برانچ لائن ہے۔ نہیں بھائی! اللہ تو بہت بڑا جنکشن ہے۔ کئی ایک راستے وہاں پہنچتے ہیں۔ کئی ایک لائنیں آتی ہیں۔ عقل کی لائن بھی پہنچتی ہے، وجدان کی بھی اور پتا نہیں کون کون سے لائنیں پہنچتی ہیں۔''

قرآن

پھر طفیل صاحب آ گئے۔ طفیل پڑھا لکھا ہے، دنیا گھوما ہے، انڈسٹریلسٹ ہے، امیر کبیر ہے، غریب مزاج ہے۔ اس پر صرف ایک دھن سوار ہے۔ قرآن پڑھو، قرآن سمجھو، قرآن جیو۔ طفیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی خاص مسلک کا حامی نہیں، کسی خصوصی طریق کار کا مبلغ بھی نہیں۔ کسی رویے کو رد نہیں کرتا۔ کوئی پابندی نہیں لگایا۔ صرف قرآن کی جانب توجہ مبذول کرتا ہے۔

کہنے لگا: ''مفتی صاحب! کیوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ تمھارے پاس قرآن جو ہے۔ بس پڑھو، پھر پڑھو، پھر پڑھو، پھر پڑھو، پڑھتے ہی رہو۔ یہ تہہ در تہہ کتاب ہے۔ آہستہ آہستہ بھید کھولتی ہے۔ سہج پکے سو میٹھا ہونے والی بات ہے۔ ایک بار پڑھنے کی چیز نہیں۔ بار بار پڑھو۔ آہستہ آہستہ سب بھید کھلتے جائیں گے۔''

مسعود نے کہا: ''مفتی! قرآن کا صرف ترجمہ پڑھنا، تفسیر نہ پڑھنا۔ تفسیر میں مفسر کے ذاتی رویے کی جھلکیاں آ جاتی ہیں۔''

عمر نے کہا: ''مودودی صاحب کا ترجمہ پڑھو۔''

ابدال بیلا کہنے لگا: ''مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ بہتر رہے گا۔''

پھر ساجد صاحب تشریف لے آئے۔ ساجد متشرع مسلمان ہیں۔ وضع قطع میں علمائے دین کا رنگ ہے۔ باکردار ہیں۔ دنیاوی علوم سے خاطر خواہ واقفیت ہونے کی وجہ سے خیالات میں ماڈرن ہیں۔ اسلام کی خدمت کا جذبہ شدت سے طاری ہے۔ خلوص میں بھی شدت ہے۔

ساجد صاحب ایک قرآن خرید کر لے آئے اور مجھے تحفہ پیش کر دیا۔ کہنے لگے: ''ترجمے کے لحاظ سے یہ قرآن بہترین ہے۔ دوسرے اغلاط سے بھرے ہوئے ہیں۔''

قرآن کریم کے اختتام پر اعلان تھا کہ دوسرے تراجم یا تو غلط ہیں یا ناقص اور یا نامکمل اور سرسری ہیں۔ یہ اعلان سخت الفاظ میں تھا۔

اختلافات کو ہوا دینا اور دوسروں پر کڑی نکتہ چینی کرنا اسلامی سپرٹ کے منافی ہے۔

میں پھر تذبذب کا شکار ہو گیا۔

طفیل نے کہا: ''اختلافات کی طرف دھیان نہ دیجیے۔ ہماری قوم کو اختلافات جزئیت کرنے کی عادت ہے۔ کوئی سا قرآن پڑھیں، چاہے کسی کا ترجمہ ہو، قرآن آپ کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لے گا۔ یہ بڑی طاقت ور کتاب ہے۔''

قرآن پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔

دانش کدہ

میرا خیال تھا کہ قرآن حکیم ایک مذہبی کتاب ہے جس میں اللہ کی عظمت کا بیان ہے اور صراط مستقیم کے متعلق ہدایات ہیں۔

میں نے دیکھا کہ قرآن میں تو اک جہان آباد ہے۔ وہ مذہب پر محدود نہیں۔ وہ تو اک دانش کدہ ہے جس میں ہر موضوع پر بات کی گئی ہے۔ لکھی ہوئی تاریخ سے بہت پہلے کی کہانیاں ہیں۔ اختلافات کے متعلق ہدایات ہیں۔ تخلیق کائنات کے متعلق اشارے ہیں۔ نباتات، حیوانات، جمادات سے متعلق علوم کی باتیں، حکمت کی باتیں، صحت کی باتیں، ادویات کی باتیں، سورج، چاند، ستارے، زمین، خلا ہر موضوع پر دانش کی باتیں۔ مختصر یہ کہ

جسے میں دریا سمجھتا تھا، وہ سمندر نکلا۔ ایک نومسلم انگریز نے قرآن کی عظمت بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا ہے۔ لکھتا ہے:

دو دوست تھے۔ ایک تاجر اور دوسرا ملاح۔ تاجر نے ملاح کو قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ دکھایا۔ بولا: ''اسے پڑھو۔''

ملاح نے اس وقت ورق گردانی کی۔ اتفاق سے ایسا صفحہ کھل گیا جس میں سمندری طوفان کا ذکر تھا۔

ملاح اسے پڑھنے لگا۔ پڑھتا رہا، پھر بولا: ''یار یہ جو محمد تھا، کیا وہ ذات کا ملاح تھا؟''

تاجر نے کہا: ''نہیں! ملاح نہیں تھا۔ وہ تو لق و دق صحرا کا رہنے والا تھا۔''

''تو ضرور اس نے سمندری سفر کیا ہوگا۔''

تاجر بولا: ''نہیں، اس نے کبھی سمندری سفر نہیں کیا تھا۔''

''نہیں، میں نہیں مانتا۔'' ملاح چلایا۔ ''اس نے اس کتاب میں سمندری طوفان کی ایسی تفصیل لکھی ہے جو صرف وہ شخص لکھ سکتا ہے جس نے سمندری طوفان دیکھا ہو، بیتا ہو۔ کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔''

تاجر نے کہا: ''نہیں، اس نے سمندری طوفان کبھی نہیں بیتا تھا۔''

''اگر ایسا ہے۔'' ملاح چلایا۔ ''تو یہ کتاب محمد ﷺ نے نہیں لکھی۔ یقیناً یہ کتاب الہامی ہے۔''

صرف سمندری طوفان کی بات نہیں، قرآن میں ہزاروں برس پرانی کہانیاں ایسی تفصیل سے لکھی ہیں جیسے کوئی آنکھوں دیکھی پر کمنٹری کر رہا ہو۔ بادشاہوں کے نام، شہروں کے نام، قوموں کے نام اور ان کے کردار، ان کی ثقافت، ان کے مذاہب ..... ہر بات تفصیل سے رقم کی ہے۔

جب قرآن اخلاق پر بات کرتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے یہ کتاب اخلاقیات کی کتاب ہے۔ وہ انسانی رشتوں کے جملہ پہلوؤں پر بات کرتا ہے۔ ماں باپ سے کیسا سلوک روا رکھنا چاہیے، مہمان سے کیسا، دشمن سے کیسا، بادشاہ کو رعایا سے کیسا سلوک روا رکھنا چاہیے اور

رعایا کو بادشاہ سے کیسا...... ایسا لگتا ہے جیسے قرآن مسلمانوں سے نہیں بلکہ بنی نوع انسان سے مخاطب ہو۔

ہاں تو قرآن پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔

حیرت انگیز

پھر مجھے یہ شوق چرایا کہ دیکھوں، دانشوروں کا قرآن کے متعلق کیا خیال ہے۔ ایسے دانشوروں کا جو اس کے حق میں یا اس کے خلاف تعصب نہ رکھتے ہوں، جن کا نقطۂ نظر جذباتی نہ ہو بلکہ حقیقت پسند ہو۔

میں نے دیکھا کہ آج کے دانش ور اور سائنس دان جنھیں قرآن کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، حیران ہیں کہ یہ کیسی کتاب ہے۔ ایسی کتاب تو کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

ویسے تو چودہ سو سال پرانی ہے لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو پرانی محسوس ہو۔ کوئی بات ایسی جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ یہ بات پرانے زمانوں میں صحیح مانی جاتی تھی۔

اس کتاب کا انداز اور رخ تازہ اور شگفتہ ہے اور وہ آج کی سائنسی معلومات سے ہم آہنگ ہے۔

قرآن کی دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ اس کا انداز تحکمانہ نہیں۔ عام طور پر مذہبی کتابیں حکم چلاتی ہیں کہ لوگو! یہ کرو، خبردار! وہ نہ کرنا۔ یوں کرو، ووں نہ کرنا۔

جو ہم کہہ رہے ہیں، اس پر سچے دل سے ایمان لے آؤ۔

خبردار! دل میں شک و شبہات نہ لانا، حجت نہ کرنا، ہم جو کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے تو پھر شک و شبے کا کیا مطلب۔ پس تم پر فرض ہے کہ اسے سچ مانو۔

محقق اور سائنس دان اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کا انداز Authoritarian نہیں۔ وہ سوچ بچار، عقل یا فکر سے منع نہیں کرتا۔ قرآن کا بات کرنے کا انداز دوسری مذہبی کتابوں سے سراسر مختلف ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے:

''اچھا تو تم اسے سچ نہیں مانتے۔ تو پھر تم ہی سوچو کہ سچ کیا ہے۔ اگر تم نہیں جانتے تو ان لوگوں سے مشورہ کرو جو جانتے ہیں۔''

''اگر تم اس کتاب کو سچ نہیں مانتے تو ضرور اس میں غلطیاں ہوں گی، تضادات ہوں گے، یعنی ایسی باتیں جو ایک دوسری کو جھٹلائیں۔ تم اس کتاب میں غلطیاں تلاش کرو...... لیکن تم ایک غلطی بھی تلاش نہیں کر سکو گے۔''

آج کے سائنس دان قرآن کے اس رویے پر حیران ہیں کیونکہ یہ وہ رویہ ہے جو سائنس دانوں نے اپنا رکھا ہے۔

فالسی فیکیشن ٹیسٹ

سائنس دان گیری ملر کا کہنا ہے کہ قرآن کا رویہ تحقیقی رویہ ہے۔ اسے آج کے سائنس دان Falsification ٹیسٹ کہتے ہیں۔

آج اگر کوئی سائنس دان نئی تھیوری پیش کرتا ہے تو دوسرے سائنس دان کہتے ہیں، میاں ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ ہاں، اگر تمھارے پاس اس تھیوری کا Falsification ٹیسٹ موجود ہے تو اور بات ہے۔ اس صورت میں ہم تمھاری تھیوری پر غور و فکر کر سکتے ہیں۔

Falsification Test کا مطلب ہے نئی تھیوری کو غلط ثابت کرنے کا طریقہ۔ قرآن فالسیفیکیشن ٹیسٹ پیش کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے، اس کتاب کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتے ہو تو کوئی ایک غلطی ڈھونڈ نکالو، یا کوئی دو ایسی باتیں ڈھونڈ نکالو جو ایک دوسری کو جھٹلاتی ہوں۔

چلو قرآن جیسی چار ایک آیتیں ہی لکھ دو۔

صاحبو! ہم سمجھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا زمانہ جہالت کا زمانہ تھا۔ ان دنوں مکے میں بدو رہتے تھے جو غیر مہذب تھے، جاہل تھے۔ یہ بات غلط ہے۔ اس کے برعکس تاریخ شاہد ہے کہ مکے میں قبیلوں کے سردار رکھتے تھے۔ ان کی حیثیت بالکل ایسی تھی جیسے ہمارے قبائلی

علاقوں کے سرداروں کی ہے۔ وہ بڑے خوددار تھے، ہوش مند تھے۔ بڑے زبان دان تھے، شاعر تھے، شعروسخن کے دلدادہ تھے۔ اس کے باوجود وہ قرآن جیسی آیات لکھ کر قرآن کو جھٹلا نہ سکے۔

قرآن کی زبان اتنی حسین ہے، اس میں اتنا ردھم ہے، اتنی ایلیسٹریشن ہے، ایسا ساؤنڈ افیکٹ ہے کہ ناواقف لوگ بھی سن کر سر دھنتے ہیں۔

ابولہب اور یہودی

فالسی فیکشن ٹیسٹ کے سلسلے میں گیری ملر نے دو بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ لکھتا ہے:

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک چچا تھا۔ اس کا نام ابولہب تھا۔

ابولہب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد قرآن، اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانا تھا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ جہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم جاتے، وہ پیچھے پیچھے جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو جھٹلاتا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے کہ یہ چیز سفید ہے تو وہ جھٹ بول اٹھتا، نہیں یہ چیز کالی ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے کہ دن ہے تو وہ کہتا، نہیں رات ہے۔

قرآن میں ابولہب کا ذکر بھی آیا ہے کہ

وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ دوزخ کی آگ میں جلنا اس کا مقدر ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کبھی اسلام قبول نہیں کرے گا، کافر ہی رہے گا۔

گیری ملر لکھتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابولہب دس سال زندہ رہا۔ اس کے لیے قرآن کو جھٹلانا بہت آسان تھا۔ وہ مسلمانوں سے کہتا، دوستو! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں، مجھے مسلمان بنا لو ..... جب وہ مسلمان بنا لیتے تو کہتا، لو بھئی! تمھارا قرآن جھوٹا ثابت ہو گیا۔ اب بولو۔ لیکن ابولہب نے ایسا نہیں کیا حالانکہ اس کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ قرآن کو جھوٹا ثابت کرے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلائے۔

گیری ملر ایسی ہی ایک اور مثال دیتا ہے۔ لکھتا ہے:

قوموں کی حیثیت سے انسانی رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ بحیثیت قوم، یہودیوں کی نسبت عیسائی مسلمانوں سے بہتر سلوک روا رکھیں گے۔ لہٰذا یہودیوں کے لیے قرآن کو جھٹلانا بڑا آسان کام تھا۔

یہودی مسلمانوں سے میل جول بڑھاتے۔ ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ انھیں اپناتے ..... پھر کہتے، مسلمانو! تمھارا قرآن غلط ہے۔ چونکہ ہم مسلمانوں سے عیسائیوں کی نسبت بہتر تعلقات کے حامل ہیں لیکن یہودیوں نے ایسا نہیں کیا، اور لگتا ہے کہ مستقبل میں بھی ایسا نہیں کریں گے۔

گیری ملر نے تو بڑی رواداری سے بات کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کا مسلمانوں سے جو رویہ ہے، وہ قرآن کو جھٹلانے کی بجائے اس کے دعوے کو شدت سے تقویت دیتا ہے۔

قرآن پڑھنے سے پہلے میں حیران ہوا کرتا تھا کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ ہر فرقہ وار اپنے نظریات کے جواز کے لیے قرآن کا حوالہ دیتا ہے حالانکہ ان کے نظریات مختلف یا متضاد ہوتے ہیں۔

عقل و شعور کو ماننے والے بھی قرآن کا حوالہ دیتے ہیں۔ جذبے اور وجدان کو ماننے والے بھی قرآن کا حوالہ دیتے ہیں۔ تنگ خیال کٹر مسلمان بھی اپنے مسلک کا جواز قرآن سے اخذ کرتے ہیں۔ وسعت قلب کو ماننے والے بھی قرآن کو کوٹ (Quote) کرتے ہیں۔

پرانی بات ہے، ان دنوں میں سرکاری میڈیا کے ایک محکمے میں کام کرتا تھا۔ اوپر سے حکم آتا کہ قرآن سے فلاں بات کے جواز کے لیے آیت تلاش کرو اور حکومت کے فلاں اقدام کے حق میں سکرپٹ لکھ کر اسے نشر کرو۔ حکم موصول ہونے پر ہم مولوی صاحب کو بلا بھیجتے جو میڈیا کے سٹاف پر تھے۔ مولوی صاحب بغیر کسی تردد کے آیت ڈھونڈ کر مجھے اس کا ترجمہ لکھا دیتے اور میں سکرپٹ لکھ دیتا۔ ان دنوں مجھے کبھی احساس نہ ہوا تھا کہ ہم قرآن کو استعمال کر رہے ہیں اور لاجک کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ Premisis

سے نتیجہ نہیں نکالتے بلکہ نتیجہ کے لیے Premisis تلاش کرتے ہیں۔ اسے لاجک میں ''کارٹ بی فور دی ہارس(Cart before the horse)'' کہتے ہیں یعنی الٹی گنگا......

پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔

پاکستان بننے کے بعد تو اسلام کو استعمال کرنے کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ آمر نے اپنی آمریت کو مستحکم کرنے کے لیے اسلام کو استعمال کیا۔ بی بی جمہوریت نے اپنی عظمت قائم کرنے کے لیے اسلام کے نعرے لگائے۔ سیاستیوں نے اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لیے اسلام کو برتا۔ مذہبی لیڈروں نے اپنی اہمیت قائم کرنے کے لیے اسلامی روپ دھارا۔ مولوی اور علمائے دین تو خیر ہمیشہ سے اپنی اہمیت جتانے کے لیے، اپنی اتھارٹی چلانے کے لیے اسلام کو استعمال کرتے رہے اور گمان غالب ہے کہ کرتے رہیں گے۔ میں نے اپنے دوست احمد بشیر سے پوچھا: ''یار تو اتنا بڑا اور سینئر صحافی ہے، یہ بتا کیا تو نے کبھی اسلام کی خدمت بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں تیری کیا Contribution ہے؟''

بولا: ''میں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ مسلسل کی ہے اور کر رہا ہوں!''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

بولا: ''اسلام پر میرا بہت بڑا احسان ہے کہ میں نے کبھی اسلام کو استعمال نہیں کیا۔ اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہ اپنی تحریر کو تقویت دینے کے لیے۔ اس سے بڑی خدمت کیا ہو سکتی ہے؟''

''بے شک!'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بہت بڑی خدمت ہے۔''

صاحبو! اب تو اسلام کو استعمال کرنے کی رسم اس قدر عام ہو چکی ہے کہ ہمیں احساس ہی نہیں رہا کہ یہ ایک قبیح فعل ہے۔ بالکل ایسے جیسے رشوت لینا عام ہو چکا ہے اور ہم نے اسے Legalise کر لیا ہے۔ سیاسی پارٹیاں کھلم کھلا اسلام کے نام کو استعمال کر رہی ہیں۔ گذشتہ 46 سال میں کسی اسلامی پارٹی نے کسی الیکشن میں قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کی۔ الٹا ان کے رویے نے پڑھے لکھے لوگوں کے دلوں پر نفاذ اسلام کی دہشت طاری کر رکھی ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ جب ٹی وی کا کیمرا ارکان اسمبلی کو Pan کرتا ہے تو چلتے چلتے

دفعۃً ایک کونے میں ایک غیر از معمول منظر سامنے آ جاتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن کے لباس، انداز، طور طریقے بالکل مختلف ہوتے ہیں...... ناظر کو ایک دھچکا سا لگتا ہے۔ اسمبلی میں یہ aliens کہاں سے آ گئے۔ مجھے حیرت ہے یہ لوگ اسمبلی میں کس امید پر بیٹھے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ جس جمہوریت کی یہ خدمت کر رہے ہیں، اس کا رنگ غیر اسلامی ہے۔

ذاتی معاملہ

آج کل اخباروں میں مدیر کے نام خطوط کے کالم میں ایسے خطوط شائع ہو رہے ہیں جن کا عنوان کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ ''میں نے اسلامی پارٹیوں کو ووٹ کیوں نہ دیا، کیوں نہ دوں گا؟''

مثال کے طور پر ایک انگریزی روزنامے میں ایسی ہی نوعیت کا خط یکم دسمبر کو شائع ہوا تھا جس کا لب لباب مَیں اپنے لفظوں میں شائع کرتا ہوں:

''ازراہ کرم اپنے اخبار میں اشاعت کر کے قارئین کو بتا دیجیے کہ میں نے مذہبی پارٹیوں کو ووٹ دینے سے کیوں انکار کیا۔ انکار اس لیے کیا کہ انھوں نے اسلام کو الیکشن ''ایشو'' بنا رکھا ہے۔ اس طرح انھوں نے اسلام کو ایک بحث طلب مسئلہ بنا دیا ہے۔

''میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام نہ تو الیکشن ''ایشو'' ہے اور نہ بحث طلب مسئلہ۔ میرے نزدیک اسلام ایک ضابطہ حیات ہے۔

''ہمارے ہاں بہت سے مذہبی فرقے ہیں...... سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، ہر پارٹی کا اسلام کے متعلق مختلف نظریہ ہے۔ میرے نزدیک اسلام اختلاف نہیں۔ اسلام ایک ہے، فرد اور اللہ کے درمیان تعلق۔

''ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نظریے کے مطابق اسلام جیے بشرطیکہ وہ اپنا نظریہ دوسروں پر نہ ٹھونسے۔ اسے حق حاصل ہے کہ اپنے خیالات کے مطابق فرائض ادا کرے اور اپنی مرضی کے مطابق کوئی سافقہ مان لے۔ کسی مولوی یا دینی عالم کو یہ حق حاصل

نہیں کہ اس میں دخل دے...... انھوں نے مجھے بتایا کہ اگر کوئی مسلمان ہاتھ یا پاؤں کو کاٹنے یا سنگسار کرنے کے اصول کو مان لے تو وہ بہتر مسلمان بن جاتا ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ میں اس لیے مسلمان ہوں کہ میرے دل میں حضور اعلیٰ ﷺ اور اللہ کی محبت گامزن ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں دوزخ کے عذاب سے خوف زدہ ہوں۔ میرے اسلام کی بنیاد محبت ہے، خوف نہیں۔ اگر مولوی لوگ اپنے اسلام کی بنیاد خوف پر رکھنا چاہتے ہیں تو بے شک رکھیں......" (غلام کبریا۔ کراچی)

یہ خوش فہمی کہ مذہب ذاتی معاملہ ہے، مذہب سے فرار کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ میں بھی ایک زمانے میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ مذہب ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ اسلام اگر ذاتی معاملہ ہے تو پھر اسلام ایک کیسے ہوسکتا ہے؟ پھر تو ہر فرد کا اپنا اسلام ہوا۔ دراصل ایسے چمکیلے خیالات مغرب سے آتے ہیں اور ہمارے نوجوانوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔

شک کرو

سب سے پہلا مغربی خیال جس نے میری آنکھوں کو خیرہ کیا، رسل کا Scepticism تھا کہ ہر بات میں شک کرو۔ اس خیال نے میری ساری جوانی کو دھندلائے رکھا۔

حالانکہ حقیقت سامنے دھری تھی لیکن یہ بات مجھے نظر نہ آئی کہ یہ تو ایک منفی اصول ہے اور منفی اصول زندگی میں روانی پیدا نہیں کر سکتے۔ شاید تحقیق کرنے والوں کے لیے شک کرنے کا اصول کارآمد ہو۔ عام آدمی کے لیے تو ایک دوسرے کی بات مان لینا، بھروسہ کرنا اہم ہے کیونکہ انسان مجلسی مخلوق ہے۔ ہر فرد کی زندگی میں بیشتر باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں جانے مانے بغیر بات نہیں بنتی۔

عرصہ دراز تک ایسی رسل کے اس چمکیلے خیال کو سینے سے لگائے بیٹھا رہا، پھر مجھے پتا چلا کہ زندگی بسر کرنے کے لیے شک نہیں بلکہ ایمان کی ضرورت ہے۔ اپنی انگلی جلائے بغیر ماننا پڑتا ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ آئن سٹائن کی تھیوری کو پرکھے بغیر ماننا پڑتا ہے کہ ہر ذرے

میں ایک سولر سسٹم موجود ہے۔ ہم سب تحقیق کے بغیر مانتے ہیں کہ فلاں شخص ہمارا باپ ہے۔ صاحبو! مان لینے میں بڑا سکھ ہے۔

ڈاکٹر ابدال بیلا

ڈاکٹر ابدال بیلا سے ایک روز میں نے پوچھا: "ڈاکٹر یہ بتلا، کیا تم نے پورے طور پر جان لیا ہے کہ انسانی جسم کس طرح کام کرتا ہے؟"

ڈاکٹر ابدال بیلا میرا دوست ہے۔ وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے۔ ساتھ ہی افسانہ نویس بھی ہے۔ ڈاکٹر کے حوالے سے وہ سختی سے حقیقت پسند ہے۔ رائٹر کے حوالے سے وہ خواب دیکھتا ہے۔ دیکھنے میں خالص جسمی ہے۔ اونچا لمبا، پٹھے ہی پٹھے، مونچھ ہی مونچھ۔ باہر جسم ہی جسم ہے اندر سوچیں ہی سوچیں۔ اندر، باہر کو جھٹلاتا ہے، باہر اندر کو۔ خیال میں ماڈرن ہی ماڈرن، جذبات میں ٹریڈیشن ہی ٹریڈیشن۔

ایک طرفہ تماشا ہے۔

میں نے پوچھا: "بتاؤ ڈاکٹر! کیا تم "ورکنگ آف دی ہیومن باڈی" کو پورے طور پر سمجھتے ہو؟"

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ بولا: "بالکل نہیں۔"

میں نے کہا: "کیا تمام ڈاکٹر جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

میں نے کہا: "بیلا! سیانے کہتے ہیں کہ جاننے کے حوالے سے دنیا میں چار قسم کے لوگ ہیں۔

وہ جو جانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔

دوسرے وہ جو جانتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ جانتے ہیں۔

تیسرے وہ جو نہیں جانتے اور جانتے ہیں کہ نہیں جانتے۔

چوتھے وہ جو نہیں جانتے اور نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے۔

''بولو بیلا!'' میں نے کہا: ''تم ڈاکٹروں کو کس کیٹیگری میں رکھتے ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم!'' وہ بولا: ''میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ اگر میں صاحب اختیار ہوتا تو حکم دیتا کہ میڈیکل کتابوں کے ہر صفحے کے اوپر جلی حروف میں لکھ دو کہ ابھی ہم ہیومن باڈی کے اسرار و رموز کو پورے طور پر نہیں سمجھے اور ہر ڈاکٹر پر عائد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کمرے میں یہ جملہ جلی حروف میں لکھ کر دیوار پر ٹانک دے تا کہ یہ حقیقت ہر وقت اس کے ذہن میں رہے۔''

میں نے کہا: ''اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم جسم کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہو تو علاج معالجہ کیسے کرتے ہوں؟''

کہنے لگا: ''اندازے لگاتے ہیں۔ پرانے حکیم بھی اندازے لگایا کرتے تھے۔''

میں نے کہا: ''تمھارے اور ان کے اندازوں میں بڑا فرق ہے۔''

بولا: ''وہ کیسے؟''

انٹیوشن

میں نے کہا: ''ان کے اندازے Intution کے زور پر ہوتے تھے، تمھارے اندازے مشینی ٹیسٹوں کے زور پر ہوتے ہیں۔''

صاحبو! ہم نے اس حقیقت کو آج تک نہیں مانا کہ جتنا علم، جتنی دانش آج ہمارے پاس ہے، سب Intution سے آئے ہیں۔ انٹیوشن کیا ہے؟ علم و دانش کا قطرہ قطرہ جو اللہ میاں انسانی ذہن میں ٹپکاتا رہتا ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ تمام ڈسکوری (Discovery) تمام انونشن (Invention) کی پشت پر انٹیوشن کارفرما ہے۔ سب سے پہلے انکشافات شاعروں کے ذریعے اتارے جاتے ہیں۔ پھر محققوں کو عطا کیے جاتے ہیں۔ انٹیوشن درحقیقت وحی ہے۔ قطرہ قطرہ ہو تو انٹیوشن ..... دھارا ہو تو وحی۔ ترسیل ان ڈائریکٹ (Indirect) ہو تو انٹیوشن ..... ڈائریکٹ (Direct) ہو تو وحی ..... سمندر ہو تو قرآن حکیم .....

کہتے ہیں پرانے زمانے میں ایک قبیلہ سمندر سے بہت فاصلے پر آباد تھا۔ انھوں نے

کبھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔ یہ لوگ پانی کو ''آناؤ'' کہتے تھے۔ اس قبیلے کا ایک شخص سفر پر گیا تو اتفاقاً سمندر دیکھ آیا۔ واپس آ کر اس نے اپنے قبیلے والوں کو سمندر سمجھانے کی کوشش کی۔ بولا: ''آناؤ۔ آؤ آؤ آؤ آؤ آؤ..... یعنی پانی ہی پانی، پانی ہی پانی، پانی ہی پانی۔ ایسے ہی قرآن، علم و دانش کا ایک سمندر ہے۔ قرآن حکیم منفی اصولوں کا پرچار نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہتا کہ شک کرو بلکہ کہتا ہے کہ دیکھو، غور سے دیکھو، سمجھنے کی کوشش کرو، پھر کوشش کرو، پھر کوشش کرو۔ بات سمجھ میں نہ آئے تو ان لوگوں سے پوچھو جو جانتے ہیں۔ پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو کوئی رائے قائم نہ کرو، نہ مانو، نہ رد کرو یعنی Opinion Suspend کر دو۔

آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے کہہ دیا تھا کہ ''زندگی'' کی ابتدا پانی سے ہوئی۔ اس پر دانشوروں نے کہا: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ زندگی پانی سے بنی ہو؟'' انھوں نے اس بات کو مذاق مین اڑا دیا۔

پھر بارہ سو سال کے بعد کسی محقق نے خوردبین ایجاد کر دی۔ خوردبین کی ایجاد کے بعد پانی میں جھانکنا ممکن ہو گیا۔ پھر جو پانی میں جھانکا تو سائنس دان یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پانی زندگی کے جرثوموں سے بھرا پڑا ہے۔

آوارہ علم

دراصل سارا جھگڑا سائنس کے بارے میں ہماری خوش فہمی نے پھیلا رکھا ہے۔ ہم سمجھنے لگے ہیں کہ سائنس ایک مکمل علم ہے ..... دراصل آج کی سائنس اللہ کی حکمتوں کو سمجھنے کی ایک نامکمل آوارہ کوشش ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔

سائنسی تحقیق کی ابتدا مسلمانوں نے کی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب یورپ زمانہ جہالت کے دور سے گزر رہا تھا۔ مسلمانوں کی سائنسی تحقیق کی پشت پر کائنات کا خالق تھا۔ کائنات ایک کنفیوزڈ (Confused) پھیلاؤ نہیں تھا۔ کائنات کا ایک مقصد تھا، ایک نظم تھا، ایک منصوبہ بندی تھی، ایک منزل تھی۔ مسلمان سائنس دانوں کی تحریروں میں قرآن کریم کے حوالے ملتے ہیں۔ پھر بدقسمتی سے مسلمانوں کی توجہ کائناتی فکر سے ہٹ کر دینی مشاغل

تک محدود ہو گئی۔

یوں سائنسی تحقیق یورپین محققوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یورپی محققوں میں خلوص ہے، صلاحیت ہے، Devotion ہے، سبھی کچھ ہے، صرف ایک کمی ہے، وہ کائنات کو تخلیق کار کے حوالے سے نہیں دیکھتے، صرف تخلیق کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ خالق کے حوالے سے نہ دیکھو تو کائنات ایک جنگل بن جاتی ہے۔ اس میں مقصد رہتا ہے نہ منزل، منصوبہ بندی نہ نظام۔ اس لیے تحقیق آوارہ ہو جاتی ہے۔

نیوٹن اور سیب

نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا اور کشش کا بھید پالیا۔ اس نے سیب کے گرنے کے عمل کو دیکھا، سیب کو نہ دیکھا۔ سیب کو دیکھتا، تو دیکھتا کہ اتنے چھوٹے سے بیج میں کیا کیا رکھ دیا گیا؟ ایک درخت، تنا، شاخیں، پتے، پھل۔

سیب کو دیکھتا...... تو دیکھتا کہ درخت پر پھل جب تک کچا ہوتا ہے، سبز رنگ کا ہوتا ہے، سبز پتوں میں چھپا رہتا ہے۔ جب پک جاتا ہے (کھانے کے قابل ہو جاتا ہے) تو رنگ بدل جاتا ہے، لال ہو جاتا ہے تاکہ نظر آئے۔ پھر وہ ہر راہ گیر کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے۔ آؤ مجھے توڑو، کھاؤ۔ میری غایت کھائے جانا ہے۔ میں انسان کی خوراک بننے کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔

قرآن کہتا ہے کہ لوگو! ہم نے یہ تمام قوتیں نعمتیں تمھارے لیے بکھیر رکھی ہیں تاکہ تم انھیں مسخر کرو اور اپنے استعمال میں لاؤ۔ یہ کائنات تمھارے لیے ہے۔ تم اشرف المخلوقات ہو۔ سبحان اللہ! اللہ نے انسان کو کیا مقام دے رکھا ہے۔

کبھی کسی راہبر نے ہمیں آواز دے کر نہیں کہا کہ لوگو! ہوش کرو۔ کیا کر رہے ہو؟ اس شرف کا خیال کرو جو اللہ نے تمھیں دے رکھا ہے۔ صاحبو! مجھ سے تو جو راہبر ملتا ہے، یہی کہتا ہے کہ تم غلیظ ہو، گنہگار ہو، ناپاک ہو۔

سال میں ایک مرتبہ محلے کی مسجد سے چند بزرگ صورت اصحاب تشریف لاتے ہیں۔

وہ میرے گھر کا دروازہ بجاتے ہیں۔ میں باہر آتا ہوں تو کہتے ہیں: ''بھائی صاحب! آپ نماز پڑھا کریں۔''

''بہت بہتر جناب۔'' میں جواب دیتا ہوں۔ ''آپ بجا فرماتے ہیں لیکن میں بھی آپ کی خدمت میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ پوچھتے ہیں: ''جی فرمایئے!''

میں کہتا ہوں: ''عالی جاہ! نماز کی فرضیت بسر و چشم لیکن کبھی آ کر یہ بھی کہیے کہ پڑوسی سے اچھے تعلقات قائم کیجیے۔ محلے والوں کی خدمت کیجیے۔ کبھی کہیے کہ بانٹ کر کھایئے۔ بانٹ کر کھانے سے چیز حلال ہو جاتی ہے۔ عالی جاہ! کبھی کسی ڈاڑھی والے کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھیے، جناب! آپ نے جو ڈاڑھی رکھی ہے، کیا آپ اس کی لاج پال رہے ہیں؟ آپ نے دکان کو مال سے بھر لیا ہے یا خالی دکان پر بورڈ لگا رکھا ہے؟''

علمائے دین

صاحبو! میں علمائے دین کی عزت کرتا ہوں۔ میں انھیں علی مرتبت سمجھتا ہوں۔ چونکہ وہ ہمارے راہبر ہیں، اس لیے ان پر بھاری ذمے داری عاید ہوتی ہے۔ مجھے ان سے شکایت ہے۔ شکایت انھی سے کی جاتی ہے جو بڑے ہوں، صاحب اقتدار ہوں، جن سے ہم نے امیدیں استوار کر رکھی ہوں۔

مجھے ان سے شکایت ہے کہ انھوں نے آج تک سنجیدگی سے نہیں سوچا کہ ان کی تبلیغ کا کیا رخ ہونا چاہیے۔ انھوں نے دور ماضی کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دور حاضرہ راستے سے بھٹکا ہوا دور ہے، ملحد ہے، راندۂ درگاہ ہے، اس لیے لائق توجہ نہیں۔ حالانکہ یہی وہ مقام ہے جہاں تبلیغ کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کبھی نہیں سوچا کہ کس انداز سے بات کی جائے کہ دور حاضرہ پر اثر رکھے۔ انھوں نے کبھی نہیں جانا کہ ان کا مقابلہ میڈیا سے ہے، ڈش انٹینا سے ہے، آوارہ، بے مقصد، بے منزل سائنس سے ہے۔

میرے دوست اشفاق احمد کا کہنا ہے:

''مولوی قابل احترام ہیں، اس لیے کہ انھوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ سالہا سال سے وہ مسجدوں کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ سالہا سال سے وہ بروقت اذان دے کر مسلمانوں کو یاد دلاتے رہتے ہیں کہ آ ؤ اللہ کے حضور سر بسجود ہونے کا وقت ہے۔''

اشفاق احمد کا کہنا ہے کہ مولویوں نے اسلام کو زندہ کر رکھا ہے۔

اشفاق احمد کی بات ایک حد تک درست ہے۔

اسلام کے دو پہلو ہیں۔ ایک فارم، دوسرے سپرٹ۔ بے شک مولویوں نے اسلام کی فارم کی خدمت کی ہے، وہ بھی صرف نماز کی حد تک۔ انھوں نے اسلام کو نماز تک محدود کر دیا ہے۔ آج اسلام کا مبلغ صرف نماز کی تلقین کرتا ہے۔ اس نے اسلامی کردار کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اسلام صرف فارم تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ نماز پڑھو، پاجامہ ٹخنوں تک نہ پہنچے۔

آج سنت صرف جسمانی حد تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کہتے ہیں، کمرے میں داخل ہوتے وقت خیال رکھو کہ دایاں پاؤں اندر دھرنا ہے۔ دائیں ہاتھ سے پانی پیو۔ لبیں کاٹو۔ کوئی نہیں کہتا کہ سچ بولو، سنت ہے۔ بانٹ کر کھاؤ، سنت ہے۔ لوگوں کے حقوق ادا کرو، سنت ہے۔

مولوی نے خدمت کے نقطۂ نظر سے مسجد کو آباد نہیں رکھا بلکہ اپنی امامت قائم کرنے کے لیے آباد رکھا ہے۔ مولوی نے نماز کا پرچار اس لیے کیا کہ نماز کے پرچار سے مولوی کی ذاتی اہمیت وابستہ ہے۔ مولوی آج بھی دیہات پر حکومت کر رہے ہیں۔

مولوی نے اسلام کو زندہ نہیں رکھا بلکہ اس سمندر کو چو بچہ بنا دیا ہے۔ اسلام کو زندہ صوفیوں نے رکھا، اولیائے کرام نے رکھا، خود اس نے رکھا جس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہے۔

حکم، مصلحت

مبلغ کہتے ہیں، نماز قائم کر لو تو کردار خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کچھ نمازیوں میں ہو جاتا ہو، بیشتر نمازی محروم رہتے ہیں۔ ہمارے مبلغ کہتے ہیں کہ نماز کا اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہمیں برائیوں سے بچاتی ہے، حفظانِ صحت ہے۔ میری دانست میں اللہ کے حکم کو rationalise کرنا، اس میں مصلحتیں تلاش کرنا، حکم کے لفظ کی توہین کے مترادف ہے۔ نماز قائم کرو، اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے۔ بس، اس کے بعد بات کرنے کی گنجائش بھی ہو۔

قدرت اللہ شہاب کی بیگم ڈاکٹر عفت لندن کے ایک ہوٹل میں بیٹھی تھیں۔ اسی ٹیبل پر ایک فوجی افسر وردی پہنے بیٹھا تھا۔ فوجی افسر نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا: ''لیڈی! آپ مسلمان ہیں؟''

''الحمدللہ!'' ڈاکٹر عفت نے کہا۔

فوجی بولا: ''کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟''

''پوچھیے!'' ڈاکٹر عفت نے کہا۔

فوجی بولا: ''آپ سوٴر کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟''

عفت نے کہا: ''میرے اللہ کا حکم ہے کہ مت کھاؤ، اس لیے نہیں کھاتی۔''

فوجی بولا: ''اس حکم کے پیچھے کیا دلیل ہے؟''

عفت نے کہا: ''آپ فوجی ہو کر حکم کے مفہوم کو نہیں جانتے، حکم کی عظمت کو نہیں جانتے۔ حکم، دلیل اور مصلحت سے بے نیاز ہوتا ہے۔''

-☆-

باب:5

آٹے میں پانی......دُودھ میں سفیدی

نفاذ اسلام

اس روز میرے ایک پڑھے لکھے بزرگ، جو ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد گاؤں میں رہائش پذیر تھے، مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ برسبیل تذکرہ اسلام کی بات چل پڑی۔ میں نے کہا: ''چچا جان! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

بولے: ''کیا؟''

میں نے کہا: ''ہم نے پاکستان اس لیے بنایا تھا کہ ہم یہاں اسلام نافذ کریں گے اور اسلامی روایات کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ ہے نا؟''

''بالکل۔'' وہ بولے۔

''یہاں ہر شخص اس بات کا خواہش مند ہے اور ہر سیاسی پارٹی چاہتی ہے کہ اسلام نافذ ہو۔ آج پاکستان کو بنے چھیالیس سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک ہم اسلام نافذ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کتنی حیرت کی بات ہے۔ آخر کیوں؟ بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

چچا بولے: ''بھئی جس علاقے میں مَیں رہتا ہوں، وہاں تو اسلام نافذ ہے۔''

''کیا کہا؟'' میں نے حیرت سے چلا کر پوچھا۔

بولے: ''بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟'' میں نے کہا۔

''بالکل نہیں۔'' وہ بولے۔

''لیکن کیسے؟''

بولے: ''مثلاً ہمارے گاؤں میں چار عورتیں بیٹھی کام کر رہی ہیں۔ پاس ایک بچہ کھیل رہا ہے۔ بچے کو ٹھوکر لگتی ہے، وہ گرنے لگتا ہے تو چاروں عورتوں کے منہ سے ان جانے میں نکلتا ہے، بسم اللہ! حالانکہ بچے کے گرنے کو اللہ کے نام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

''مثلاً چار آدمی بیٹھے ہیں۔ کوئی شخص ایک خوبصورت چیز لا کر انھیں دکھاتا ہے تو ان جانے میں سب چلا کر کہتے ہیں، سبحان اللہ!

''کوئی شخص چیز کی تعریف نہیں کرتا، چیز بنانے والے کی تعریف نہیں کرتا، سب اللہ کی تعریف کرتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ بھئی اللہ کہاں سے آ گیا؟ اللہ کا کیا مطلب ہے؟ لیکن اللہ آ جاتا ہے۔ لوگوں کے دلوں کے اندر والے خانے سے ''پڑپ'' کر باہر نکل آتا ہے۔

''بچے کو چپ کرانا ہو تو ''اللہ ہو، اللہ ہو'' کا ورد کرتے ہیں۔ بچے کو رونے سے چپ کرانے کے لیے اللہ کو بلانے کا کیا مطلب؟ کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔'' چچا بولے: ''وہاں تو بات بات پر اللہ دلوں سے نکل کر ہونٹوں پر آ جاتا ہے۔ ماشاء اللہ! انشاء اللہ! استغفر اللہ! لاحول ولا! اللہ کرے! خدانخواستہ!'' چچا ہنسے۔ ''لوگوں کے دلوں میں اللہ اس طرح سمایا ہوا ہے جیسے گندھے آٹے میں پانی۔''

''اور جانتے ہو؟'' وہ بولے۔ ''یہ سب کس نے کیا ہے؟ صوفیوں نے۔ انھوں نے ہمارے Unconscious''......کیا کہتے ہو تم اسے؟'' چچا نے پوچھا۔

''لاشعور''۔ میں نے جواب دیا۔

جانے......ان جانے

''صوفیوں نے ہمارے لاشعور کے پنجرے میں اللہ کا میاں مٹھو بند کر دیا ہے۔ ہم ان جانے میں اللہ کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ ان جانے میں اللہ کے حضور دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ ان جانے میں اپنی امیدیں اس پر استوار کیے بیٹھے ہیں۔''

چچا رک گئے۔ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے: ''صرف لاشعوری ہی نہیں،

شعوری طور پر بھی اللہ ہمارے ذہن سے نہیں نکلتا۔ کسان صبح اٹھ کر جب آسمان کی طرف دیکھتا ہے تو وہ آسمان کو نہیں دیکھا۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ آسمان کے پیچھے اللہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بادلوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ اسے احساس ہے کہ اللہ بادل لاتا ہے، اللہ مینہ برساتا ہے، اللہ ہوا چلاتا ہے۔ وہ اللہ کے حوالے کے بغیر کچھ نہیں دیکھتا۔ موسم بذات خود اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ بدبختی، خوش بختی، خوشی، غمی، رزق سب کے پیچھے اللہ موجود ہوتا ہے۔''

کچھ دیر کے لیے وہ پھر رک گئے، پھر بولے:

''اب تم ہی بتاؤ کہ اس کے علاوہ اسلام کا نفاذ اور کیا ہوگا؟''

میں نے کبھی اس زاویۂ نظر سے نہیں سوچا تھا۔ میں نے چچا سے پوچھا تو وہ بولے:

''تم سمجھتے ہو، اسلام قانون سے آتا ہے۔ یہی تمھاری بھول ہے۔ اسلام قانون سے نہیں بلکہ کلچر سے آتا ہے، جذبات سے آتا ہے، لاشعور سے آتا ہے۔''

''لیکن یہ جو سیاسی ہیرا پھیریاں ہیں، مفاد پرستیاں ہیں، شر ہے، اور......''

چچا میری بات کاٹ کر ہنسے۔ بولے: ''یہ جو دودھ بھری چاٹی ہے نا، چھلک چھلک کر اس کے اوپر مکھن آ گیا ہے۔ طمع اور حرص کی وجہ سے یہ مکھن زہریلا ہو گیا ہے۔ اس زہریلے مکھن کو اتار پھینکو گے تو نیچے خیر کا خالص دودھ ہی دودھ ہے۔''

جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے

چچا کی بات پر سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس زاویے سے میں نے کیوں نہ سوچا؟ بات تو سامنے دھری تھی، پھر میری توجہ ادھر منعطف کیوں نہ ہوئی؟ ہمارے تمام رسم و رواج، طور طریقوں، رہن سہن میں اللہ گھسا بیٹھا ہے۔

بچہ پیدا ہوتا ہے تو بسم اللہ کہہ کر اسے ''گڑھتی'' چٹاتے ہیں۔ پھر اس کے کان میں اذان دیتے ہیں۔ صاحبو! یہ اذان، جو ظاہری طور پر ایک معصوم سا بلاوا ہے کہ ''آؤ اللہ کے حضور سربسجود ہو جائیں'' بڑی پراثر چیز ہے۔ کانوں سے دل میں جا بیٹھتی ہے۔ ہمارے اندر

کو انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیتی ہے۔ جبھی تو غیر مسلموں کی نظر میں بڑی خطرناک چیز ہے۔ سکھوں کو حکم ہے کہ اذان کان میں پڑھے تو کانوں میں انگلیاں ڈال لو اور بھاگ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جاؤ تاکہ اذان کی آواز سنائی نہ دے۔

یہاں اسلام آباد میں کچھ سفارت خانے ایسے ہیں جہاں اذان سننے کی ممانعت ہے۔ ایک سفیر صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ اذان سے کیوں خائف ہیں؟ بولے: ''پتا نہیں کیوں؟ لیکن اذان کی آواز سن کر مجھ پر وحشت سی طاری ہو جاتی ہے۔''

تاریخ شاہد ہے کہ کئی ایک غیر مسلم بادشاہوں نے اذان پر پابندی لگا رکھی تھی۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ بہر صورت یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے تمام رسم و رواج میں اللہ یوں رچا بسا ہے جیسے دودھ میں سفیدی۔ اور صاحبو! ایک بات کہہ دوں آپ سے، اس پلّے باندھ لیجیے کہ اللہ کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے، پھر آپ ہزار کوشش کر دیکھیں، وہاں سے نکلیں گے نہیں۔

باپ یا ماں

دراصل سارا قصور ہمارے راہبروں کا ہے۔ انھوں نے اللہ کے متعلق یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ اللہ ایک Father Head ہے۔ اس خیال کو پھیلانے میں عیسائیوں کا بھی حصہ ہے۔ ممکن ہے اس خیال کی ابتدا ہی عیسائیت نے کی ہو۔

بہر صورت یہ ایک غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہماری ماں ہے۔ اسے اپنی تخلیق سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ماں کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے۔

قرآن حکیم میں جگہ جگہ لوگوں کو ڈرایا گیا ہے۔ بار بار کہا گیا ہے کہ ہم نے لوگوں کو ڈرانے والے بھیجے۔

مائیں بھی تو اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی ہیں۔ اکثر سرزنش بھی کرتی ہیں لیکن ماں کی سرزنش میں تشدد نہیں ہوتا، بے رحمی نہیں ہوتی، انتقام نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات غصہ بھی دکھاوے کا ہوتا ہے، اصلی نہیں ہوتا۔

ہمارے علمائے دین نے قرآن حکیم کی اس ڈرانے والی تفصیل اور سرزنش کی دھمکی کو اس قدر اہمیت دے رکھی ہے کہ لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ قصائی ہو۔ ایک شاعر نے اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق خصوصاً انسان کے متعلق جذبات کے بارے میں کیا خوبصورت شعر کہا ہے۔ کہتے ہیں:

رنگین تر از حناست بہار و خزان ما
بر دست خویش بوسہ زند باغبان ما

کہتے ہیں، انسان کی بہار اور خزاں اتنی رنگین ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا کہ یہ میں نے کیا چیز بنادی ہے۔

سی اور لک

صرف انسان ہی پر محدود نہیں، یہ بات تمام مخلوقات پر عائد ہوتی ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز اس قدر خوبصورت ہے۔ گل، بوٹے، پتے، کانٹے، ایک ایک ذرہ حکمت اور حسن سے بھرا ہوا ہے۔ پتا نہیں وہ کون عالم تھا جس نے کہا تھا کہ اگر میں خدا ہوتا تو بالکل ایسی ہی دنیا بناتا، اس لیے کہ اس سے بہتر دنیا بن ہی نہیں سکتی۔

ایک عالمی شہرت کے آرٹسٹ نے کہا تھا: ''لوگو! شکر کرو کہ مانوسیت کے پردے کی وجہ سے ہمیں اس دنیا کا حسن نظر نہیں آتا۔ اگر ہمیں نظر آ جائے کہ پتے پتے میں، ذرّے ذرّے میں، کتنی حکمت ہے، کتنا حسن ہے، تو ہم پر ایسا عالم حیرت طاری ہو جائے کہ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں اور کسی کام جوگے نہ رہیں۔

قرآن حکیم میں بھی باری تعالیٰ بار بار فرماتے ہیں کہ لوگو دیکھو، غور سے دیکھو۔ تم دیکھتے کیوں نہیں؟ دیکھو تو سہی کہ ہم نے کیا کیا بنایا ہے۔ جب قرآن کہتا ہے کہ دیکھو۔ تو مطلب سرسری دیکھنا نہیں ہوتا۔ دیکھو سے مراد See نہیں بلکہ Look ہوتا ہے یعنی خالی دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ سمجھنے کے لیے دیکھو۔ یہ سائنسی رویہ ہے۔ سائنس نے یہ رویہ قرآن سے لیا ہے۔

ایک معروف سائنس دان نیتھینیل شیلر (Nathenial Shaler) نے دیکھنے کی اہمیت کو اپنے مضمون میں واضح کیا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے:

''اوگاسز نے مجھے دیکھنا کیسے سکھایا۔'' اوگاسز اس کا استاد تھا۔ شیلر لکھتا ہے:

''جب میں اپنے استاد اوگاسز کی لیب میں داخل ہوا تو انھوں نے ایک ٹین کی تھالی میں ایک مچھلی رکھ دی اور مجھ سے کہا، اسے دیکھو، غور سے دیکھو۔ اس کے بارے میں کسی سے بات کرنا نہ ہی کوئی حوالے کی کتاب پڑھنا۔ جب میں پوچھوں کہ تم نے کیا دیکھا؟ اس وقت مجھے بتانا، اس سے پہلے نہیں۔

ایک گھنٹہ بھر میں مچھلی کو دیکھتا رہا۔ میں سمجھا، میں نے مچھلی کو پورے طور پر دیکھ لیا ہے، اب میں امید لگا کر بیٹھ گیا کہ اوگاسز مجھ سے پوچھے گا۔

اوگاسز میرے قریب ہی تھا لیکن اس نے مجھ سے نہ پوچھا۔ ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے، پورا ایک ہفتہ گزر گیا لیکن اوگاسز نے میری طرف توجہ نہ دی۔ ویسے رسمی طور پر علیک سلیک کرتا رہا۔ کبھی کبھی کانی آنکھ سے مجھے دیکھ بھی لیتا۔ میں مجبوری میں مچھلی کو بار بار دیکھتا رہا اور یوں پورے طور پر اس سے واقف ہو گیا۔

آخر اوگاسز میرے پاس آیا اور پوچھا: ''بتا تو نے مچھلی میں کیا کیا دیکھا؟''

''میں نے ایک ایک کر کے ساری باتیں بتا دیں۔''

''وہ غور سے سنتا رہا۔ جب میں بتا چکا تو وہ بولا: ''اونہوں! ابھی مشاہدہ کچا ہے، پھر دیکھو۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے پھر سے مچھلی کو دیکھنا شروع کیا۔ اب کی بار مجھے نئی نئی باتیں نظر آنے لگیں، ایسی باتیں کہ میں خود حیران رہ گیا۔

''ایک ہفتے کے بعد جب میں نے اوگاسز کو سب کچھ بتا دیا تو اس نے مجھے شاباش نہ دی بلکہ کہا: ''ہاں اگر کوشش کرتے رہے تو دیکھنا سیکھ جاؤ گے۔''

ڈرو لوگو، ڈرو

پتا نہیں ہمارے علمائے دین کو یہ حسن کیوں نظر نہیں آتا؟ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات سے

محبت بھرا لگاؤ نظر نہیں آتا؟ وہ ہر وقت ہمیں اللہ کے غیظ و غضب سے ڈراتے رہتے ہیں، سرزنش سے ڈراتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے دلوں میں اللہ سے محبت یا اپنائیت کا جذبہ پیدا نہیں کرتے۔ صرف ڈر اور خوف۔ اللہ سے ڈرو، اس کی لاٹھی بے آواز ہے، اس کی رسی دراز ہے، اس کی سزا انتقامی ہے۔ ڈرو لوگو ڈرو۔ جان کنی کے عذاب سے ڈرو، قبر کے عذاب سے ڈرو، گرز بردار فرشتوں کے سوال و جواب سے ڈرو، قیامت کے عذاب سے ڈرو۔

ہمارے علمائے دین نے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی دہشت پھیلا رکھی ہے۔

دہشت کے اس جذبے کی وجہ سے آج تک کسی الیکشن میں کسی اسلام پارٹی کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

عورتیں ڈرتی ہیں کہ اگر اسلام نافذ ہو گیا تو انھیں لپ اسٹک لگانے کی اجازت نہ رہے گی۔ ننگے چہرے گھومنے پھرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ورکنگ وومن خوف زدہ ہیں کہ اگر اسلام نافذ ہو گیا تو ان کی نوکری چھوٹ جائے گی۔ نوجوان ڈرتے ہیں کہ اسلام نافذ ہو گیا تو جینز اور پرنٹڈ شرٹ پہننا ممنوع ہو جائے گا۔ جدید موسیقی کے دلدادہ نوجوان ڈرتے ہیں کہ ناچنا گانا منع ہو جائے گا۔ دکاندار ڈرتے ہیں کہ زیادہ منافع کمانا ممکن نہ رہے گا۔

کروسیڈی پروپیگنڈہ

کروسیڈز (صلیبی جنگیں) کے زمانے میں جب مسلمانوں نے حیرت انگیز فتوحات حاصل کی تھیں تو عیسائی پادریوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈا مہم چلائی کہ ایک مسلمان مجاہد دس عیسائی سپاہیوں پر بھاری ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ لوگ انسان نہیں درندے ہیں، ظالم ہیں، بے رحم ہیں، سفاک ہیں۔

مسلمانوں نے سپین پر سالہا سال حکومت کی تھی۔ مؤرخ مسلمانوں کی حکومت کو آئیڈیل دور قرار دیتے ہیں لیکن عیسائی پادریوں نے مسلمان حکمرانوں کے اس پہلو کو ہمیشہ بلیک آؤٹ رکھا اور مجاہدوں کی بے رحمی اور تشدد کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

عیسائی پادری اور راہب اسلام کے سخت مخالف تھے، اس لیے کہ عیسائیت نے

راہبوں اور پادریوں کو ایک متحرک مقام بخش رکھا تھا۔ یہ مقام اس قدر اہمیت کا حامل تھا کہ یہ بارہا عیسائی بادشاہوں سے ٹکر لینے سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔ اس کے برعکس اسلام رہبانیت کے حق میں نہیں تھا۔ اسلام نے رہبانیت کو ممنوع قرار دیا تھا اور دینی علماء اور مولویوں کو کوئی اعزازی مقام نہیں دیا تھا۔ ان کی حیثیت عام مسلمانوں جیسی تھی۔

عیسائی راہب اور پادریوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے بارے میں یہ مشہور کیا کہ وہ تنگ دل ہیں، وسعت قلب سے محروم ہیں، intolerant ہیں۔ عیسائی پادریوں نے تو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کر رکھا تھا۔ لیکن ہمارے مولوی اور ملا اپنے رویے سے غیروں کے پروپیگنڈے کو تقویت دے رہے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب امریکا اور مغربی ممالک ہمیں فنڈامینٹلسٹ کے طعنے دے رہے ہیں حالانکہ حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جتنی رواداری اسلام میں ہے، کسی اور مذہب میں نہیں۔ حکم ہے کہ غیر مسلموں کو اتنی ہی آزادی دی جائے جتنی مسلمانوں کو حاصل ہے۔ ان کے مذہب کا احترام کیا جائے۔ ان کی عبادت گاہوں کا احترام کیا جائے۔

کہتے ہیں جب حضرت عمرؓ فاتح کی حیثیت سے یروشلم میں داخل ہوئے اور نماز کا وقت آیا تو سوال پیدا ہوا کہ نماز کہاں ادا کی جائے۔ مسلمانوں نے عیسائیوں سے بات کی۔ عیسائیوں نے کہا: ”بے شک آپ ہمارے گرجے میں نماز ادا کر لیں۔“

حضرت عمرؓ نے گرجے میں نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: ”اگر میں نے ایسا کیا تو لوگ کہیں گے کہ مسلمانوں نے زبردستی عیسائیوں کی عبادت گاہ پر قبضہ کر لیا۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا احترام کریں۔“

سپین میں الحمرا کی دیواروں پر جگہ جگہ یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

”اللہ کے سوا کوئی غالب فاتح نہیں ہے۔“

مسلمانوں نے سپین پر حکومت کی تو یہی ان کا ماٹو رہا۔ قصہ یوں ہے کہ جب مسلمانوں نے ہسپانیہ کو فتح کر لیا اور غرناطہ کا مسلمان حکمران شہر میں داخل ہوا تو چاروں طرف سے

لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے ''الغالب'' کے خطاب سے نوازا۔ اس پر حکمران نے جواب دیا کہ میں فاتح یا غالب نہیں ہوں، صرف اللہ کی ذات فاتح اور غالب ہے۔

اسلامی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کیوں کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں رواداری نہیں؟ وہ intolerant ہیں۔

مجھے یاد ہے، پرانے زمانے کے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ اسلام تو ایک آسان سا، سادا سا طریقہ ہے۔ جیو اور جینے دو، سکھی رکھو اور سکھی رہو۔

پہلی بات یہ ہے کہ سچے دل سے مانو کہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ قادر مطلق ہے اور محمد ﷺ، اللہ کے آخری پیغمبر ہیں۔

بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ یہ تو ایوان اسلام میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق پورے کرو۔ لوگوں کی خدمت کرو، بانٹ کے کھاؤ، اپنی آمدنی میں ایک حصہ غریبوں کے لیے وقف کردو۔

ماہ رمضان کے روزے رکھو۔ دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے حضور سربسجود ہوا کرو اور اگر توفیق ہو تو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حاضری دو اور حج ادا کرو۔

میں نے ایک بزرگ سے پوچھا: ''جناب والا! اگر اسلام کے یہ پانچ رکن ہیں، پھر تو یہ واقعی بڑا سادہ اور آسان مذہب ہے۔''

''بالکل!'' وہ بولے۔

''سب سے اہم رکن کون سا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بولے: ''ہم تو یہ سمجھتے ہیں اسلام خدمت خلق سے شروع ہوتا ہے اور خدمت خلق پر ختم ہو جاتا ہے۔''

☆

یہ خُدا، وہ خُدا

لفظ اور مفہوم

سیانے کہتے ہیں لفظ خالی برتن ہوتے ہیں۔ ان میں مفہوم ہم ڈالتے ہیں۔ لفظ ایک ہوتا ہے، ہر شخص کا مفہوم مختلف ہوتا ہے۔ اپنے علم اور تجربے کے مطابق ہوتا ہے۔ شاعر کے ذہن میں دل کا مفہوم اور ہے، ایم بی بی ایس ڈاکٹر کے ذہن میں اور ہے۔ ماں کے لیے بچے کا مفہوم اور ہے، باپ کے لیے اور۔ سیاست دان کے لیے عوام کا مفہوم اور ہے، اخبار نویس کے لیے اور۔ اس سلسلے میں تاریخ میں ایک دلچسپ واقعہ مرقوم ہے:

پرانے زمانے کی بات ہے جب ایشیا میں بدھ ازم کے باقیات موجود تھے۔ برما کی سرحد پر بودھوں کا ایک گاؤں آباد تھا۔ انگریزوں نے سوچا کیوں نا اس گاؤں پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ انگریزوں نے گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔ گاؤں والے بڑے حیران ہوئے کہ یہ لوگ گاؤں سے باہر کیوں رک گئے ہیں، اندر کیوں نہیں آتے؟

گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے دو آدمی باہر بھیجے کہ ان سے بات کریں۔ وہ کمانڈر سے ملے۔ کہنے لگے، حضور! ہم آپ کی کیا خدمت کرسکتے ہیں؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟

کمانڈر نے کہا:

''ہم گاؤں پر قبضہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔

''قبضے کا کیا مطلب ہے؟'' بودھوں نے پوچھا۔

کمانڈر بولا: ''ہم یہ گاؤں لے لینا چاہتے ہیں۔''

بودھوں ے کہا: ''اچھا یہ بات ہے۔ تو ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے بڑے بوڑھوں سے بات کرلیں، پھر آپ کو اطلاع دیں گے۔''

کچھ دیر کے بعد وہ واپس آئے، کہنے لگے: ''عالی جاہ! اب تو دیر ہو چکی ہے، کل صبح آپ بے شک گاؤں پر قبضہ کر لیجیے گا۔''

اگلے روز فوجیوں نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ سر پر گٹھڑیاں اٹھائے گاؤں سے باہر نکل رہے تھے۔

جب گاؤں کے سب لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے گاؤں سے باہر نکل آئے تو آخری آدمی نے کمانڈر سے کہا: ''جناب عالی اب آپ بے شک گاؤں پر قبضہ کرلیں۔''

دراصل بودھوں کے دلوں میں قبضے اور لڑائی بھڑائی کا تصور نہ تھا۔ ان کے ذہنوں میں یہ الفاظ مفہوم سے خالی تھے۔ علم نباتات کو جاننے والے کے ذہن میں بوٹے کا مطلب ایک سرسبز خوشنما جھاڑی ہی نہیں ہوتا، ساتھ ہی ایک حیران کن تخلیقی نظام بھی ہوتا ہے۔

یہ خدا، وہ خدا

میں نے بچپن میں محلے کے بڑے بوڑھوں کی باتوں سے اللہ کا جو مفہوم اخذ کیا تھا، اس کی تصویر کچھ اس طرح بنتی تھی کہ ایک فصیل، زود رنج، دیو قامت، بہت بڑا الاؤ جلائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں لاٹھی، ماتھے پر تیوری ہے۔ انتظار کر رہا ہے کہ کب کوئی بندہ فوت ہو کر آئے تو اسے گردن سے دبوچ کر آگ میں جھونک دے۔

میری کوئی خاص بات نہ تھی۔ عام مسلمانوں کے گھرانوں میں جو بچے پرورش پاتے ہیں، اللہ کے متعلق ان کے ذہنون میں ایسی ہی تصویر ہوتی ہے جو نفس لاشعور میں بیٹھ جاتی ہے اور دیر تک جوں کی توں قائم رہتی ہے۔

میرے ذہن میں بھی اللہ کا یہ تخیل دیر تک قائم رہا۔

پھر اتفاق سے سر جیمس جینز کی مشہور عالم کتاب The Mysterious Universe میرے ہاتھ لگ گئی۔ اسے پڑھ کر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔ ارے اتنی وسیع، اتنی منظم، اتنی

عظیم کائنات، اسے تخلیق کرنے والا کیا ہوگا۔ میرے نفس غیر شاعر میں الاؤ جلائے بیٹھا ہوا پہلوان نما اللہ شرم سے پانی پانی ہو کر بہہ گیا۔ ایک عظیم خالق ابھرا۔ میں حیرت سے بت بنا اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔

پھر میں نے جانا کہ جو شخص کائنات کی حیران کن وسعتوں کو نہیں جانتا، وہ اللہ کی عظمت اور ہیبت کو نہیں سمجھ سکتا۔ دینی مدرسے کا پڑھا ہوا مسجد کا مؤذن جو دن میں بار بار اللہ اکبر کی آواز لگاتا ہے، وہ اللہ اکبر کے مفہوم سے واقف نہیں ہے۔

کائنات کی حیران کن منصوبہ بندی اور کائنات کے خالق کی عظمت اور حکمت کو سمجھنے کے لیے فزیکل علوم کا جاننا لازم ہے۔

کنویں کے مینڈک

ایک کنویں میں ایک مینڈک رہا کرتا تھا۔ وہ کنواں اس کی کائنات تھا جس پر وہ حکمران تھا اور ہمہ وقت خوشی سے ٹراتا رہتا تھا۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ سیلاب آیا اور سمندر کا ایک مینڈک کنویں میں آ گرا۔ کنویں کا مینڈک اسے دیکھ کر حیران ہوا۔

بولا: ''ابے تو کہاں سے آیا ہے؟''

سمندر کے مینڈک نے کہا: ''میں سمندر سے آیا ہوں۔''

''سمندر کیا ہوتا ہے؟'' کنویں کے مینڈک نے پوچھا۔

''سمندر بہت بڑا ہوتا ہے۔'' سمندری مینڈک نے جواب دیا۔

کنویں کے مینڈک نے اپنے آپ میں پھونک بھری۔ بولا: ''کیا سمندر اتنا بڑا ہوتا ہے؟''

''اس سے بہت بڑا۔'' سمندری مینڈک نے کہا۔

کنویں کے مینڈک نے خود کو اور پھلایا۔ ''کیا اتنا بڑا؟''

خود میں پھونک بھرتے بھرتے دفعتاً ایک دھماکہ ہوا اور کنویں کے مینڈک کے چیتھڑے اڑ گئے۔ صاحبو! ہم سب جو کائنات اور اس سے متعلقہ فزیکل علوم سے واقفیت

نہیں، کنویں کے مینڈک ہیں۔ دراصل ساری کنفیوژن لفظ علم کی پیدا کردہ ہے۔

ہمارے عالمِ دین سمجھتے ہیں کہ علم سے مراد علم دین ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر چین بھی جانا پڑے تو ضرور جاؤ۔ ان کا مطلب کائنات سے متعلقہ فزیکل علوم تھا، دینی علم نہیں۔ چونکہ دینی علوم کا مرکز تو مدینہ تھا، دینی علوم حاصل کرنے کے لیے باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

قرآن میں بھی جگہ جگہ علم اور عالم کی فضیلت کا ذکر آیا ہے۔ وہاں بھی علم کا مفہوم کائناتی اور فزیکل علوم ہیں۔

جب تک آپ اللہ کی تخلیقات کا علم حاصل نہیں کرتے تب تک آپ اللہ کی عظمت، اللہ کی کائنات کی وسعت، اس کے نظم اور منصوبہ بندی کی عظمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ تب تک آپ قرآن کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے۔ قرآن کی عظمت کو نہیں سمجھ سکتے۔

دنیاوی علوم حاصل کیے بغیر دینی علم یوں ہے جیسے بن پہیوں کے گاڑی ہو۔

صاحبو! ہمارے دینی مدرسے جو ہیں، وہ کنویں کے مینڈک پیدا کر سکتے ہیں اور دھڑا دھڑ کر رہے ہیں۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ ہر قصبے میں، ہر شہر میں جگہ جگہ دینی مدارس قائم کیے جا رہے ہیں اور اس خوش فہمی میں کہ ہم اسلام کی خدمت کر رہے ہیں، ہم ان دینی مدارس کے قیام کے لیے دھڑا دھڑ چندے دیتے ہیں۔

فنڈا منٹلسٹ

ان کنوؤں کے مینڈکوں کی وجہ سے اسلام بدنام ہو رہا ہے۔ اہل مغرب ہمیں Fundamentalist ہونے کے طعنے دے رہے ہیں۔

صاحبو! اہل مغرب کتنے بے خبر ہیں، فنڈا منٹلسٹ تو میں ہوں، ہم ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں کو اہمیت دیتے ہیں، وہ نہیں جو فروعات سے چمٹے ہوئے ہیں۔

اہل مغرب مسلمانوں کو دیکھ کر اناپ شناپ قسم کے اندازے لگاتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اسلام کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔

ایک روز محمد عمر، بھڑ کی طرح بھوں بھوں کرتا آ گیا۔

بولا: مفتی! یہ تم کیا بکواس لکھ رہے ہو؟ بند کرواسے!''

محمد عمر میرا دوست ہے۔ صرف دوست ہی نہیں، وہ ہمارا لیڈر بھی ہے۔ ہماری تنظیم ''چھڈ یار'' کا لیڈر ہے۔ محمد عمر لیڈر کی شخصیت کی جاذبیت کو جاننا چاہتے ہیں آپ تو اشفاق احمد کی تصنیف سفر در سفر پڑھیے جو ''چھڈ یار'' تنظیم کے ایک سفر کا احوال ہے۔ بھڑ کی طرح بھوں بھوں کرنا محمد عمر کی شناخت ہے۔ اس بھڑ میں خالی بھوں بھوں ہے، ڈنگ نہیں۔ اس کا غصہ ٹی وی کی شہرت کی طرح بھڑ بھڑ جلتا ہے اور پھر راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ جب محمد عمر کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو ہم سب اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اس سے چہلیں کرتے ہیں اور وہ مسکراتا رہتا ہے۔ محمد عمر برائے نام لیڈر ہے۔ خود کو لیڈر کہلوانے کا شوق ہے۔ ویسے عملی طور پر وہ ہر وقت اپنے ساتھیوں کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔

اسے ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ لیڈر کا کام خدمت کرنا نہیں بلکہ حکومت کرنا ہے۔

ہاں تو اس روز وہ بھوں بھوں کرتا ہوا آیا، بولا: بند کروا اپنی بکواس کو۔''

''کس بکواس کو؟'' میں نے پوچھا۔

بولا: ''تم جو کہتے ہو کہ امریکا میں ایک ولیوں کا شہر ہے۔''

''ہاں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ دن رات، صبح شام تحقیق میں لگے رہتے ہیں، نہ کھانے کا ہوش، نہ پہننے کا، تحقیق کے کام میں خود کو بھلائے بیٹھے ہیں۔''

وہ غصے میں چلایا۔ ''یہ سائنس دان جو ہیں، سب ملحد ہیں۔ نہ خدا کو مانتے ہیں نہ مذہب کو۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا: ''یہ نہیں ہوسکتا، میں نہیں مانتا۔''

''کیا نہیں ہوسکتا؟'' وہ چلایا۔

''جس نے اللہ کی کائنات کی ایک جھلک دیکھ لی، وہ ملحد نہیں ہوسکتا۔ جس کے دل میں

کائنات کی عظمت کا نقش بیٹھ جائے، وہ اللہ کی عظمت، اس کا لاشریک اور قادر مطلق ہونا میری نسبت بہتر طور پر سمجھتا ہے۔''

سر جیمس جینز

اگر سر جیمس جینز کی تصنیف ایک عام قاری پر اس قدر اثر رکھتی ہے تو سر جیمس جینز کے مشاہدات نے خود ان پر کتنا اثر کیا ہوگا؟

سر جیمس جینز اور خوف خدا کیے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے۔ یہ واقعہ عنایت اللہ خاں مشرقی نے بیان کیا ہے جسے میں نے عزیز احمد کی قابل قدر تصنیف ''اللہ کی عظمت'' سے اخذ کیا ہے۔

1909ء کا ذکر ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ علامہ مشرقی کسی کام کے لیے باہر نکلے تو دیکھا کہ مشہور ماہر فلکیات سر جیمس جینز چرچ کی طرف جا رہے ہیں۔

علامہ مشرقی یہ دیکھ کر حیران ہوئے کیونکہ عام طور پر سائنس دان مذہبی رسومات کے قائل نہیں ہوتے۔

علامہ مشرقی نے بڑھ کر سر جیمس جینز کو مؤدبانہ سلام کیا۔ سر جیمس جینز نے ان کے سلام کا نوٹس نہ لیا اور چلتے رہے۔ مشرقی نے ان کا پیچھا کیا اور دوبارہ سلام کیا۔ سر جیمس جینز رک گئے۔ حیرت سے پوچھا: ''بولو کیا چاہتے ہو؟''

اہل مغرب بے مقصد ادب و احترام بھرے سلام سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سلام کرنے والے کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے سر جیمس نے کہا: ''بولو، کیا چاہتے ہو؟''

مشرقی نے کہا: ''دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

سر جیمس بولے۔ ''ہاں ہاں کہیے!''

مشرقی نے کہا: ''پہلی بات یہ ہے کہ بوندا باندی ہو رہی ہے لیکن آپ نے چھاتا بغل میں رکھا ہے، اسے کھولا نہیں۔''

سر جیمس اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا کھول لیا۔

مشرقی نے کہا: ''دوسری بات یہ ہے کہ آپ چرچ کی طرف عبادت کے لیے جا رہے ہیں؟''

مشرقی کے اس سوال پر سر جیمس لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے، پھر بولے: آپ آج شام کو چائے میرے ساتھ پئیں، بیٹھ کر چائے پر بات کریں گے۔''

مشرقی شام کو سر جیمس کے گھر پہنچے۔ سر جیمس انتظار کر رہے تھے۔ تپائی پر چائے لگی ہوئی تھی۔

سر جیمس نے اجرام فلکی کے حیرت انگیز نظام کی بات شروع کی۔ ان کے لامتناہی فاصلے، پہنائیاں، پیچیدہ مدار کی تفصیلات بیان کرنے لگے۔ ان کی باتیں سن کر مشرقی کا دل اللہ کی کبریائی اور جبروت پر دہلنے لگا۔ خود سر جیمس کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے بال کھڑے تھے، آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں، ہاتھ کانپ رہے تھے، آواز لرز رہی تھی۔ بولے: ''عنایت اللہ خان! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میرا رواں رواں اللہ کے جلال سے لرزنے لگتا ہے۔ جب گرجے میں جا کر کہتا ہوں، اللہ! تو عظیم ہے تو میرے جسم کا رواں رواں اس کی شہادت دیتا ہے۔ مجھے عبادت میں دوسروں کی نسبت ہزار گنا زیادہ کیف حاصل ہوتا ہے۔''

علامہ مشرقی نے کہا: عالی جاہ! ''اس بات پر مجھے قرآن حکیم کی ایک آیت یاد آ گئی ہے۔ اجازت ہو تو اس کا مطلب بیان کروں؟''

''ضرور ضرور''۔ سر جیمس بولے۔

مشرقی نے عربی میں آیت پڑھی، کہنے لگے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں۔''

''کیا واقعی؟'' سر جیمس حیرت سے چلائے۔ ''یہ وہ حقیقت ہے جسے میں نے سالہا سال کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد جانا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس عظیم حقیقت کا علم کیسے ہوا؟! اگر یہ آیت قرآن میں موجود ہے تو بے شک قرآن الہامی کتاب ہے۔''

دو ایمان

قرآن پر میرا ایمان دل کا ایمان ہے کیونکہ میں قرآن کی ایک ایک بات کو بن جانے مانتا ہوں۔ اس میں ذہنی ایمان شامل نہیں ہے۔ وہ لوگ جو کائنات کے متعلقہ علوم سے واقف ہیں، ان کا ایمان دو آتشہ ہوتا ہے جسے حق الیقین کہتے ہیں کیونکہ اس میں ذہن بھی شامل ہوتا ہے۔

اگرچہ قرآن کے ایک ایک لفظ پر یقین رکھتا ہوں لیکن یہ یقین خام ہے۔ چونکہ میں قرآن کی بہت سی باتوں کو سمجھ نہیں سکتا، یہ میرے علم کی خامی ہے۔ مثلاً قرآن میں جو بہشت اور دوزخ کی تصاویر کھینچی گئیں، انھیں مَیں سمجھ نہیں پاتا۔ میں پانچ حواس کا قیدی ہوں، اس لیے میری سمجھ محدود ہے۔

مثال کے طور پر میں یہ بات نہیں سمجھ سکتا کہ جہاں دکھ نہیں، وہاں سکھ کیسے ہو سکتا ہے؟ جہاں اندھیرا نہیں، وہاں روشنی کیسے ہو سکتی ہے؟ جہاں درد نہیں، وہاں سکون کیسے ہو سکتا ہے؟ میری دانست میں دکھ اور سکھ دو نہیں، ایک چیز ہیں۔ میں کسی ایسے مقام کا تصور نہیں کر سکتا جہاں سکھ ہی سکھ ہو۔ کسی ایسی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا جو ابدی ہو۔

اپنی اپنی آگ

دوزخ کے متعلق تذکرہ غوثیہ کی ایک کہانی مجھے اپیل کرتی ہے۔

پہاڑ کی کھوہ میں ایک فقیر رہتا تھا جو دن رات عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بالکا بھی تھا۔ فقیر حقہ پینے کا شوقین تھا، اس لیے اس نے اپنے بالکے کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر وقت آگ کا انتظام رکھے۔

ایک روز آدھی رات کے وقت فقیر نے بالکے کو حکم دیا کہ چلم بھر دے۔ بالکے نے دیکھا کہ بارش کی وجہ سے آگ بجھ چکی تھی۔ اتفاق سے ماچس بھی ختم ہو چکی تھی۔

بالکا گھبرا گیا کہ اب کیا کرے۔ اس نے فقیر سے کہا: ''عالی جاہ! آگ تو بجھ چکی ہے، ماچس ہے نہیں کہ سلگا لوں۔ فرمایئے اب کیا کروں۔''

فقیر جلال میں بولا: ''ہم تو چلم پئیں گے چاہے آگ جہنم سے لاؤ۔''

بالکا چل پڑا۔ چلتے چلتے جہنم جا پہنچا۔ دیکھا کہ جہنم کے صدر دروازے پر ایک چوکیدار بیٹھا اونگھ رہا ہے۔

بالکے نے اسے جھنجھوڑا۔ پوچھا: ''کیا یہ جہنم کا دروازہ ہے؟''

چوکیدار بولا: ''ہاں، یہ جہنم کا دروازہ ہے۔''

بالکے نے کہا: ''لیکن یہاں آگ تو دکھائی نہیں دیتی؟''

چوکیدار نے کہا: ''ہر جہنمی اپنی آگ اپنے ساتھ لاتا ہے۔''

جہنم کی یہ Conception تو سمجھ میں آتی ہے۔

یہ دنیا، وہ دنیا

میری بات چھوڑیئے میں تو ایک ادھ پڑھ شخص ہوں۔ پڑھے لکھے دانشور سائنس دان جنھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے، وہ بھی قرآن کے کئی ایک نکات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ابھی ہمارا علم، ہماری تحقیق خام ہے، اس لیے ہم قرآن کے گہرے اشارات کو نہیں سمجھ سکتے۔

آج کے سائنسدان اور محقق قرآن کی ایک اور خصوصیت کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

عام طور پر مذہبی کتابیں اس دنیا اور زندگی کو اہمیت نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں اس دنیا سے منہ موڑ لو۔ یہ دنیا ایک بصری دھوکا ہے۔ Illusion ہے۔ دیکھنا چاہتے ہو تو آنکھیں موند لو۔ یہ زندگی فانی ہے، اسے حقیقت نہ سمجھو۔ اس کے برعکس قرآن اس دنیا اور زندگی کو اہمیت دیتا ہے۔

قرآن بار بار ہماری توجہ کائنات کی طرف مبذول کرتا ہے۔ بار بار کہتا ہے:

''تم دیکھو تو ہم نے زمین کو کیسے بنایا ہے۔ آسمان کو کیسے سجایا ہے۔
دیکھو تو ہم نے زمین سے بوٹے کیسے اگائے ہیں۔ تم دیکھو تو سہی۔

پھران چیزوں پرغور کرو۔''

ایک جگہ قرآن کہتا ہے:

''یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

''ان کے پاس دل ہیں مگر وہ سوچتے نہیں۔

''ان کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں۔

''وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔''

دوسرے مذاہب کی طرح قرآن یہ نہیں کہتا کہ اس دنیا سے دل نہ لگاؤ۔ اس دنیا کو تیاگ کر پہاڑ کی کسی کھوہ پر بیٹھ کر خدا کے نام کا جاپ کرو۔

قرآن دنیا سے علیحدگی کا سبق نہیں دیتا۔ الٹا اس دنیا اور زندگی کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے کہ یہی وہ بوٹا ہے جس پر آخرت میں بہشت یا دوزخ کا پھل لگے گا۔

دانش ور اور سائنس دان کہتے ہیں کہ قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ دین اور دنیا میں ہم آہنگی پیدا کرو۔ توازن پیدا کرو...... Adjustment پیدا کرو۔ لوگوں سے اچھے تعلقات پیدا کرو۔ اللہ سے بھی اچھے تعلقات قائم رکھو۔ سکھی رہو، سکھی رکھو۔ دوسروں کو اذیت دو نہ خود کو اذیت دو۔ اسلام دین اور دنیا میں توازن پیدا کرتا ہے۔

دادی اماں

پرانے زمانے کی بات ہے جب میں بچہ تھا۔ ان دنوں دادی اماں نوے بیانوے کی ہوں گی۔ وہ بیشتر وقت اپنے کمرے میں ایک تخت پر بیٹھی رہتی تھیں۔ یہ تخت ایک کھڑکی کے پاس تھا جس پر جائے نماز بچھی ہوتی تھی۔ اس تخت کے دائیں ہاتھ کھڑکی تھی، بائیں ہاتھ ایک بہت بڑا لکڑی کا صندوق تھا جس پر ڈھکنا نہیں تھا۔ اس صندوق میں الم غلم چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

دادی اماں بیٹھ کر نماز پڑھا کرتی تھیں۔

جب وہ نماز پڑھ رہی ہوتیں تو میں اکثر اپنے کمرے میں داخل ہو کر چلاتا: ''دادی اماں! میرا گیند کہاں ہے؟'' میں نے کبھی نہیں سوچا کہ دادی اماں نماز پڑھ رہی ہیں۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو جائیں تو گیند کی بات کروں۔

''دادی اماں! میرا گیند، دادی اماں! میرا گیند۔''

سجدے میں جانے سے پہلے دادی اماں کانی آنکھ سے صندوق کی طرف دیکھتیں جہاں گیند رکھا ہوتا۔ پھر وہ جب سجدے میں جاتیں تو بایاں ہاتھ صندوق میں ڈال کر گیند اٹھا لیتیں اور پھر سجدے سے اٹھ کر وہ گیند میری طرف پھینک دیتیں۔

صرف میرے گیند کی بات نہ تھی۔

جب دادی اماں نماز پڑھ رہی ہوتیں تو باہر صحن سے کوئی خاتون چولہے کے سامنے بیٹھے ہوئے چلاتی، ''اب میں چاولوں کو دم دے دوں؟'' دادی اماں نماز پڑھتے ہوئے زور سے کہتیں: ''اوں ہوں'' اور نماز جاری رکھتیں۔

محلے کی بڑی بوڑھیاں دادی اماں کی اس عادت پر ہنسا کرتی تھیں۔ دادی اماں سے مخاطب ہو کر کہتیں ''نواب بی بی تو یہ کیا کرتی ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے یکسوئی کا خیال نہیں رکھتی۔'' اس پر دادی اماں ہاتھ چلا کر کہتیں: ''اے ہے! صرف اس کی نماز ہی تو ضروری نہیں، اور کام بھی ضروری ہوتے ہیں۔ یہ لڑکا گیند کے لیے روتا رہے اور میں نماز پڑھتی رہوں۔ ایسی نماز کس کام کی۔ اسے نہیں پتا کہ دنیاوی کام بھی ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں دین اور دنیا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ خالی نماز کا چھنکنا چھنکاتے رہو۔''

ان دنوں محلے والیاں سب دادی اماں کی باتوں پر ہنسا کرتی تھیں۔ کہتی تھیں: ''نواب بی بی سٹھیا گئی ہے۔'' اب جو میں سوچتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ دادی اماں نے دین اور دنیا میں کتنا سادہ، قابل عمل اور خوشگوار توازن قائم کر رکھا تھا۔

فقیر چند

پرانے زمانے کی بات ہے جب میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں پڑھتا تھا۔ وہاں

میرا ایک یار تھا فقیر چند۔ سبحان اللہ! کیا باغ و بہار آدمی تھا۔ آج 62 سال ہو چکے ہیں لیکن فقیر چند کی شخصیت کی خوشبو آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

میں کہتا: فقیر چند! "You are a loveable man" جواب میں وہ چلاتا: ''یار مفتی! مجھ ہی سے کہتا رہتا ہے، تو کبھی اسے بھی جا کر بتا کہ میں ''لووے بل'' ہوں۔ خاک ''لووے بل'' ہوں۔ دھرم سے دو گھنٹے دم ہلاتا رہتا ہوں، پھر کہیں وہ ایک میٹھی نظر ڈالتی ہے اور تو کہتا ہے ''لووے بل'' ہوں۔''

اس زمانے میں سنٹرل ٹریننگ کالج میں نئی نئی کوایجوکیشن (مخلوط تعلیم) شروع ہوئی تھی۔ ہمارے ساتھ چھ خواتین ٹریننگ حاصل کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون کو فقیر چند نے اپنا رکھا تھا۔

وہ روز اپنے رومان کی انوکھی خبر لایا کرتا تھا۔ مثلاً وہ کہتا: ''یار مفتی! سارا دن محنت مزدوری کی، تعریفیں کیں، حسن و عشق کے جتنے شعر مجھے آتے تھے، سنا دیئے۔ دیوی کو منانے کے لیے آرتی چڑھائی، سیس نوایا، ماتھا ٹیکا اور پتا ہے کہ دن بھر کی محنت مزدوری کا کیا انعام ملا! سالی نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ بولی: You may kiss it۔ ہے بھگوان تیری اس دنیا میں اتنا انیائے۔ یار ہمارے بھگوان سے تو تمھارا اللہ ہی بہتر ہے جو کہتا ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کی مزدوری ادا کر دی جائے۔''

میں کہتا: ''یار فقیر چند! یہ تو نے کیسی محبوبہ بنائی ہے۔ منہ نہ متھا۔''

وہ جواب دیتا: ''ہائے مفتی! تو نے اسے نہیں دیکھا۔ بھگوان کی قسم! دودھ کی نہریں چل رہی ہیں وہاں۔''

پارٹی سپرٹ

ایک دن وہ میرے پاس آیا۔ بڑا سنجیدہ تھا۔ بولا: ''مفتی! وہ جو میں نے تمھارا دھرم اپنا لینے کا فیصلہ کیا تھا نا، آج وہ توڑ دیا میں نے۔''

''کیوں، کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا: ''تمھارے دھرم کا بھید کھل گیا۔''

میں نے کہا: ''کیسے؟''

بولا: ''مولوی صاحب کا وعظ سن کر آیا ہوں۔''

''کیا کہا اس نے؟''

''سب گڑبڑ ہے۔ تمھارا اللہ جو ہے، وہ تم سے تو کہتا ہے کہ مسلمان بنو لیکن خود ساری دنیا کا رب بنا بیٹھا ہے۔ یہ کوئی طریقہ ہے بھگوان بننے کا؟''

''کیوں، اس میں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابے تو بھی احمق نکلا۔ اتنی سے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تجھے۔ تیرے اللہ میں پارٹی سپرٹ نہیں ہے۔ بھئی اگر تو نے ایک پارٹی بنائی ہے مسلمانوں کی تو مسلمانوں کے بھگوان بنو، مسلمان کی طرف داری کرو، ان کی مدد کرو، دوسروں کی ایسی کی تیسی پھیرو اور جو تو نے سارے عالم کی رکشا کرنی ہے تو پھر پارٹی کیوں بناتے ہو؟''

ان دنوں فقیر چند کی یہ بات میرے دل لگتی تھی۔ صاحبو! ایمان داری کی بات ہے۔ اگر سچے دل سے دیکھو تو فقیر چند کی بات آپ کے دل کو بھی لگے گی۔

مثبت تعصب

میں سوچا کرتا تھا کہ تعصب منفی بھی ہوتے ہیں، مثبت بھی ہوتے ہیں۔ چلو منفی تعصب برے سہی، مانے لیتا ہوں لیکن مثبت تعصب کے بغیر تو گزارہ ہی ممکن نہیں۔ اپنے دین کے حق میں تعصب ہوتا ہے۔ اپنے ملک کے حق میں تعصب ہوتا ہے، چاہے وہ ملک ہمارے ملک جیسا ڈانواں ڈول ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اپنی قوم کے حق میں تعصب ہوتا ہے۔ برادری کے حق میں ہوتا ہے۔ اپنے خاندان کے حق میں ہوتا ہے۔ ماں باپ کے حق میں ہوتا ہے۔ یہ تو تقاضا بشریت ہے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ اللہ کو بھی یقیناً احساس ہوگا کہ اپنوں کی طرف داری کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر وہ اتنی بے نیازی کیوں روا رکھتا ہے۔ کہتا ہے مجھ پر ایمان لاؤ۔ لوگوں کے

ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اگر تم نے میرے احکامات پر عمل نہ کیا تو سزا ملے گی۔ خبردار! اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ چونکہ تم مسلمان ہو، اس لیے میں تمھاری طرف داری کروں گا۔ لو کر لو بات! خود تو سارے عالم کا رب ہے اور ہم سے کہتا ہے کہ مسلمان بنو۔ اس میں تمھارا اپنا فائدہ ہے...... خاک فائدہ ہے جو تو نے ہماری طرف داری نہ کی، اپنوں کو اپنا نہ جانا۔

صاحبو! ساری جوانی میں نے اللہ کو جج کرنے میں گزار دی۔ اسے کٹہرے میں کھڑا کر لیتا تھا۔ خود کرسیٔ عدالت پر بیٹھ جاتا اور پھر جرح کرتا رہتا، کرتا رہتا، کرتا رہتا...... اور وہ مسکراتا رہتا تھا۔

دوستو! مجھ پر الزام نہ دھرو، صرف میں ہی نہیں۔ ہمارے نوجوان اسی شغل میں مبتلا رہتے ہیں۔ اسے کٹہرے میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ خود کرسیٔ عدالت پر بیٹھ جاتے ہیں اور جرح کرتے رہتے ہیں، کرتے رہتے ہیں۔

صاحبو! لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں۔

شکایات ہی شکایات

جو بھی آتا ہے، اللہ کی شکایت کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گلے شکوے۔ کوئی کھل کر شکایت کا اظہار کرتا ہے۔ کوئی دبے دبے الفاظ میں، کوئی صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ کوئی کہے بغیر جتا دیتا ہے، کوئی ''شکر'' ہے کے پردے میں اپنی شکایت کو چھپا دیتا ہے جیسے کہ شاعر نے کہا ہے:

جب کھینچ کے آہ سرد
کہتا ہے کوئی بندہ
جس حال میں بھی رکھے
صد شکر ہے اللہ کا
میں سوچنے لگتا ہوں
یہ شکر کیا اس نے

یا طعنہ دیا اس نے
رزاق دو عالم کو

سبھی اس پر گلے کرتے ہیں، شکایات کرتے ہیں، اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ سب کی سنتا ہے اور مسکراتا رہتا ہے۔ ہماری ناشکرگزاریوں پر اسے کبھی غصہ نہیں آتا۔ اس کا دل ہماری جانب سے کبھی میلا نہیں ہوا۔

ہماری گلی میں ایک فقیر آتا ہے۔ وہ صدا دیتا ہے۔ ہر چند منٹ کے بعد اس کی صدا ساری گلی میں گونجتی ہے:

مری بار کیوں دیر اتنی کری

اس کی صدا سن کر مجھے غصہ آیا ہے۔ میرے اندر کی بھٹیارن چڑ چڑ دانے بھونتی ہے۔

ایک روز میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے دوڑ کر فقیر کو پکڑ لیا۔

''یہ تو کیا کر رہا ہے بابے؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''صدا دے رہا ہوں بابو جی!'' وہ بولا۔

''کیا مطلب ہے تیرا اس صدا سے؟'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''میں منگتا ہوں، مانگ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''کیا ایسے مانگا کرتے ہیں۔ احمق! پہلے مانگنا سیکھ۔ جو مانگنا ہے منت کر کے مانگ، ترلے کر، بیس نوا، دینے والے کا ادب کر، احترام کر، تو تو اس کے خلاف شکایت کر رہا ہے۔ اسے طعنے دے رہا ہے۔ ''مری بار کیوں دیر اتنی کری''۔ بے وقوف! دینے والے کی مرضی ہے، چاہے جلدی دے چاہے دیر سے دے، چاہے کم دے، چاہے زیادہ دے۔ چاہے دے چاہے نہ دے۔''

فقیر بولا: ''جا بابو جا، اپنا کام کر۔ ہمارے معاملے میں دخل نہ دے۔ مانگنے والا جانے اور دینے والا جانے، تو ماما لگتا ہے۔ میں نے ساری زندگی یہی صدا دی ہے۔ اس نے کبھی نہیں ٹوکا مجھے، کبھی غصہ نہیں کیا۔ الٹا وہ مجھے دیتا رہا ہے، دیتا رہا ہے۔''

تلخی ہی تلخی

پھر وہ لڑکی ہے جو بلا ناغہ ہفتہ وار میرے پاس آتی ہے۔ بڑی دور سے آتی ہے وہ۔ صبح منہ اندھیرے گھر سے چلتی ہے۔ ڈھائی گھنٹوں کے بعد میرے پاس پہنچتی ہے۔ آ کر چپ چاپ بیٹھ رہتی ہے۔ نہ بات اور نہ چیت۔ وہ بڑی خوبصورت ہے۔ میں اسے گجری کہہ کر بلاتا ہوں۔ عجیب لڑکی ہے وہ۔ اوپر حسن ہی حسن، اندر تلخی ہی تلخی۔ اتنی تلخی ہے کہ جب وہ بات کرتی ہے تو اس کا Supressed anger ہونٹوں سے جھانکتا ہے۔ پھر اس کے سارے حسن پر پانی پھر جاتا ہے۔ وہ اللہ کے خلاف غم وغصہ سے بھری ہوئی ہے۔ میں اس سے پوچھتا ہوں، بی بی! تجھ میں اتنی تلخی کیوں ہے؟ وہ غیظ وغضب سے میری طرف دیکھتی ہے: یہ کیا میرا قصور ہے کہ مجھ میں تلخی ہے، غصہ ہے۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔

''بھانبھڑ!'' اور پتا ہے کیوں! یہ بھانبھڑ مجھے ورثے میں ملا ہے۔ ابا نے مجھے یہ تحفہ دیا ہے۔ میرا غصہ ابا کے غصے کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ میرے ابا جب بولتے ہیں تو گھر میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ سارا گھر سہم جاتا ہے۔ کچن کے برتن بجنے لگتے ہیں۔ اتنا غصہ ہے میرے ابا میں اور انھوں نے اپنا غصہ مجھے دے دیا ہے ورثے میں۔

''اس میں اللہ کا کیا قصور ہے؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''اور کس کا ہے؟'' وہ چلاتی ہے۔ ''اس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میری اور بہنیں بھی تو ہیں۔ سب ٹھنڈی میٹھی ہیں۔ ایک میں ہو کہ بھڑ بھڑ جلتی رہتی ہوں۔''

حسن کا فتور

''دیکھ تجھے اللہ نے حسن دیا ہے۔'' میں کہتا ہوں۔

غصے سے اس کا چہرا لال ہو جاتا ہے۔ ''مفتی جی! سارا قصور اسی حسن کا ہے۔ یہی میری بدقسمتی ہے۔ میرا میاں روز مجھے طعنے دیا کرتا تھا۔ کہتا تھا، تجھے اپنے حسن پر گھمنڈ ہے، میں تیرا یہ گھمنڈ توڑ دوں گا۔ تیرے منہ پر تیزاب چھڑک دوں گا۔ اسی وجہ سے اس نے مجھے

قید کر رکھا تھا۔ کھڑکی میں کھڑے ہونے نہیں دیتا تھا۔ گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتا تھا۔ اس نے میری اتنی ناقدری کی، اتنی بے عزتی کی کہ میں بھاگ کر اپنے گھر میں آ گئی۔ گھر والوں نے مجھے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ امی بیچاری تو مدت سے ایک لاش بنی ہوئی ہے، ابا گرجے برسے۔ میاں نے لکھ کر طلاق بھیج دی۔ میرا سہاگ صرف دو مہینے رہا۔ وہ سہاگ نہیں تھا، عذاب تھا۔ اللہ نے میرا نصیبا ایسے کیوں بنایا ہے؟ میں نے اس کا کیا قصور کیا تھا؟ اور اب تم مجھے دھتکار رہے ہوں۔ کہتے ہو تم میرے پاس کیوں آتی ہو؟ میں آ کر بیٹھ ہی رہتی ہوں نا، تمھارا کیا بگاڑتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں، یہاں آ کر مجھے سکون سا مل جاتا ہے۔''

دے، دے دینا سیکھ

پھر وہ نوجوان لڑکا ہے۔ کروڑ پتی کا بیٹا ہے، اکلوتا بیٹا۔ وہ آ کر اپنا رونا روتا رہتا ہے۔ کہتا ہے: ''اللہ نے ایک سبز پوش بوڑھا میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میری زندگی عذاب بنی ہوئی ہے۔ دو پاٹوں میں پس رہا ہوں۔ میرا گھر امارت سے بھرا ہوا ہے لیکن گھر میں سبھی لینے کی بات کرتے ہیں۔ یہ بھی لے لو، وہ بھی لے لو۔ کوئی دینے کی بات نہیں کرتا۔ میرے گھر میں دینے کی بات کرنا گناہ ہے۔ لیکن جب بھی میں سونے کے لیے آنکھ بند کرتا ہوں، تو وہ سبز پوش بڈھا آ جاتا ہے۔ کہتا ہے، پتر دے، دینا سیکھ۔ دینا بہت بڑا اپن ہے۔ اللہ کو دینا بہت پسند ہے۔ تیرے پاس دو روپے ہوں تو ایک کسی کو دے دے۔ دو کپڑے ہوں تو ایک کسی کو پہنا دے۔ پتر دولت بری نہیں۔ کما جتنی جی چاہے کما لیکن اس لیے کما کہ اسے دوجوں میں بانٹ سکے۔ بانٹتا جا، بانٹتا جا۔''

جو بھی آتا ہے، اللہ کے خلاف شکایت سے بھرا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں، یا اللہ! ایسا کیوں ہے؟ کوئی تیرا شکرگزار نہیں۔ جسے کم دیا ہے، وہ بھی شاکی ہے۔ جسے اتنا کچھ دے رکھا ہے، وہ بھی شاکی ہے۔

جواب میں وہ مسکرا دیتا ہے، مسکرائے جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں، یا اللہ! یہ کیا بھید ہے کہ قدرت کے تمام مناظر، دریا، پہاڑ، سمندر، وادیاں ...... تیری عظمت اور ہیبت سے لرز

رہے ہیں۔ تمام چرند پرند تیرے احکامات کے تابع ہیں۔ کسی میں ہمت نہیں کہ تیرے سامنے دم مار سکے لیکن تیری یہ مخلوق جسے انسان کہتے ہیں، تیری شکایت کرتی ہے۔ گستاخیاں کرتی ہے۔ حکم عدولیاں کرتی ہے اور تجھے غصہ نہیں آتا۔ تیرا دل میلا نہیں ہوتا۔ تو مسکراتا رہتا ہے۔ اے قادر مطلق! مجھے بتا یہ کیا بھید ہے؟ کیوں تو نے اسے سر چڑھا رکھا ہے؟

دوسروں کی باتیں چھوڑ، خود مجھے تجھ سے شکایت ہے۔ سوچتا ہوں کہ یا اللہ! تو مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہے؟ زندگی بھر تو مجھ پر کرم نوازیاں کرتا رہا ہے، کر رہا ہے...... کیوں؟ جب بھی میری زندگی میں مشکل کا وقت آتا ہے تو مجھے غیبی امداد مل جاتی ہے...... کیوں؟ تو مجھ پر کیوں اتنا مہربان ہے؟ حالانکہ مجھ میں کوئی وصف نہیں۔ میں جو ایک بے عمل شخص ہوں۔ خالص منہ زبانی! تیرے احکامات نہیں بجالاتا۔ تو نے کیوں مجھے سر چڑھا رکھا ہے۔ بول یہ کیا بھید ہے؟

انوکھا لاڈلا

اس وقت آدھی رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اکٹھے بیٹھے تھے۔ میں پوچھ رہا تھا، وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

دفعتاً فضا میں ایک آواز بلند ہوئی:

''انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے چاندرے...... انوکھا لاڈلا!

مجھے ایسے لگا جیسے میرے سوال کا جواب مل گیا ہو۔ میں نے اس کی جانب دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔

اس کی مسکراہٹ میں اثبات کی چمک تھی۔

پھر ڈاکٹر غلام مرتضیٰ میرے سامنے آ بیٹھا۔ بولا: ''حیران کیوں ہوتے ہو، یہ کوئی بھید تو نہیں۔ اس کا تو وہ خود اعلان کر چکا ہے۔ وہ اپنے لاڈلے کو لاڈ لڈا رہا ہے۔

''اس لاڈلے کو اللہ نے بڑی عزت دی ہے۔ اللہ نے اس لاڈلے میں اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ اللہ نے کائنات کو اس لاڈلے کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں......

ہم نے اسے کائنات کا اختیار بخش رکھا ہے۔''

میں حیرت سے غلام مرتضیٰ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اتنا اونچا مقام، اتنی بڑی بخشش!

آپ غلام مرتضیٰ کو تو جانتے ہوں گے۔ وہی جو ٹی وی پر آتے ہیں۔ چینی داڑھی، لمبا چہرا، سر پر ٹوپی، ٹھیٹھ مولوی۔ جب میں نے پہلی بار انھیں ٹی وی پر دیکھا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ تو یہ ٹی وی والے ایک اور مولوی کو ڈھونڈ لائے ہیں۔ ان پڑھ، پرائمری پاس، چہرے پر ذرا ذہانت نہیں۔ لوگ پہلے ہی ہمیں فنڈامنٹلسٹ کا طعنہ دیتے ہیں۔

پھر جب وہ بولنے لگا تو میں حیران رہ گیا۔ ارے یہ ہونٹوں سے تو نہیں بول رہا۔ یہ تو دل سے بول رہا ہے۔ اس کی بات میں ڈانٹ ڈپٹ نہیں، انداز میں مولویانہ کرختگی نہیں۔ اس کی آواز میں تو درد ہے۔ اللہ سے ڈراتا نہیں، اس سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔

پھر مجھے پتا چلا کہ وہ تو عالم ہے۔ فلسفے میں ایم اے، اسلامیات میں پی ایچ ڈی ہے۔ CPS بھی رہا ہے۔ استاد ہے۔ شملہ یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا ہے۔ میں تو حیران رہ گیا کہ اتنا کچھ ہو کر بھی وہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ نہ مولویانہ طمطراق اور نہ عالمانہ تفاخر۔

پھر طفیل صاحب آ گئے۔ بولے: ''تم قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟ قرآن پڑھو تو تمھیں پتا چلے کہ اللہ نے انسان کو کیا شرف عطا کر رکھا ہے۔ اللہ نے اسے اپنا نائب بنایا ہے۔ اسے اتنی طاقتیں بخشی ہیں کہ وہ کائنات کے مخفی بھیدوں کو جان سکے اور چھپی ہوئی قوتوں کو تسخیر کر کے اپنے استعمال میں لا سکے۔''

صاحبو! قرآن سے پہلے بڑے بڑے فلسفی انسان کے وجود کو مانتے ہی نہ تھے۔ وہ کہتے تھے، یہ دنیا، یہ زندگی ایک سراب ہے۔ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ یہ تو ایک خواب ہے جو خدا دیکھ رہا ہے۔

انسان کا شرف

جو کائنات کو مانتے تھے، وہ کہتے تھے، اس کی پیدائش تو ایک حادثہ ہے۔ آپ ہی آپ

وجود میں آ گئی ہے۔ اس کا کوئی مقصد ہے نہ منزل۔ جو کائنات کے وجود کو ہی بے معنی سمجھتے ہوں، ان کے نزدیک انسان کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔

قرآن نے لوگوں کو بتایا کہ کائنات ایک واحد خدا تخلیق کی ہے۔ اس کا ایک مقصد ہے، ایک منزل ہے۔ یہ زندگی خواب نہیں، حقیقت ہے..... بہت بڑی، بہت اہم حقیقت۔ یہ وہ بوٹا ہے جس پر دوزخ اور بہشت کا پھل لگے گا۔ انسان کو اللہ نے بڑا اشرف عطا کر رکھا ہے۔ وہ فانی نہیں کیونکہ اللہ نے اس میں اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ یہ لاڈلا چاند سے کھیلے گا۔ ستاروں کو نوچے گا۔ اللہ نے اس لاڈلے کو بڑی قوتوں سے نوازا ہے۔ صاحبو! اب تو سائنس دان بھی مان گئے کہ انسان میں جتنی قوتیں پنہاں ہیں، ہم صرف اس کا دسواں حصہ استعمال کر رہے ہیں۔ نو حصے خوابیدہ پڑے ہوئے ہیں جو منتظر ہیں کہ انھیں تصرف میں لایا جائے۔

سیانے کہتے ہیں، دُور کے ڈھول سہانے۔ سائنس دان نے سب سے پہلے دُور کے ڈھولوں کی طرف توجہ کی..... چاند، ستارے، سورج، کہکشاں، انھوں نے اس بھید کو نہ سمجھا کہ سب سے بڑا اسرار تو خود انسان ہے۔ اس لیے چراغ تلے اندھیرا ہی رہا۔ پھر شاعروں نے شور مچایا: ''تیری بکل دے وچ چور'' لیکن بکل کی جانب کسی نے توجہ نہ کی۔

اب سائنسی تحقیق کے سامنے ایک دیوار آ کھڑی ہے۔ آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ رخ بدلنا لازم ہے۔ اب وہ انسان کی جانب توجہ کر رہے ہیں۔ انھیں احساس ہو گیا ہے کہ ساری کائنات میں انسان ہی سب سے بڑا معمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ جسے اللہ نے اپنا نائب بنایا ہے۔ جس کی ساری کائنات خادم ہے۔ اللہ کا انوکھا لاڈلا۔

اسلام پسند

سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے علمائے دین نے انسان کو کبھی اشرف المخلوقات نہیں سمجھا۔ کیوں؟ غیر مسلموں کو تو وہ بھٹکے ہوئے راندۂ درگاہ سمجھتے ہیں اور عام مسلمانوں کو بے

عمل قرار دے کر تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نفس لاشعور میں مسلمانوں کی درجہ بندی کر رکھی ہے۔ اس درجہ بندی کی نوعیت انگریزی کی ایک کہاوت کے مترادف ہے۔ کہاوت یوں ہے:

All are queer, Save thee & me

And even thee, my dear A little bit queer.

اس حقیقت کا احساس سب سے پہلے 1964/65ء میں ہوا۔ ان دنوں میں وزارت اطلاعات میں کام کر رہا تھا۔ میرے کمرے میں ایک الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک دن میں نے اتفاقاً الماری کھولی اور ایک کتاب نکالی۔ یہ کتاب ایک بہت بڑے عالم دین کی تصنیف تھی۔ اپنے پروفیشن کے حوالے سے میں جانتا تھا کہ وہ بہت بڑے عالم ہیں اور زندگی بھر کی مسلسل محنت و مشقت سے انھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے اور اپنے علم کے زور پر خود کو منوایا ہے۔ خصوصی بات یہ تھی کہ انھوں نے ذاتی کاوش کے زور پر یہ اعزازی مقام حاصل کیا۔ اگرچہ میں دینی علوم سے ناواقف تھا لیکن میں انھیں بڑا مانتا تھا۔

تفریحاً کتاب کی ورق گردانی کرتے کرتے دفعتاً میں چونکا۔ ارے یہ کیا؟ انھوں نے علانیہ مسلمانوں کی درجہ بندی کر رکھی تھی۔ وہ کلمہ گو کو مسلمان نہیں مانتے تھے۔ خود کو اور اپنی قبیل کے لوگوں کو مسلمان سمجھتے تھے اور عام مسلمانوں کو اسلام پسند کہتے تھے۔ عام مسلمانوں کے متعلق ان کے دل میں تحقیر کا جذبہ تھا جس کا بات بات پر اظہار ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں ربط پیدا کرنے کے بجائے وہ افراق و تفریق پیدا کر رہے تھے۔

میں نے ان کے کردار کو جاننے کے لیے کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔ علم کے زعم نے انھیں بت بنا رکھا تھا۔ سیانے کہتے ہیں لوگو! دو تکبروں سے بچنا۔ ایک علم کا تکبر، دوسرے نیکی کا تکبر۔ ان میں دونوں تکبر موجود تھے۔

شر کا پتلا

پتا نہیں ہمارے دینی راہبر انسان کو شر کا پتلا کیوں سمجھتے ہیں..... گناہ میں لتھڑا ہوا،

راستے سے بھٹکا ہوا۔

صاحبو! اگر آپ مانتے ہیں کہ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ انسان میں اپنی روح پھونکی ہے اور کائنات کو تسخیر کرنا اس کا مقدر ہے تو انسان شر کا پتلا نہیں ہو سکتا۔ میری دانست میں جس روز انسان میں خیر کی نسبت شر کا عنصر بڑھ گیا تو یہ زندگی، یہ دنیا ختم ہو کر رہ جائے گی۔ یہ دنیا بنی نوع انسان میں خیر کے جذبے کے زور پر چل رہی ہے۔

کہتے ہیں جب داتا صاحبؒ نئے نئے لاہور میں آئے تو کچھ روز قیام کے بعد شہر کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلے۔ جب وہ گھوم پھر کو واپس آئے تو استغفار پڑھ رہے تھے۔ کسی نے پوچھا، آپ استغفار کیوں پڑھ رہے ہیں؟ کہنے لگے، میں حیران ہوں کہ یہ شہر غرق کیوں نہیں ہو جاتا۔ اتنی گندگی اور غلاظت ہے یہاں کہ اللہ معاف کرے۔

ایک ماہ کے بعد داتا صاحبؒ پھر گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکلے۔ واپس آئے تو ''سبحان اللہ! سبحان اللہ!'' ورد زبان تھا۔ کسی نے پوچھا تو بولے، اس شہر میں اتنی خیر ہے، اتنے برگزیدہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے اس شہر کو آباد رکھے۔

صاحبو! اس دنیا اور زندگی کو اوپر سے دیکھیں تو شر ہی شر نظر آتا ہے۔ یہ زندگی سمندر کے مترادف ہے۔ اوپری سطح پر مدوجزر ہوتی ہے، طوفان چلتے ہیں، چھینٹے اڑتے ہیں، جھاگ پیدا ہوتی ہے لیکن نچلی سطح پر سکون ہی سکون، مسلسل گہرا سکون رہتا ہے۔ ایسے ہی ہیومن سوسائٹی میں صرف اوپری سطح پر شر کے چھینٹے اڑتے رہتے ہیں، نیچے خیر کا سکون ہی سکون ہوتا ہے۔

صاحبو! گناہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے جرم کرنا۔ جرم کرنے کے لیے فرد کو اپنے نارمل سیلف سے باہر نکلنا پڑا ہے۔ اپنے اندر غصے کی بھٹی جلانی پڑتی ہے۔ انتقام کی آگ کو ہوا دینی پڑتی ہے۔ نفرت کی دھار تیز کرنا پڑتی ہے۔ یعنی خود پر ایک جنونی کیفیت پیدا کرنی پڑتی ہے۔

ایسے ہی گناہ ہے۔ مثلاً آپ کو جھوٹ بولنا ہے، یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ''میں عادی مجرموں کی بات نہیں کر رہا، عام افراد کی بات کر رہا ہوں''۔ صرف زبان جھوٹ بولتی ہے۔

باقی سارے اعضاء زبان کا ساتھ نہیں دیتے۔ الٹا وہ احتجاج کرتے ہیں کہ جھوٹ ہے، جھوٹ ہے، بسا اوقات زبان بھی ہکلانے لگتی ہے۔

کسی سے بدسلوکی کرنا، دھوکا دینا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر فرد دن میں 50 کام کرتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ ان میں دو کام شر کے تحت کیے جائیں۔ باقی 48 کاموں میں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔

ہمارے علمائے دین عام مسلمانوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں کیونکہ اس کے ساتھ ان کی ذاتی اہمیت وابستہ ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں میں عام مسلمانوں کو بھیڑیں سمجھتے ہیں اور خود کو رکھوالے۔ ذہنی طور پر ان میں ہم آہنگی نہیں رہی۔ وہ بٹ کر ایک سے دو ہو چکے ہیں۔ باہر والا کچھ کہتا ہے، اندر والا کچھ اور۔

-☆-

باب:7

دُودھ کا پیالہ

اللہ کی سول سروس میں طرح طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔کوئی موچی ہے،کوئی گڈریا ہے،کوئی افسر ہے،کوئی سادھو ہے،کوئی فوجی ہے،کوئی عالم ہے،کوئی بھڑوا ہے،کوئی شاعر ہے،کوئی گداگر ہے،کوئی سرمایہ دار ہے۔اس سروس میں فقیر کی گدڑی کی طرح طرح طرح کی ''ٹلیاں'' لگی ہوتی ہیں۔ یہ کھدر ہے، یہ کمخواب ہے، یہ نائیلون ہے، یہ زربفت ہے......

اللہ تعالٰی نے ایسا پاکھنڈ مچا رکھا ہے کہ خلق خدا پر حیرت کا عالم طاری ہے۔

کئی ایک بزرگوں نے وجدان کی مستی کے عالم میں بھید کھولنے کی کوشش کی۔ ایک بولا: ''تیری بکل دے وچ چور۔'' دوسرے نے کہا: ''میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں۔'' تیسرا چلایا: ''اناالحق''۔ پھر بھی بھید نہ کھلا۔

داتاؒ نے کہا، میں بھید کھول دوں گا۔

اس نے فرمایا، کھول دو اگر کھول سکتے ہو تو۔

داتاؒ نے ایک کتاب لکھ دی، کشف المحجوب، مطلب ''بھید کھولو'' کتاب۔

صاحبو! میں نے داتاؒ کی کتاب بھید کھولو چار پانچ دفعہ پڑھی ہے لیکن بھید نہیں کھلا۔ جو تھوڑی سی عقل ذہن میں تھی، وہ بھی گڑبڑا گئی۔

بہر صورت بزرگ کے متعلق تھوڑی سی بات سمجھ میں آئی۔ بزرگوں کے متعلق داتاؒ لکھتے ہیں (جو میں اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں) کہ اللہ نے اولیاء کو کائنات کا گورنر بنایا ہے۔

1- ان میں سے 400 ایسے ہوتے ہیں جو پردے میں رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ اپنے مقام کا خود شعور نہیں رکھتے اور ہر طور خود سے اور لوگوں سے مخفی رہتے ہیں۔
2- پھر ایسے بھی ہیں جنھیں بست و کشاد کی طاقتیں حاصل ہیں۔ وہ اللہ کے دربار کے افسر ہیں۔ وہ تعداد میں 300 ہوتے ہیں جنھیں اخیار کہا جاتا ہے۔
3- 4 کو ابدال کہتے ہیں
4- 7 ایسے ہیں جنھیں ابرار کہتے ہیں۔
5- 4 کو اومار کہتے ہیں۔
6- 3، جنھیں نقابہ کہتے ہیں۔
7- اور ایک جسے قطب یا غوث کہتے ہیں۔

داتا صاحبؒ نے نام گنوا دیئے، تعداد بتا دی لیکن کام کی نوعیت پر روشنی نہیں ڈالی کہ یہ عہدے دار کرتے کیا ہیں اور یہ روحانی سروس کیوں قائم کی گئی ہے؟ نہ ہی داتا صاحبؒ نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ بزرگ کی کیا پہچان ہے؟

دودھ کا پیالہ

بزرگ کی پہچان کے متعلق میرا ایک ذاتی مفروضہ ہے۔ وہ یہ کہ بزرگ کے ہاتھوں میں دودھ سے لبالب بھرا ہوا ایک پیالہ ہوتا ہے، لیکن ٹھہریئے! یہ بات وضاحت طلب ہے۔

کہتے ہیں ایک گرو تھا۔ اس کا ایک چیلا تھا جس کا نام داس تھا۔ گرو نے کئی ایک سال داس کو تعلیم دی۔ پھر ایک روز اس نے داس سے کہا، دیکھو میاں! جتنی تعلیم میں تمھیں دے سکتا تھا، وہ دے دی۔ اب مزید تعلیم تمھیں مہاراج دیں گے۔ تم فلاں ریاست میں چلے جاؤ۔ یہ ریاست پچھم میں پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ وہاں پہنچ کر تم ریاست کے مہاراج سے ملو۔ انھیں ہمارا سلام دو اور کہو کہ ہم نے تمھیں تعلیم کے لیے بھیجا ہے۔ پھر جو حکم وہ

دیں، اس پر عمل کرو۔

داس نے پچھم کا رخ کیا اور پیدل چلتا رہا۔ چلتے چلتے وہ ایک مہینے میں ریاست میں پہنچ گیا لیکن مہاراج کے محل کے دروازے پر دربانوں نے اسے روک لیا۔ اس نے انھیں ساری بات بتائی کہ گرو نے اسے مہاراج کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے بھیجا ہے لیکن دربانوں نے اسے اندر نہ جانے دیا۔

ایک مہینہ داس، مہاراج کے محل کی دیوار تلے پڑا رہا۔ وہ مہاراج کی سواری کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ مہاراج گھوڑے پر سوار ہوتے، ساتھ زرق برق لباس میں ملبوس مصاحبوں کی قطار ہوتی۔ مہاراج کی شان وشوکت دیکھ کر داس سوچ میں پڑ جاتا۔

شک وشبہات

گرودیو نے مجھے کہاں بھیج دیا ہے؟ یہ مہاراج تو اتنی بڑی ریاست کا حکمران ہے۔ دنیا کی ہر نعمت اسے حاصل ہے۔ شان وشوکت میں رہتا ہے۔ خدمت کرنے کے لیے نوکر چاکر ہیں۔ یہ تو بری طرح سے دنیاداری میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ مجھے کیا تعلیم دے گا؟

ایک روز اتفاق سے مہاراج کی سواری محل کی دیوار کے اس حصے سے گزری جہاں داس پڑا ہوا تھا۔ مہاراج کی سواری دیکھ کر داس ہمت کر کے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

مصاحبوں نے اسے پکڑ لیا اور مہاراج کے حضور میں لے گئے۔ مہاراج نے غصے میں پوچھا، پاگل آدمی! بول تو نے یہ حرکت کیوں کی؟

داس زیرلبی میں بولا، مہاراج! گرودیو نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔

مہاراج بات سمجھ گئے۔ پینترا بدل کر بولے، اسے محل میں لے جاؤ۔ وہاں ایک حجرے میں رکھو۔ خدمت گار لگا دو جو اس کے کھانے پینے کا خیال رکھیں اور اس پر نگاہ رکھیں تا کہ یہ بھاگ نہ جائے۔ اس کے مقدمے کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔ ہم خود سزا تجویز کریں گے۔

ایک مہینہ داس محل کے اندر مقیم رہا۔ اس کی ہر ضرورت پوری کرنے کے لیے خدمت

گار موجود تھے۔ محل کا اندرونی منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ دل میں شکوک اور ابھرے۔

ایک روز تہوار کی رات تھی محل جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ سارے شہر میں چراغاں ہو رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت خدمت گار نے آ کر داس سے کہا کہ مہاراج نے حاضری کا حکم دیا ہے۔

داس حاضر ہوا تو مہاراج بولے، دیکھو آج تہوار کی رات ہے۔ سارا شہر جگمگ ہو رہا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ کھیل تماشے ہو رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم شہر کی سیر کرو۔ خدمت گار تمھارے ساتھ جائے گا اور سارا شہر گھما لائے گا۔

سر پر لٹکتی تلوار

جب داس جانے لگا تو مہاراج نے آواز دی۔ بولے، میاں! ہمارا ایک کام کرو۔ یہ کہہ کر مہاراج نے ایک لبالب بھرا ہوا پیالہ داس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بولے، دودھ کا یہ پیالہ اٹھائے رکھنا۔ خبردار! اس پیالے سے ایک قطرہ دودھ بھی نیچے نہ گرے۔

پھر مہاراج نے جلاد کو بلوایا۔ بولے، تم ان کے ساتھ جاؤ۔ اگر دودھ کا ایک قطرہ بھی پیالے سے گرے تو تم اس کا سر قلم کر دینا۔

اگلے روز مہاراج نے پھر داس کو بلا بھیجا۔

پوچھا، میاں! بتاؤ کل رات شہر میں کیا کیا تماشے دیکھے؟ کیا کیا رونقیں دیکھیں؟

داس ہاتھ جوڑ کر بولا، مہاراج! رونقیں اور تماشے کیسے دیکھتا؟ میری تو ساری توجہ دودھ کے پیالے پر مرکوز تھی اور سر پر جلاد کی تلوار تھی۔

مہاراج مسکرائے۔ بولے، داس! ہمارا بھی یہی حال ہے۔ ہمارے گرو نے بھی ہمارے ہاتھوں میں دودھ کا پیالہ تھما دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ جاؤ ریاست کا راج پاٹ سنبھالو۔ دنیاوی شان وشوکت کے تماشے دیکھو۔ لیکن دھیان رہے کہ دودھ کا قطرہ زمین پر نہ گرے۔

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ بزرگ کی شناخت یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں میں دودھ کا ایک پیالہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ کرسئ اقتدار پر بیٹھا ہو یا چکلے کی نالی میں لت پت پڑا ہو۔ اس کی تمام تر توجہ دودھ کے پیالے پر مرکوز رہتی ہے۔ لیکن ٹھہریئے......

صاحبو! میری حماقت ملاحظہ کرو۔ میں دودھ کے پیالے کی بات کر رہا ہوں جب کہ میرے ساتھی دانشور بزرگوں کے وجود ہی سے منکر ہیں۔

الکھ نگری کی اشاعت کے بعد کچھ دانشوروں نے اخبارات میں مجھ پر اعتراضات کیے تھے۔

بابے

ایک جانے پہچانے ادیب نے، جو کہ پروفیسر ہیں، کہا کہ مفتی ہمیں خوامخواہ بابوں کے چکر میں ڈال رہا ہے۔ یہ بابے ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ بابے اچھے خاصے مزاحیہ کردار لگتے ہیں۔ مفتی کا کہنا ہے کہ مستری بابا آنے والا ہے جس نے پاکستان کو رنگ و روغن کرنا ہے۔

مفتی نے پروفیسر صاحب کی خدمت میں عرض کیا، عالی جاہ! میری کیا حیثیت ہے کہ بابوں کی بات کروں۔ میں ایک ادھ پڑھ آدمی ہوں۔ مذہب کے متعلق سراسر منہ زبانی ہوں۔ باباؤں کی بات تو آپ کے داتاؒ نے کی ہے جو لاہور شہر کے بادشاہ ہیں۔ جنھیں سلام کرنے کے لیے آپ مہینے میں ایک مرتبہ دربار عالیہ پر ضرور حاضری دیتے ہیں۔ جنھیں آپ عالم مانتے ہیں۔

داتاؒ اپنی تصنیف کشف المحجوب میں باباؤں کے متعلق لکھتے ہیں:

1- اللہ نے اولیاء کو کائنات کا گورنر بنایا ہے۔
2- اولیاء نے اپنی تمام تر زندگی اللہ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔
3- اولیاء نے اپنی ذات کو نفی کر رکھا ہے۔
4- ان کی برکتوں کی وجہ سے آسمان سے مینہ برستا ہے۔

5- ان کی زندگی کی پاکیزگی کی وجہ سے زمین سے بوٹے اگتے ہیں۔
6- ان کی روحانیت کی وجہ سے مسلمان، کافروں سے لڑائیاں جیت جاتے ہیں۔

جھگڑا

صاحبو! دیکھ لو دانشور کتنے منافق ہیں۔ مفتی باباؤں کی بات کرے تو اسے ڈانٹتے ہیں لیکن جنھوں نے ہمیں باباؤں سے متعارف کرایا ہے، ان سے اظہار عقیدت کرتے ہیں، انھیں سلام کرتے ہیں، فاتحہ پڑھتے ہیں، ان سے برکات کی استدعا کرتے ہیں۔ لیکن دوستو! یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تو پرانا جھگڑا ہے جو اللہ میاں اور دانشوروں کے درمیان چلا آ رہا ہے۔

دانشور کہتے ہیں، اے اللہ! اس دنیا کے نظام کو ایسے چلا جیسے ہم چاہتے ہیں یا کم از کم ایسے جو ہماری سمجھ میں آ جائے۔

ادھر اللہ میاں ضد کیے بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں، میاں! ہم قادر مطلق ہیں، جو چاہیں گے، کریں گے۔ تم ہمیں پابند نہیں کر سکتے۔

اس پر دانشور بھی ضد میں آ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں، اگر تو ہماری بات نہیں مانتا تو ہم بھی تجھے قادر مطلق نہیں مانیں گے۔ جو بات دل کو لگے گی، وہ مانیں گے۔ جو نہیں لگے گی، وہ نہیں مانیں گے۔

نتیجہ یہ ہے کہ دانشور اللہ تعالیٰ کی باتوں پر نکتہ چینی کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ وہ کیوں ہوا؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔

دانشور بھی سچے ہیں۔ کہتے ہیں جب اللہ نے کائنات کو چلانے کے لیے اصول اور قانون بنا دیئے ہیں، پھر اسے کیا حق حاصل ہے کہ اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی کرے؟ خود معجزے دکھائے اور بابوں کو کرامات دکھانے کی اجازت دے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمارے دانشور اللہ کو اپنی لاجک Logic کے تابع کرنے کے شوقین ہیں۔ وہ جج بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور اللہ کے کاموں پر فیصلے سناتے رہتے ہیں۔ فلاں کام اللہ نے

ٹھیک نہیں کیا، فلاں کام بالکل گڈمڈ کردیا۔ کیا خدائی یوں کی جاتی ہے؟ ہمارے دانشوروں کو سب سے زیادہ اعتراضات معجزوں اور کرامتوں پر ہے۔

معجزے

اللہ ان کی باتوں پر ہنستا ہے۔ کہتا ہے، اندھو! غور سے دیکھو۔ میرا تو ہر کام معجزہ ہے۔ اس مشین کو دیکھو جسے تم گائے کہتے ہو۔ یہ گھاس کھاتی ہے اور ہم نے ایسا نظام بنادیا ہے کہ ایک طرف گھاس سے خون بنتا ہے، دوسری طرف سے فضلا باہر نکلتا ہے اور تیسری طرف سے تمھارے لیے میٹھا اور پاکیزہ دودھ۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے؟

تم دیکھو تو۔ ایک ہی ٹکڑا زمین میں ایک جانب ایک بوٹا زمین سے فرحت بخش کھٹاس اکٹھی کر کے ''نیبو'' بنادیتا ہے۔ دوسری طرف ایک بوٹا زمین سے لذت بھری مٹھاس چوس کر آم بنادیتا ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں؟

تم دیکھو تو! لق و دق صحرا میں جہاں میلوں پانی کا نشان نہیں، ایک سوکھی پتلی سی بیل شیریں پانی سے بھرا ہوا ایک اتنا بڑا تربوز اگادیتی ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں؟

پھر ہم نے ایک چھوٹے سے پتنگے کی دم میں شعلہ لگادیا، ٹھنڈی آگ کا شعلہ۔ تم ہمارے کس کس معجزے کو جھٹلاؤ گے؟

پھر تم اپنی طرف دیکھو۔ ہمارے بابے نے، جسے تم اپنی کم فہمی کی بنا پر علامہ کہتے ہو، ایسے ہی تو نہیں کہہ دیا:

میں ہی تو ایک راز تھا سینہء کائنات میں

کردار کی عظمت

معافی چاہتا ہوں۔ بات تو دودھ کے پیالے کی ہو رہی تھی، میں نے خوامخواہ دانشوروں کے چھتے میں انگلی ڈال دی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دودھ کا پیالہ بزرگ کی پہچان ہے۔

داتا صاحبؒ دودھ کا پیالہ اٹھائے لاہور میں آ بیٹھے۔ انھوں نے اسلام کی تبلیغ نہیں

کی، صرف ان کے دودھ کے پیالے کے زور پر کچھ عرصے میں آدھا لاہور مسلمان ہوگیا۔

دودھ کا پیالہ اٹھا کر ایک بابا ہندوؤں کے گڑھ اجمیر شریف میں جا بیٹھا۔ پچھلے سال عرس پر میں نے اجمیر شریف میں حاضری دی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لاکھوں زائرین میں غیر مسلموں کی تعداد مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ تھی۔

ایک بابا دودھ کا پیالہ اٹھائے جادوگروں کی نگری میں جا بیٹھا اور آج وہ نگری پاک پتن کے نام سے مشہور ہے۔

سب سے بڑا دودھ کا پیالہ عظیم کردار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا۔

آج چودہ سو سال کے بعد بھی بڑے بڑے دانشور، humanist، سائنسدان، مؤرخ، علماء خصوصاً غیر مسلم، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کی عظمت کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ محققوں نے دنیا کے سو بڑے لوگوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام سب سے اول شمار کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کی عظمت کو عیسائیوں کے بڑے پادریوں اور راہبوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔

قبیلہ تہذیب

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے مکے اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ یہ ایک غلط فہمی ہے کیونکہ ان علاقوں میں رہنے والے بدو قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ قبیلہ تہذیب ایک مخصوص رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے اپنی تصنیف ''دی کلچر آف اسلام'' میں قبیلہ نفسیات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال کی تحریر Convincing اور Powerful ہے اور ان کی تحقیق کا رخ حقیقت پسندانہ ہے۔ انھوں نے قبیلہ نفسیات اور اسلامی کردار کا بہت خوبی سے موازنہ کیا ہے۔

قبیلہ تہذیب میں رسم و رواج بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہر قبیلہ کے رسم و رواج مختلف ہوتے ہیں۔ یہی ہر قبیلے کا Tribal Law ہوتا ہے جس پر چون و چرا کیے بغیر عمل کرنا لازم

ہوتا ہے۔ قبیلہ تہذیب میں فرد کی ذاتی اہمیت نہیں ہوتی۔ اپنی تمام تر اہمیت وہ قبیلے سے اخذ کرتا ہے۔ کردار کی ان خوبیوں کو سراہا جاتا ہے جو قبیلے کی تقویت کا باعث ہوں۔

قبیلہ تہذیب کے افراد شیخی خورے ہوتے ہیں۔ اونچی ناک والے، لڑاکا، غصیل، انتقام کے رسیا، شجاعت کے زعم سے بھرے ہوئے، کھانے کے رسیا، کھانے پلانے کے شوقین۔ اسلامی کردار کی خصوصیات قبیلہ تہذیب سے مختلف اور متضاد ہیں۔

مکے کی اہمیت

ان دنوں مکے میں مختلف قبیلوں میں مختلف قبیلوں کے سردار رہتے تھے۔ مکہ ایک بت خانہ تھا جہاں ہر قبیلے کے دیوتاؤں کے بت رکھے ہوئے تھے۔ مکے کی حیثیت ایک متبرک مذہبی مرکز کی تھی۔ سرداروں کی اہمیت بھی دیوتاؤں کے بتوں کے حوالے سے تھی۔

لوگ دور دور سے مکے آتے تھے۔ اپنے دیوتاؤں کی پرستش کرتے، رسومات بجا لاتے، مکے میں قیام کرتے اور خرید و فروخت کرتے۔ یوں مکہ خرید و فروخت کے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ پھر ایک اور بات تھی۔ عرب کے دوسرے علاقوں میں جانے کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ یہ درہ مکے کے قریب واقع تھا، اس لیے تجارتی قافلے روانہ ہونے سے پہلے مکے میں جمع ہوتے، وہاں پڑاؤ کرتے۔ اسی وجہ سے مکے کی تجارتی حیثیت میں اضافہ ہوتا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کم گو تھے۔ میل ملاپ کے شوقین نہ تھے، تنہائی پسند تھے۔ دولت مند نہ تھے۔ چرواہے کا کام کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے اخلاق اور کردار کی وجہ سے مکے والے آپ ﷺ کی عزت کرتے تھے۔ انھوں نے آپ ﷺ کو امین کا خطاب دے رکھا تھا۔ سبھی مانتے تھے کہ آپ ﷺ نے کبھی دروغ بیانی نہیں کی، کبھی منافقت نہیں کی۔ پھر آپ ﷺ نے تجارت کا کام شروع کر لیا۔ مکے میں آپ ﷺ کے کاروباری لین دین اور دیانت داری کی دھوم پڑ گئی۔ گمان غالب ہے کہ مکے میں آپ ﷺ فرد واحد تھے

جنھوں نے اپنے کردار کے زور پر اپنی سچائی اور دیانت داری کے زور پر عزت کروائی۔ ان حالات میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جب حضور ﷺ نے پیغمبر ہونے کا اعلان کیا تو مکے والوں نے دل ہی دل میں آپ ﷺ کی سچائی پر یقین کر لیا ہوگا۔ پھر وہ آپ ﷺ کے دشمن کیوں بن گئے؟ اس لیے کہ اگر وہ بتوں کو توڑ دیتے تو ان کی سرداری ختم ہو جاتی اور مکے کی اقتصادی اہمیت ٹھپ ہو جاتی۔ لہٰذا اپنی اور شہر کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ حضور ﷺ کے خلاف ہو گئے۔

جزو اور کل

صاحبو! جب بھی میں حضور ﷺ کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں ایک عظیم انسان کی تصویر ابھرتی ہے۔ عہدے دار کی نہیں، انسان کی۔ ایک دن میں نے قدرت اللہ سے پوچھا، یہ بتائیے کہ سب سے افضل عبادت کون سی ہے؟

انھوں نے کہا: سب سے افضل عبادت Identification with Mohammad ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیو۔ لیکن کیسے؟

بولے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح سرہانے تلے رکھو۔ روز ایک واقعہ پڑھو۔ پھر سوچو کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احساسات اور جذبات کیا ہوں گے؟ پھر آپ ان کے جذبات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد جب بھی کسی سچوایشن سے دوچار ہوں تو سوچئے کہ ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ردعمل کیا ہوتا؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیو کے عظیم اصول کو ہم نے یوں اپنایا کہ کل کو چھوڑ کر جزو پر توجہ مرکوز کر لی۔ دودھ کو نظر انداز کر کے پیالے کو اپنا لیا کہ پیالہ کس چیز کا بنا ہے؟ اس کی شکل کیسی ہے؟ اس پر کس طرح کے نقش و نگار بنے ہیں؟ ہم سوچنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتنی لمبی داڑھی رکھتے تھے؟ کمرے میں داخل ہوتے تو کون سا پاؤں پہلے اندر دھرتے؟ پانی پیتے تو کٹورہ کس ہاتھ میں پکڑتے؟ کس قسم کا لباس پہنتے؟

ہم نے دودھ کو نظر انداز کر دیا، پیالے کو اہم سمجھ لیا۔ ہم نے کردار کو نظر انداز کر دیا،

جسمانی ہیئت کو اہم سمجھ لیا اور ہم نے اس جزو پرستی کو سنت کا نام دے دیا۔

معذرت

صاحبو! میں معذرت خواہ ہوں۔ یہ تحریریں جو میں ''تلاش'' کے عنوان سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، ان کی کوئی عالمانہ حیثیت نہیں ہے۔ الحمدللہ! کہ میں عالم نہیں ہوں۔ بے شک قرآن میں بار بار علم حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک شرط ملفوف ہے کہ علم حاصل کرو لیکن دھیان رہے کہ عجز کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

صاحبو! علم تفاخر پیدا کرتا ہے، انا میں پھونک بھر دیتا ہے۔ سیانے کہتے ہیں:

"Masters are monsters"، عالم فرعون بن جاتے ہیں۔

ہمارے علمائے دین کو دیکھئے۔ درسگاہوں کے اساتذہ کرام کو دیکھئے۔ ان کے رویے کو دیکھ کر مجھے ٹی وی کی وہ اشتہاری بچی یاد آ جاتی ہے جو بچوں کو دانت صاف کرنے کے طریقے بتانے کے بعد کہتی ہے: ''سمجھے؟ شاباش۔''

میری یہ تحریریں دانشورانہ حیثیت بھی نہیں رکھتیں۔ الحمدللہ! کہ میں دانشور نہیں ہوں۔ میں تو خود تلاش میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔ منزل کا پتا ہے نہ راستے کا۔

نصیحت

میری یہ تحریریں نصیحتوں کی حیثیت بھی نہیں رکھتیں۔ میں کیا نصیحت کروں؟ میں نے خود گڑ کھایا ہے، کس منہ سے کہوں۔ ''من نہ کردم شما حذر بکنید''۔ میرے گرو نے مجھے واحد نصیحت کی تھی۔ کہنے لگے، مفتی! میری ایک نصیحت پلے باندھ لو۔ وہ یہ کہ کبھی کسی کو نصیحت نہ کرنا۔ نصیحت منہ سے کہنے کی چیز نہیں، کر دکھانے کی چیز ہے۔ منہ سے کہو تو الٹی چرخی چل جاتی ہے۔ ری ایکشن پیدا ہوتا ہے۔

نصیحت کی بات پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی۔ میں اس کہانی کو دنیا کی عظیم کہانیوں میں شمار کرتا ہوں۔ حکیم صاحب کی دکان تھی۔ شام کا وقت تھا۔ حکیم صاحب شہد کے مرتبان پر ٹھیک طور پر ڈھکنا لگا کر نہیں گئے تھے۔ ایک مکھی مرتبان پر جا بیٹھی۔ ڈھکنے کے دراڑ سے اندر

گھسی اور شہد چاٹنے لگی، چاٹتی رہی۔

جب سیر ہو گئی تو چاہا کہ اڑ جاؤں لیکن اڑ نہ سکی کیونکہ اس کی ٹانگیں شہد کے شیرے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ پھر وہ دیر تک اپنی ٹانگوں کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ آخر کار کامیاب ہو گئی لیکن تھک کر بیٹھ گئی۔

اس دوران دکان میں ایک پتنگا آ گیا۔ وہ مکھی کو دیکھتا رہا..... کچھ دیر کے بعد مکھی پھر شہد کی طرف بڑھی۔ پتنگا بولا: بی بی! ابھی تو اتنی مشکل کے بعد شہد سے باہر نکلی ہو۔ اب پھر شہد کی طرف بڑھنے لگی۔ عقل کر بی بی! کیوں خود کو پھر سے مصیبت میں ڈالتی ہو۔ پتنگے کی بات سن کر مکھی شرمندہ ہو گئی۔

اتنے میں حکیم صاحب کا نوکر دیا جلا کر لے آیا اور دکان میں رکھ گیا۔ دیئے کو دیکھ کر پتنگے نے دیوانہ وار شعلے کا طواف کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد شعلے کی زد میں آ گیا اور جل کر نیچے گر پڑا۔ مکھی یہ دیکھ کر مسکرائی۔ بولی، لو ابھی ابھی مجھے نصیحتیں کر رہا تھا، عقل سکھا رہا تھا۔

صاحبو! دراصل ان تحریروں کے پردے میں میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ حسن یار کی باتیں۔ اپنی خوش فہمیاں، کج رویاں، الٹی سلٹی سوچیں، سنی سنائی بیتی آپ بیتیاں۔

جو گوروں نے برصغیر میں براڈکاسٹنگ کا آغاز کیا تھا تو انھوں نے نشریات میں ایک نیا موضوع شامل کیا تھا جس کا نام انھوں نے ''ٹاک'' رکھا تھا۔

ہماری نشریات میں ''ٹاک'' کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ براڈکاسٹر یا تو اسے تقریر کی شکل دے دیتے یا مولویانہ وعظ کی یا سنجیدہ مقالے کی۔ میری یہ تحریریں دراصل ٹاک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ 1975ء میں آپ کی خدمت میں حج کی روداد پیش کی تھی۔ عنوان تھا ''لبیک''۔

لبیک کی اشاعت پر قارئین نے مجھے تقریباً دو ہزار خط لکھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بیشتر خطوں کا نفس مضمون ایک ہی تھا..... لکھا تھا کہ ان موضوعات پر ہمارے خیالات اور جذبات بالکل ایسے ہی ہیں جیسے آپ نے لبیک میں رقم کیے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے آپ نے ہمارے خیالات اور جذبات کو لفظوں میں ڈھال کر لبیک میں پیش کر دیا ہے۔ تلاش

لکھتے ہوئے کبھی مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میں آپ ہی کے خیالات اور جذبات کو لفظوں میں ڈھال رہا ہوں۔

☆

باب 8

جہاں گُڑ ہوگا، وہاں چیونٹے تو آئیں گے

روز نامہ نوائے وقت میں آج کل الطاف گوہر ایک کالم لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے کالم میں لکھا کہ کراچی کے ایک پوش محلے کی مسجد میں جہاں صاحب حیثیت اور پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں، انھیں مولوی صاحب کا خطبہ سننے کا اتفاق ہوا۔

مولوی صاحب کے خطبے کا موضوع تھا کہ مسلمان نمازی پر لازم ہے کہ وہ اپنی شلوار ٹخنوں سے اوپر رکھے ورنہ اس کی نماز فسق ہو جائے گی۔ الطاف گوہر مولوی صاحب کی جسارت پر حیرت زدہ تھے کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے ایسے فروعی موضوع پر خطبہ دے رہے تھے اور اتنے جوش اور جذبے سے بات کر رہے تھے جیسے سامعین پر ایک نئے انوکھے اور اہم ترین موضوع کا انکشاف کر رہے ہوں، اور اسلام کے ایک اہم بلکہ بنیادی مسئلے پر روشنی ڈال رہے ہوں۔

خطبہ

مجھے بھی مولوی صاحب کا ایسا ہی خطبہ سننے کا اتفاق ہوا تھا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ اسلام آباد میں آب پارہ کی لال مسجد کا ملحقہ میدان کھچا کھچ نمازیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اجتماع میں زیادہ تر سرکاری افسر تھے۔ ڈپٹی سیکرٹری، سیکشن افسر، سیکرٹریٹ کا پرسنل سٹاف اور دو ایک سیکرٹری بھی موجود تھے۔ مولوی صاحب خطبہ دینے کے لیے اٹھے تو اتفاق سے ان کی نگاہ ایک صاحب پر پڑی جس نے جرابیں پہن رکھی تھیں۔ مولوی صاحب کو خطبے کے لیے ایک موضوع مل گیا۔ انھوں نے مجمع کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ

پڑھے لکھے ہوکر آپ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور نماز میں بھی سنت کو ملحوظ خاطر نہیں۔ آپ کو علم ہونا چاہیے کہ نماز میں جراب پہننا ممنوع ہے۔ جو شخص جراب پہن کر نماز پڑھتا ہے، اس کی نماز فسق ہو جاتی ہے۔

مجمع میں سے کوئی چلا کر بولا: مولانا اسکیمولینڈ کے مسلمان کیا کرتے ہوں گے؟''

مولانا غصے میں چلائے: ''ہم اسکیمولینڈ کی بات نہیں کررہے۔ ہم پاکستان کی بات کر رہے ہیں۔ اور صاحبو! جان لو کہ خطبے کے دوران حجت کرنا شیطانی فعل ہے۔''

مجمع پر سکوت چھا گیا۔

مجھے مولوی صاحب کی جسارت پر حیرت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ پڑھے لکھے اور اسلام کے باخبر لوگوں کے سامنے ایسی باتیں کر رہے تھے۔ اس جذبے، جوش اور Conviction سے بات کر رہے تھے جیسے وہ جانتے ہوں اور ان جانوں کو سمجھانے کا مقدس فریضہ ادا کر رہے ہوں۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ پڑھے لکھے باخبر لوگ مولوی صاحب کی فروعی باتوں کو بیٹھے خاموشی سے سن رہے تھے۔ کسی کے دل میں احتجاج پیدا نہیں ہو رہا تھا۔

They were suffeing it.

میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مولوی صاحب سے کہوں، ''جناب والا! خطبے میں کسی اسلامی مسئلے پر روشنی ڈالیے۔'' میں اٹھا بیٹھا، دو ایک بار کوشش کی لیکن بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا چلو احتجاجاً واک آؤٹ ہی کرلو۔ مجھے مجمع سے باہر نکلتے دیکھ کر مولوی صاحب نے ایک دم پینترا بدلا، کہنے لگے: ''خطبہ سننا لازم ہے چونکہ یہ نماز کا ایک لازمی حصہ ہے۔ خطبہ نہ سنو تو نماز فسق ہو جاتی ہے۔''

اس روز میرا موڈ بہت آف رہا۔

شام کو میرے گھر ''چھڈ یار'' کی میٹنگ تھی۔

''چھڈ یار'' ہماری ایک تنظیم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ چھوڑو۔ سیاسی صورت حال کو چھوڑو۔ دفتر کی پالیٹکس کو چھوڑو۔ گھریلو چخ چخ کو چھوڑو۔ اپنے اندر کا بچہ باہر نکالو، اسے اپنے کاندھے پر بٹھاؤ اور پھر باہر نکل جاؤ۔ آٹھ دس دن کسی کھوہ میں، جنگل میں، وادی میں،

پہاڑی پر جا کر تیاگی بن جاؤ۔

چھڈ یار کے چھ رکن ہیں جو ''میں میں'' سے یوں بھرے ہوئے ہیں جیسے بھڑ ''بھوں بھوں'' سے بھرے ہوتے ہیں۔

جھولا اور نمرود

سب سے پہلے عماد آیا۔ عماد ذات کا انجینئر ہے جو عبادات میں یوں بھیگا ہوا ہے جیسے جلیبی شیرے میں بھیگی ہوتی ہے۔ کہنے لگا: ''آج تو موڈ آف نظر آتا ہے، کیا ہوا؟'' میں نے مولوی صاحب کے خطبے کی بات سنائی۔ اس پر عماد ہنسا، کہنے لگا: ''مفتی جی! خطبے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ جراب والی بات تو بڑی معصوم ہے۔ ہم نے وہ وہ خطبہ سنا ہے کہ الامان۔ مثلاً ہمارا گاؤں بڑے پر فضا مقام پر واقع تھا۔ جب برسات کا موسم آتا تو سبزے کا مخملی فرش بچھ جاتا۔ درختوں کی شاخیں دھنا دھن جھولتیں۔ طرح طرح کے پرندے اپنی اپنی بولیاں بولتے۔ ایک سماں بندھ جاتا۔ بچے ضد کرتے تو بڑے رسوں کے جھولے بنا دیتے جن پر بیٹھ کر بچے جھولتے۔

اس پر ہمارے گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب نے جمعے کی نماز کے دوران خطبے میں ہم سب کو خبردار کیا کہ جھولا جھولنا ایک غیر اسلامی بلکہ شیطانی فعل ہے۔

مولوی صاحب کی یہ بات سن کر ہم سب بہت حیران ہوئے۔

اعظمی نے کہا: ''آپ مولوی صاحب سے پوچھتے تو کہ شیطانی فعل کیسے ہے؟''

عماد مسکرایا، کہنے لگا؟ ''آپ گاؤں کے مولوی صاحب کو نہیں جانتے، دیہات میں وہ اسلام پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ مولوی صاحب نے وہی جھولے کے مسئلے پر روشنی ڈالی۔ کہنے لگے: ''نمرود نے ہی جھولا ایجاد کیا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے لیے ایک بہت بڑا بھانبھڑ بنایا گیا تو وہ اس قدر بڑا ہو گیا کہ قریب جانا مشکل ہو گیا۔ کوئی شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس الاؤ میں دھکیلنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس وقت نمرود کو سوجھی۔ اس نے رسے کا

ایک جھولا درخت سے باندھا۔ جھولے کا رخ آگ کے الاؤ کی طرف کر دیا۔ نمرود نے کہا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جھولے پر بٹھا کر دھکا دو۔ جب جھولا الاؤ کے اوپر جائے گا تو رسہ جل جائے گا اور ابراہیم الاؤ میں گر پڑیں گے۔

مولوی صاحب نے کہا: ''جو جھولا لگاتے ہیں، وہ نمرود کے پیروکار ہیں۔ لوگو خبردار! اس بدعت میں نہ پڑو۔''

عمر ہنسنے لگا، بولا: ''یہ خطبہ تو پرانا ہے۔ آج بسنت کے خلاف خطبے دیئے جا رہے ہیں کہ بسنت منانا کفر کے مترادف ہے۔ یہ موسمی تہوار نہیں بلکہ ہندوانہ تہوار ہے۔ اسلام میں صرف مذہبی تہوار ہوتے ہیں۔''

سکہ وہ جو رائج الوقت ہے

''ان خطبوں میں اسلام کے متعلق کتنی ڈس انفارمیشن پھیلائی جاتی ہے۔'' اعظمی نے کہا۔ ''اسلام کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔''

اس دوران مسعود قریشی بھی آ گیا۔ مسعود نے آتے ہی شور مچا دیا، کہنے لگا: ''یار تم سب کتنے احمق ہو۔ جسے تم مسخ شدہ کہتے ہو، یہی اسلام ہے جسے تم ڈس انفارمیشن کہتے ہو، یہی اسلام ہے۔''

''تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟'' عمر غصے میں غرایا۔

''میرا نہیں۔'' مسعود نے جواب دیا، ''تمھارا چماغ چل گیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اسلام وہ ہے جو کتاب میں درج ہے یا وہ ہے جو پڑھے لکھے عقل مند باخبر لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ نہیں میرے پیارو! اسلام وہ ہے جو رائج الوقت ہے۔ اسلام وہ ہے جو مسجدوں میں خطبوں کے ذریعے پھیلایا گیا ہے، پھیلایا جا رہا ہے۔''

اس پر سب احتجاجاً چیخنے لگے۔

مسعود نے کہا، ''اچھا یہ بتاؤ پاکستان میں کل کتنی مسجدیں ہوں گی۔ ہر اڈے پر ہے، ہر شاہراہ پر ہے، شہروں میں ہر محلے میں ہے۔ مل ملا کر دس لاکھ تو ہوں گی۔''

''ہاں شاید!'' عماد نے کہا۔

''تو جان لو دوستو!'' مسعود بولا ''کہ ہر جمعے کو ہر تہوار کے دن دس لاکھ مسجدوں میں ایسے خطبے دیئے جاتے ہیں۔ دیہات کے اسّی فی صد لوگ تو ان خطبوں کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ شہر کے عام لوگ ان خطبوں کو ڈھل مل یقین سے سنتے ہیں۔ پڑھے لکھے باخبر لوگ ان خطبوں کو سنتے ہیں اور Suffer کرتے ہیں، بولتے نہیں۔ پھر ریڈیو پر، ٹی وی پر، اخباروں میں ایسے خطبے تقاریر اور مضامین کی صورت میں نشر ہوتے رہتے ہیں۔''

اس روز مسعود کی بات نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اسلام وہ ہے جو کتاب میں ہے۔ جو صاحبان غور وفکر کے ذہن میں ہے یا جس کا پرچار بزرگان، اولیائے کرام یا صوفیائے کرام نے کیا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اس حقیقت کو جانا کہ اسلام وہ ہے جو راج الوقت ہے۔ جسے ملاّ نے رائج کیا ہے اور یہ ملاّ پاکستان میں دس لاکھ نشر گاہوں پر قابض ہیں۔ وہ اسلام کے صرف ان پہلوؤں کو Boost کرتے ہیں جن سے ان کی ذات کو اہمیت ملے، ان کے خطبات کو اہمیت ملے، ان کے توہمات کا پرچار ہو۔

اجارہ دار

صاحبو! یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ سلسلہ تو روز اول سے چل رہا ہے۔ جب بھی کوئی نیا مذہب آیا تو ساتھ ہی اس کے اجارہ دار پیدا ہو گئے۔

ہندوازم آیا تو برہمن پیدا ہو گئے۔

عیسائیت آئی تو راہبانیت کا سلسلہ چل پڑا اور پادری اس قدر طاقت ور ہو گئے کہ بادشاہوں سے ٹکر لینے سے بھی گریز نہ کیا۔

بدھ ازم واحد مذہب تھا جس نے خدا کے بارے میں اقرار کیا تھا نہ انکار۔ جس نے کوئی فلاسفی نہیں دی تھی، صرف نروان کی بات کی تھی۔ Peace without Peace within! اجارہ داروں نے بدھ ازم میں بھی رہبانیت کی رسم چلا دی اور خود اتھارٹی بن بیٹھے۔ بدھ کے بھکشو براہمن بن گئے۔

اسلام میں رہبانیت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اسلام نے مکمل طور پر مساوات دی ہے۔ لیکن اسلام میں اجارہ دار آ پہنچے۔ سیانے کہتے ہیں، جہاں گڑ ہو گا، وہاں چیونٹے آ پہنچیں گے۔ اسلام جیسے سادہ اور صاف مذہب کو اجارہ داروں نے اپنے مفاد کے لیے، اپنی برتری قائم کرنے کے لیے Ritual میں بدل دیا۔

بالشتے نوگزے

اسلام کی سادگی کی بات پر مجھے محمد فاضل یاد آ گیا۔ محمد فاضل جہلم کے کسی گاؤں کا رہنے والا ایک ان پڑھ مسلمان تھا۔ قسمت آزمائی کے لیے وہ کسی نا کسی طور پر یورپ میں جا پہنچا۔ پیرس میں کئی سال رہتا رہا۔ سارا دن ہوٹل میں برتن دھوتا، باورچی خانے میں جھاڑو دیتا، رات کو کسی فٹ پاتھ پر جا کر پڑ رہتا۔

آٹھ دس سال کے بعد پتا چلا کہ محمد فاضل پیرس کے سب سے پوش ہوٹل کا چیف شیف بن گیا ہے۔ شیف باورچی کو کہتے ہیں۔ ہوٹل میں تمام کھانے پکانے کی ذمہ داری شیف پر ہوتی ہے۔ شیف کی تنخواہ ہوٹل کے چیف منیجر کے برابر ہوتی ہے۔

میں فاضل کو جانتا تھا۔ یہ خبر سن کر کہ وہ پیرس کے ایک پوش ہوٹل کا شیف بن گیا ہے، مجھے یقین نہ آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک جہلمی ان پڑھ جوان چند سالوں میں اتنے اونچے مقام پر پہنچ جائے۔

میں نے اپنے فارن آفس کے دوست سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ان پڑھ شخص ہوٹل کا شیف بن جائے۔

میرا دوست ہنسا، کہنے لگا: ''مفتی! پاکستانی عجیب قوم ہے۔ یہاں ست الوجود ہوتے ہیں، جذباتی ہوتے ہیں، منافقت اور کرپشن میں لت پت ہوتے ہیں۔ مغربی ممالک میں جا کر پتا نہیں انھیں کیا ہو جاتا ہے، جن بن جاتے ہیں۔ ہمارے ایک رشتہ دار گئے تھے۔ چار سال وہاں رل رل کر جئے اور اب دو ہوٹلوں کے مالک ہیں۔ سندھ کی ایک مُنیار کسی صاحب حیثیت کی میڈ کی حیثیت سے گئی تھی۔ اب وہ ایک کروڑ پتی لارڈ کی بیگم ہے۔ اس

کے لیے تازہ پان کراچی سے جاتے ہیں۔ کتھ ہندوستان سے جاتا ہے۔ آم پاکستان سے جاتے ہیں۔ پاپڑ اور وڑیاں بھارت سے جاتی ہیں۔ محل میں رہتی ہے، چار نوکر ہیں۔ سفر کے لیے اپنا ہیلی کاپٹر ہے۔''

وہ ہنسنے لگا، بولا: ''یہ پاکستانی قوم عجب مخلوق ہے۔ بیک وقت بالشتے بھی ہیں، نو گزے بھی۔''

ہانڈی

کچھ دنوں کے بعد پتا چلا کہ فاضل چھٹی پر گاؤں آیا ہوا ہے۔ میں اس سے ملنے کے لیے گاؤں چلا گیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ باتوں کے دوران میں نے پوچھا: ''فاضل! کیا واقعی تو ہوٹل میں شیف ہے؟''

وہ ہنسا اور بولا: ہاں شیف تھا۔ چار سال شیف کا کام کیا۔ اب میں نے ہوٹل خرید لیا ہے۔''

میں نے پوچھا: ''یہ بتا کہ تو کون کون سے کھانے پکانا جانتا ہے؟''

بولا: ''سب ...... انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، چینی، روسی، عربی...... سب کھانے۔ ہر ملک کی ڈش پکانا جانتا ہوں۔''

میں نے کہا: ''یہ بتا کہ سب سے عمدہ ڈش کون سی ہے؟''

ایک منٹ کے لیے اس نے توقف کیا۔ سوچنے لگا۔ پھر بولا: ''سچی بات پوچھتے ہو تو دنیا کی کوئی ڈش ہماری ہانڈی روٹی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

''ہانڈی روٹی کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بولا: ''یہی ہانڈی روٹی جو ہم پکاتے ہیں۔''

حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

کہنے لگا: ''مفتی جی! ذرا سوچو وہ کتنا بڑا آدمی تھا جس نے ہانڈی رائج کی۔ آج صدیوں کے بعد یورپ والوں کو احساس ہوا ہے کہ ہمیں بیلینسڈ فوڈ کھانی چاہیے۔ ہانڈی

کے موجد نے صدیاں پہلے اس بات کو جان کر ہانڈی ایجاد کی تھی جو بیلینسڈ فوڈ کی بہترین شکل ہے۔ ہانڈی میں شوربہ ہوتا ہے، گوشت ہوتا ہے، سبزی ہوتی ہے، جرے سائیڈل ہوتے ہیں، مرچ ہوتی ہے، ہلدی ہوتی ہے، ادرک ہوتا ہے، پیاز ہوتا ہے، ٹانکس ہوتی ہیں۔ ہمیں آج پتا چلا ہے کہ لہسن دل کے لیے کتنی بڑی ٹانک ہے۔ ہانڈی کے موجد کو یہ راز صدیاں پہلے معلوم ہوگیا تھا۔ پھر مصالحے میں بڑی الائچی، چھوٹی الائچی، دار چینی، کالی مرچ۔ ابھی تک ہمیں علم نہیں کہ ان چیزوں کے کیا خواص ہیں۔ وہ ہمارے جسم کے لیے کس قدر مفید ہیں۔'' وہ رک گیا۔

پھر بولا: 'بھائی جی! ہانڈی صرف بیلینسڈ فوڈ ہی نہیں، اس میں جو ذائقہ ہے، چٹخارہ ہے، اس کا جواب نہیں۔ مغرب والے پھیکی بے سواد ڈشیں کھاتے ہیں، انھیں کھانے کی تمیز نہیں۔''

مٹی اور لذت

''پھر ایک اور بات ہے جس میں ہانڈی کا جواب نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ بولا:
''جب میں شیف تھا تو ایک روز میں نے ہوٹل کے مالک سے کہا، 'صاحب جی! باورچی خانے میں پکیرے کے لیے برتن چاہئیں۔' وہ حیران ہوا۔ بولا: 'باورچی خانے میں پکیرے کے لیے برتن تو سب نئے ہیں۔ ہر برتن کے چار چار سیٹ ہیں۔ کسی برتن کی کمی نہیں ہے۔''

''ہاں کسی برتن کی کمی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر تم کون سا برتن مانگتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا: ''صاحب جی! میں ایسے برتن مانگتا ہوں جن میں پکائے ہوئے کھانوں میں چار گنا لذت بڑھ جائے گی۔'' اس نے میری بات سمجھی نہیں لیکن مان لی۔ چونکہ یہ مغرب والے ہیں، یہ کھانے میں پیوریٹی کو مانتے ہیں، نفاست کو مانتے ہیں۔ انھیں لذت کا شعور ہی نہیں ہے۔ خیر جب میں نے اسے بتایا کہ صاحب جی! مجھے ایسے برتن چاہئیں جو مٹی کے بنے ہوئے ہوں تو اس کا ذہن فیوز ہوگیا۔''

میں فاضل کی بات سن کر خود حیران ہوا۔ میں نے پوچھا: ''تو کیا تم نے وہاں مٹی کے برتن بنوائے؟''

فاضل بولا: ''بھائی! جو لذت مٹی کے برتن کے پکیرے میں ہوتی ہے، وہ کسی اور برتن میں نہیں ہوتی۔ مٹی کی ہانڈی میں کھروڑے ڈال دو، نیچے ہلکی آنچ جلا دو، ساری رات پکنے دو۔ صبح اس میں جو لذت پیدا ہو جاتی ہے، اس کا جواب نہیں۔ پتا نہیں مٹی کنٹرولڈ ہیٹ پیدا کرتی ہے یا کیا؟ بس لذت ہی لذت ہو جاتی ہے۔ صرف گوشت ہی نہیں، ثابت ماش پکالو، حلیم پکالو، چنے پکالو، اوجھری پکالو۔''

''مٹی کے برتنوں کی وجہ سے کیا فرق پڑا؟'' میں نے پوچھا۔

بولا: ''میں نے لوگوں کو لذت کی لت ڈال دی۔ وہ وہ ہانڈیاں پکائیں کہ گوروں کے منہ میں رال چل پڑی۔ بس جی! میں نے وہاں ایک بات سیکھی ہے کہ کھانوں میں ہانڈی اور مذہبوں میں اسلام، دونوں کا جواب نہیں۔''

''ارے!'' میں حیرت سے چلّایا۔ ''ہانڈی اور اسلام کا کیا جوڑ ہے؟''

وہ بولا: ''بھائی صاحب! ہانڈی بیلینسڈ فوڈ ہے، اسلام بیلینسڈ مذہب ہے۔ اسلام میں ہانڈی کی سب خوبیاں موجود ہیں۔ دنیا بھی ہے، اللہ بھی ہے، اس کی مخلوق بھی ہے، خدمت بھی ہے، مخدومی بھی ہے، محبت بھی ہے، جہاد بھی ہے، انتقام بھی ہے، رحم بھی ہے، معافی بھی ہے، سزا بھی ہے۔ کیا بیلینسڈ مذہب ہے بھائی جی! دنیا سے بھی تعلق قائم رہے، اللہ سے بھی تعلق قائم رہے۔ کماؤ کماؤ دولت کے ڈھیر لگا دو، مگر پھر بانٹ کر کھاؤ۔ اپنے لیے بنگلہ بناؤ تو کسی غریب کے لیے ایک جھونپڑا بنا دو۔ اپنے لیے ریشمی سوٹ بناؤ تو کسی حاجت مند کے لیے کھدر کا جوڑا بنوا دو۔ اپنے بیٹے کی فیس دو تو کسی غریب طالب علم کی فیس بھی ادا کر دو۔

فاضل جذباتی ہوگیا۔ کہنے لگا: ''اسلام بھی کیا مذہب ہے! بے شک دولت کی ریل پیل ہو لیکن دولت ایک جگہ ڈھیر نہ ہو، چلتی پھرتی رہے۔ بانٹنا سیکھ لو تو سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں ہوتا۔''

فاضل سے مل کر میں واپس آ رہا تھا تو میرے ذہن میں کھتر پھتر ہو رہی تھی۔ فاضل کے ذہن میں اسلام کی تصویر کتنی سادہ تھی لیکن ہمارے راہبروں نے خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں۔

گھر پہنچا تو ڈاکٹر بیلا میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی چلّایا: ''کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''جھوٹ۔'' وہ بولا: ''تمھارے اندر تو کھچڑی پک رہی ہے، غدر مچا ہوا ہے اور تم کہتے ہو کچھ بھی نہیں۔''

میں نے کہا ''پیرس کے ایک باورچی کی باتیں سن کر آیا ہوں۔ کہتا ہے دنیا میں دو چیزیں لاجواب ہیں۔ کھانوں میں ہانڈی اور مذہبوں میں اسلام۔''

''ارے!'' وہ ہنسا: ''ہانڈی کا کیا مطلب؟''

میں نے کہا: ''ہماری ہانڈی مٹی کی جس میں ہم آلو گوشت پکاتے ہیں، کدو گوشت پکاتے ہیں، وہ ہانڈی۔''

''بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' بیلا نے کہا۔

میں نے تفصیل سے اسے بات بتائی۔

کہنے لگا: ''یار جب ہم میڈیکل کالجوں میں تھے تو وہاں ایک پروفیسر تھا، ڈاکٹر جدون! وہ بھی ہانڈی کا بڑا قائل تھا۔ اس کے گھر میں کھانا مٹی کی ہانڈی میں پکتا تھا اور وہ کچے گھڑے سے پانی پیتا تھا۔ کہتا تھا مٹی کا گھڑا پانی کی سب Impurities کو چوس لیتا ہے۔ عجب خیالات تھے اس کے۔ بڑا پڑھا لکھا تھا۔ یورپ اور امریکا میں پندرہ سال گزار کر آیا تھا۔ ہم اسے جدون کے بجائے پروفیسر جنون کہا کرتے تھے۔ وہ عجیب باتیں بتایا کرتا تھا۔''

ڈاکٹر بیلا ہنسنے لگا۔ بولا: ''ان دنوں ہم بھی اسے جنونی سمجھے تھے۔''

''کہتا کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

بولا: ''کہتا تھا کہ اگر اللہ پر سچے دل سے ایمان لے آؤ تو تم پچاس فی صد بیماریوں

سے Immune ہو جاتے ہو۔ مطلب ہے کہ پچاس فی صد بیماریوں سے محفوظ ہو جاتے ہو اور کہتا تھا، اگر اللہ سے تعلق پیدا کر لو تو پھر تم میں اتنی Resistance پیدا ہو جاتی ہے کہ بیماری حملہ کرے تو بھی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''حیران کن بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''جب حیران کن تھی، اب نہیں۔'' بیلا نے کہا: ''پروفیشن میں آنے کے بعد بڑے راز کھل جاتے ہیں۔'' وہ ہنسنے لگا، پھر بولا: ''پروفیسر جنون کبھی موڈ میں آتا تو کھل کر دل کی بات کیا کرتا تھا۔ کہتا تھا: ''بوائز! ہم بڑے احمق ہیں جو ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ جسم بیماری جنریٹ کرتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ جسم نہیں، ذہن بیماری جنریٹ کرتا ہے۔ ہم صرف ظاہری اعضاء کو اہمیت دیتے ہیں...... دل، جگر، پھیپھڑے، گردے، وہ اعضا جو ذہنی خیالات اور جذبات سے activate ہوتے ہیں، وہ ڈھکے چھپے ہیں۔ مثلاً غدود ہیں، جھلیاں ہیں، نسیں ہیں۔ ان سے عجیب و غریب قسم کی رطوبتیں نکلتی ہیں جو ہماری صحت پر اثر رکھتی ہیں۔''

پرفیسر کہا کرتا تھا: ''جدید سائنس کے مطابق اب یہ بات طے شدہ ہے کہ انسانی جذبات میں سب سے زیادہ اثر کرنے والا بنیادی جذبہ خوف ہے۔ پھر خوف کے بچونگڑے ہیں جس طرح شیطان کے شتونگڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً کشمکش ہے، انگزائٹی، وہم، فکر، تذبذب ہیں۔ یہ سب جذبات انسان کے معدے پر اثر رکھتے ہیں۔ تیزابیت پیدا کرتے ہیں۔ السر بناتے ہیں۔ اگر ایک اللہ پر یقین کامل ہو، اگر دل میں یہ یقین ہو کہ نہیں کوئی خوف اور نہیں کوئی قوت ماسوائے اللہ کے، تو انسان ان Irrational fears سے نجات پا جاتا ہے۔''

پرفیسر جدون کہا کرتا تھا کہ ''اللہ ایک سرہانہ ہے جس پر سر رکھ دو تو تم ان پریشانیوں اور ڈب جھلکوں سے آزاد ہو جاتے ہو اور اسلام کیا ہے؟ اسلام انسان کو منفی خیالات سے محفوظ رکھتا ہے۔ شر سے بچاتا ہے۔ نفرت، غصہ، دشمنی، انتقام، حسد جیسے منفی جذبات سے محفوظ رکھتا ہے۔ منفی جذبات ہمارے جسم کے غدودوں سے زہریلی رطوبات خارج کرتے ہیں۔ اس کے برعکس محبت، خدمت، ہمدردی ایسے مثبت جذبات صحت مند رطوبات پیدا

کرتے ہیں۔"

بیلا کی باتیں سن کر میں مزید سوچوں میں پڑ گیا۔ پتا نہیں ہمارے رہبر ہم میں خوف کا جذبہ کیوں پیدا کرتے ہیں۔ کیوں منفی باتوں پر زور دیتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اس بے پایاں حسن کی بات نہیں کی جو دنیا میں ہمارے گرد چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس خیر کے جذبے کی بات نہیں کرتے جو انسان کے دل میں جاگزیں ہے۔ اس رحمت، کرم اور ان نعمتوں کی بات نہیں کرتے جو اللہ نے ہمیں عطا کر رکھی ہیں۔ اس شرف کی بات نہیں کرتے جو باری تعالیٰ نے انسان کو عطا کر رکھا ہے۔

صاحبو! قرآن کے متعلق صاحب نظر بزرگ کہتے ہیں کہ وہ گلاب کے پھول کے مصداق ہے۔ اوپر کی پتی اٹھاؤ تو نیچے سے ایک اور پتی نکل آتی ہے۔ نچلی پتی کو اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے ایک اور پتی نکل آتی ہے۔ پتی کے نیچے پتی، پتی کے نیچے پتی، پتی کے نیچے پتی۔ ایسے ہی قرآن پاک میں مفہوم در مفہوم ہیں۔ جتنا غور کرو، اتنا گہرا مفہوم...... لیکن ہمارے راہبر صرف اوپر کے مفہوم کو آخری مفہوم سمجھتے ہیں اور اس کا ڈنکا بجاتے رہتے ہیں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ بار بار فرماتے ہیں کہ ہماری کائنات کو دیکھو۔ سرسری طور پر نہیں، غور سے دیکھو۔ خالی دیکھو نہیں، فکر کرو، سمجھو۔ پھر دیکھو اور سوچو، پھر دیکھو اور سوچو۔ قرآن کو پڑھو، سرسری طور پر نہیں، غور و فکر سے پڑھو اور سمجھو۔ پھر پڑھو اور سمجھو۔ پھر وہ لمحہ آئے گا کہ تم قرآن کے اشارات کے حوالے سے کائنات کے راز پالو گے۔

ہمارے راہبروں میں کائنات پر غور و فکر کرنے اور کائنات کے راز پانے کی خواہش نہیں ہے۔ انھیں قرآن کو سمجھنے کی خواہش نہیں ہے۔ وہ تو صرف قرآن کی تلاوت کرنے کے خواہش مند ہیں، صرف اس لیے کہ ثواب کمائیں۔ بہشت کے حق دار ہو جائیں۔ دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں۔ پھلدار درختوں کی ٹہنیاں اشارے سے نیچے ہو جاویں اور پھر خوب صورت حوریں......

صاحبو! قرآن ایک حیرت انگیز کتاب ہے۔ ایسی کتاب جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آج دنیا بھر کی لائبریریاں کتابوں سے بھری ہوئی ہیں۔ علم کے ہر شعبہ پر ہزاروں کتابیں

موجود ہیں۔ مذہبی کتابیں، سائنس کی کتابیں، فنی کتابیں۔ ان لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابوں میں ایک کتاب بھی قرآن جیسی نہیں ہے۔ قرآن کا رویہ انوکھا ہے۔ اس کے موضوعات انوکھے ہیں۔ اس کے اشارے انوکھے ہیں۔

ہم عام مسلمان سمجھتے ہیں کہ قرآن اسلامی کتاب ہے۔ قرآن میں باری تعالیٰ مسلمانوں سے مخاطب ہے۔ نہیں، ایسا نہیں۔ یہ کتاب تو بنی نوع انسان سے مخاطب ہے۔ ایسے ہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار صرف مسلمانوں کے لیے ہی مثالی کردار نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لیے مثالی کردار ہے۔

ہم عام مسلمان سمجھتے ہیں کہ قرآن مذہبی کتاب ہے۔ یہ ہماری کوتاہ فہمی ہے۔ قرآن تو کائناتی کتاب ہے۔ اس میں کائنات کے رموز و اسرار پر اشارے ہیں۔ سائنسی تحقیق پر اشارے ہیں جو بیک وقت ظاہر بھی ہیں، مخفی بھی ہیں۔ قرآن کے اشارات کائناتی بھیدوں کا راستہ تلاش کرنے پر ہمیں اکساتے ہیں، راستہ دکھاتے ہیں۔ قرآن تاریخی کتاب ہے۔ اس میں وہ واقعات درج ہیں جو تاریخ ریکارڈ کرنے کے زمانے سے پہلے وقوع پذیر ہوئے تھے۔

قرآن اخلاقیات کی کتاب ہے، جس میں انسانی برتاؤ ہیں، اخلاق کے اصول درج ہیں۔ قرآن صحت عامہ کی کتاب ہے، جس میں حفظان صحت کے اصول درج ہیں اور ادویات کا تذکرہ ہے، ایسی ادویات جو ہمیشہ کے لیے شفا بخش ثابت ہوتی ہیں۔

برسبیل تذکرہ، صاحبو! آج کے اخبار میں ایک حیران کن خبر درج ہے۔ پی آئی ایم ایس ہسپتال میں ایک جھلسی ہوئی مریضہ آئی۔ چولہا پھٹنے کی وجہ سے اس کا چہرہ جھلس کر مسخ ہو چکا تھا، جسم جھلس گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ انھوں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا۔ شہر سے ایک خاتون آئی جو قرآنی ادویات کی قائل تھی۔ اس نے ڈاکٹروں سے کہا: "آپ مریضہ کی زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کا علاج کروں۔"

ڈاکٹروں نے اجازت دے دی۔ خاتون نے مریضہ کے چہرے اور جسم پر شہد کا لیپ

کر دیا۔ تین دن وہ لیپ کرتی رہی۔ مریضہ میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ بچ گئی اور اب اس کا جسم اور چہرہ رو بہ صحت ہے۔ صاحبو! قرآن کا جواب نہیں۔ جواب کیسے ہو! یہ اللہ کا کلام ہے، لاشریک اللہ کا، قادر مطلق اللہ کا۔

اللہ کا بھی جواب نہیں۔ اللہ بیک وقت محبوب بھی ہے..... بہت بڑا محبوب۔ کہتا ہے میری طرف دیکھو، میری بات کرو، میرا نام جپو، مجھ سے یارانہ لگاؤ، میرے عشق میں سرشار رہو۔

اللہ بیک وقت محبوب بھی ہے اور عاشق بھی ہے۔ وہ اپنی مخلوق سے پیار کرتا ہے۔ ہر ذی روح کا خیال رکھتا ہے۔ لاڈ لڈاتا ہے، کھلاتا ہے، پلاتا ہے۔ کسی کو تکلیف نہ ہو، رزق ملتا رہے، نعمتوں کی بارش ہوتی رہے۔ یہ عاشق اپنی مخلوق پر بکا ہوا ہے، در پردہ۔

صاحبو! میں نئی نسل کا ایک نوجوان ہوں۔ مغربی لٹریچر پر پلا ہوں، مغرب زدہ ہوں۔ مغربی فیشن کا دلدادہ ہوں، پہناوے میں بھی، خیالات میں بھی۔ مزاج کا سیکولر ہوں۔ مجھے سیکولرازم کے مفہوم کا پورے طور پر شعور نہیں ہے۔ صرف چالو معنے سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ مذہب برائے نام چیز ہے، اہم نہیں۔ اس کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ اللہ کو مانتا ہوں، منہ زبانی، ہے، ہوگا، کیا فرق پڑتا ہے۔

محترم علمائے دین! اللہ کے واسطے مجھے رد نہ کیجیے۔ مجھ پر لاحول نہ پڑھیے۔ مجھے ملحد یا کافر نہ سمجھئے۔ مجھ سے نفرت نہ کیجیے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے، میں آپ کی ہمدردی کا مستحق ہوں۔ آپ کی توجہ کا محتاج ہوں۔

کھچڑا کلچر کا جھکڑ

عالی جاہ! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ جو کوک، کلاشنکوف، پاپ اور ڈش انٹینا تہذیب کا جھکڑ چل رہا ہے، جس سے دنیا بھر کے نوجوان بری طرح سے متاثر ہو رہے ہیں، یہ جھکڑ اہل مغرب کا چلایا ہوا ہے اور یہ جھکڑ اسلام کے خلاف ایک سازش ہے۔ آپ کا یہ خیال سراسر تعصب پر مبنی ہے۔ اس جھکڑ کی وجہ سے تو تمام یورپی ممالک خود زچ ہوئے بیٹھے ہیں۔ سوچ

رہے ہیں کہ کس طرح اس Mass Culture یعنی کھچڑا کلچر کی دھول سے خود کو بچائیں کیونکہ ان کا اپنا کلچر اس دھول کی تہہ تلے دب کر رہ گیا ہے۔

عالی جاہ! یقین کیجیے، آج کے نوجوان جو اس جھکڑ کی زد میں آئے ہوئے ہیں، خود مظلوم ہیں۔ بالکل ایسے جیسے برسات میں چیونٹوں کو پر لگ جاتے ہیں اور وہ شمع کے گرد چکر لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ جھکڑ خود قدرت نے چلایا ہو اور اس کا کچھ مقصد ہو۔ صاحبو! قدرت بڑی چالاک ہے۔ سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو ٹیڑھی انگلی استعمال کرتی ہے۔ ایکشن سے کام نہ چلے تو ری ایکشن سے چلاتی ہے۔ ہمارے ایک مزاحیہ شاعر تھے، نذیر شیخ۔ ذات کے سائنس دان تھے لیکن کیا خوب مزاح لکھتے تھے کیونکہ تھے صاحب نظر۔ انھوں نے اس جھکڑ پر ایک نظم لکھی ہے۔ علامتی نظم ہے، آندھی کے عنوان سے۔ لکھتے ہیں:

کھڑکی کھڑکے سرکی سرکے پھڑکے روشندان
ناکہ بندی کرتے کرتے گھر سب ریگستان
ٹوٹے پھوٹے چھپر آئیں گھٹتے گھٹتے سانس
پیروں سے چمگادڑ چمٹے سر پر کھڑکیں بانس
جھاڑو جھاڑن موج منائیں ان کا اپنا راج
پیپا بیٹھا ڈھول بجائے کتھک ناچے چھاج
درہم برہم سب تصویریں طرفہ تر احوال
مرزا غالب الٹے لٹکیں سجدے میں اقبال
چھت پر ہم جو بستر ڈھونڈیں عقل ہماری دنگ
کھاٹ بچاری اڑن کھٹولا بستر دور پتنگ۔
لڑکا لڑکی قسما قسمی جیون جیون ساتھ
جھکڑ ایسا تھپڑ مارے دونوں چھوڑیں ہاتھ
دائیں موڑو بائیں جائے موڑ کھائے جھول
آندھی سیدھی راہ بتائے دنیا ڈانواں ڈول

منزل غائب راستہ اندھا کیسے مانے بات
تانگے والا چابک مارے گھوڑا مارے لات
بکھری بکھری داڑھی دیکھی اڑتی اڑتی مونچھ
جتنا دابیں پنکھ پکھیرو اتنی اچھلے پونچھ
ساڑھی کھینچے چولی جھپٹے دھوبی باندھے پوٹ
پنکھ لگا کر اڑتے جائیں لہنگا پیٹی کوٹ
اڑی پھرتی جھاڑی پکڑے لوگوں کی شلوار
جب تک وہ شلوار چھڑائیں رخصت ہو دستار
دنیا ساری بھوت بنی ہے گورا کالا ایک
بنئے نے جب دھنیا تولا مرچ مسالہ ایک

میرے راہبر بچانا نہیں جانتے

یقین جانئے! ہم مغرب زدہ نوجوان اس جھکڑ کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ علمائے دین کا فرض ہے کہ ہمیں بچائیں۔ دقت یہ ہے کہ علمائے دین رد کرنا جانتے ہیں، مورد الزام ٹھہرانا جانتے ہیں، تنقید کرنا جانتے ہیں، بچانا نہیں جانتے۔ ان میں مشنری سپرٹ نہیں ہے۔ مشنری سپرٹ وعظ کرنے، تقریریں جھاڑنے، سرزنش کرنے میں نہیں ہوتی بلکہ جذبہء ہمدردی سے خدمت کرنے میں ہوتی ہے۔ مجھے اس جھکڑ سے بچانے کے لیے وہ کہیں گے، دیکھو یہ کافرانہ پہناوا چھوڑ دو، داڑھی رکھ لو اور باقاعدہ پانچ وقت نماز پڑھا کرو۔

ہمارے راہبر کتنے معصوم ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز پڑھنے سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ہم نماز کی عظمت کو مانتے ہیں لیکن ہمارے راہبروں نے اسلام کو صرف نماز تک محدود کر رکھا ہے۔ حضور اعلیٰ ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کریں، جو اسلام جیتے تھے تو پتا چلتا ہے کہ اسلام میں نماز کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، بہت کچھ۔

علمائے نفسیات کا کہنا ہے کہ راہبر اس لیے نماز کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ نماز مسجد کی طرف متوجہ کرتی ہے اور مسجد پر مولوی صاحب حکمران ہے۔ مقصد انا کی تقویت ہے، اجارہ داری کا حصول ہے۔ علمائے نفسیات کی یہ بات وزن رکھتی ہے۔

آج کے نوجوان کو اگر اس جھکڑ سے نکالنا مقصود ہے تو پہلے دل میں اس کے لیے ہمدردیاں پیدا کرو۔

مان کرنا

اس کے دل میں اسلام کی عظمت کا شعور پیدا کرو۔ اسلام پر مان کرنا سکھاؤ۔ اسے بتاؤ کہ اسلام نے کتنی صدیاں آدھی دنیا پر حکومت کی۔ مغربی اقوام کو پڑھنا لکھنا سکھایا، انھیں سائنسی تحقیق کا راستہ دکھایا۔ علم کی عظمت کا سبق پڑھایا۔ حکومت کرنے کا انداز سکھایا، عدل وانصاف کا شعور پیدا کیا۔

آج کا نوجوان بے خبر ہے۔ وہ تو دیکھ رہا ہے کہ مسلمان ان پڑھ ہیں۔ علوم سے عاری، زبوں حال، چاروں طرف سے پٹ رہے ہیں۔ افراق تفریق کے شکار ہیں۔ مذہبی جنون میں لت پت، منافق، کرپٹ۔ اس لیے وہ اسلام سے مایوس ہے، شرمندہ ہے۔ مسلمان ہونے پر معذرت خواہ ہے۔

کیوں نہ معذرت خواہ ہو! اس لیے کہ وہ راندۂ درگاہ ہے۔ جن کا فرض تھا کہ اسے راستہ دکھائیں، اسے اپنائیں، عزت دیں، وہ خود برہمن بنے ہوئے ہیں اور عام مسلمانوں کو ہریجن سمجھتے ہیں۔ وہ خود کو مومن سمجھتے ہیں اور کلمہ گو مسلمان کو اسلام پسند۔ مسلمان نہیں، اسلام پسند۔ ہمارے راہبر Vanity of Learning اور Vanity of Piety کے دو آتشہ تفاخر میں خدا بنے بیٹھے ہیں۔

صاحبو! آج کے نوجوان کے اندر کے مسلمان کو جگاؤ۔ اسے بتاؤ کہ اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں، Ritual ہی نہیں اور ورثہ ہی نہیں ہے۔ اسلام تو ایک عظیم انقلاب کا نام ہے۔ ذہنی انقلاب، کرداری انقلاب۔ اسلام ایک عظیم تہذیب کا نام ہے جس نے انسان کو

ایسا شرف بخشا جو پہلے کسی مذہب نے نہ بخشا تھا۔ جس نے عوام کو وہ وہ حقوق عطا کیے جو آج تک کسی تہذیب نے عطا نہیں کیے۔

اسلام کے تحت ایسے عظیم کردار پیدا ہوئے جن کی مثال نہیں ملتی۔

اسلامی مساوات

میرے پیارے نوجوان دوستو! مجھے اجازت دو کہ میں تاریخ عالم سے ایک دو مثالیں پیش کروں۔

ایک مسلمان بادشاہ جو آدھی دنیا پر حکومت کرتا تھا، اپنے ایک غلام کے ساتھ سفر پر جاتا ہے۔ سواری صرف ایک ہے۔ بادشاہ اور غلام باری باری اونٹ پر بیٹھتے ہیں۔ بادشاہ اونٹ پر بیٹھتا ہے تو غلام اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل چلتا ہے، پھر غلام کی باری آتی ہے تو غلام اونٹ پر بیٹھتا ہے اور بادشاہ اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل چلتا ہے۔

بولو میرے پیارے نوجوانو! کیا تاریخ عالم میں ایسی مساوات کی کوئی مثال ملتی ہے۔

یہ مساوات اسلام کا عطیہ ہے۔

تاریخ ایک اور مسلمان بادشاہ کا قصہ سناتی ہے۔

یہ بادشاہ ذاتی اخراجات کے لیے سرکاری خزانے سے پیسہ لینا گناہ سمجھتا تھا۔ وہ انتظامی امور سے فارغ ہو کر قرآن حکیم کی آیات کی کتابت کرتا تھا اور پھر اسے کسی ناشر کے ہاتھ بیچ کر جو رقم حاصل ہوتی، اس سے اپنے اور متعلقین کے لیے روٹی خرید کر کھاتا تھا۔

بولو میرے پیارو! کیا کسی ملک میں کسی تہذیب نے دیانت کی ایسی مثال پیش کی ہے؟ کیا ہمارے لیے یہ فخر کی بات نہیں کہ ہم اس مذہب کے پیروکار ہیں جس نے ایسے عظیم کردار تخلیق کیے۔

گجری

اس بات پر مجھے گجری یاد آ گئی۔

یہ قیام پاکستان سے بہت پہلے کی بات ہے۔

ان دنوں ہم پر انگریزوں کا راج تھا۔

گجری ہماری بھنگن تھی، لیکن مجھے علم نہ تھا کہ گجری عیسائی ہے۔ ایک روز میں نے گجری سے پوچھا، گجری تیری ذات کیا ہے؟ یہ سن کر گجری نے ٹوکری نیچے رکھ دی۔ جھاڑو پرے پھینک دیا۔ پھر وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ گردن کو ایک باوقار خم دیا اور بولی، میری جات وہ ہے جو پادشاہ کی ہے۔ صاحبو! میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں اپنی ٹوکری نیچے رکھ دوں، جھاڑو دور پھینک دوں، پھر تن کر کھڑا ہو جاؤں اور فخر سے کہوں، لوگو! میری جات وہ ہے جو دو جہانوں کے بادشاہ کی ہے۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔

اسلام نے ایسے ایسے عظیم کردار پیدا کیے ہیں جن کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ مثلاً آج کے مغرب زدہ نوجوان کو اس مسلمان بادشاہ کا قصہ سناؤ جس نے اپنے محل میں زنجیر عدل لگا رکھی تھی۔ بادشاہ نے اعلان کر رکھا تھا کہ میری رعایا کے کسی فرد پر ظلم ہو تو وہ آ کر زنجیر عدل کھینچے۔ فریادی زنجیر کھینچتا تو گھنٹیاں بجنے لگتیں اور بادشاہ بہ نفس نفیس آ کر جھروکے میں ایستادہ ہو جاتا اور پوچھتا بول فریادی تم پر کس نے ظلم کیا ہے۔

میں مجرم ہوں

پھر اسے وہ تاریخی قصہ سناؤ جسے سن کر مسلمانوں کی عظمت کا احساس دلوں کو دہلا دیتا ہے۔

مسلمان سپاہ نے افریقہ کے ایک شہر کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے مقتدر لوگوں نے دیکھا کہ اتنی بڑی سپاہ کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا ہار مان لی اور صلح کی درخواست کر دی۔ مسلمان کماندار نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ شہر میں داخل ہو جائیں۔ شہر کے کسی فرد پر زیادتی نہ کی جائے۔ املاک کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ کماندار نے کہا، سپاہیو! اب تم شہر کے فاتح ہو اور فاتحہ کا کام لوٹ مار کرنا نہیں بلکہ مفتوح کی حفاظت کرنا ہے۔

اگلے روز شہر کے مقتدر لوگ کماندار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کہنے لگے، آپ نے ہماری حفاظت کا ذمہ لیا تھا لیکن حفاظت کے بدلے ہماری تذلیل کی گئی ہے۔ شہر کے بڑے

چوک میں ہمارے ایک محبوب لیڈر کا مجسمہ نصب ہے، رات کے اندھیرے میں کسی تخریب کار نے مجسمے کی ناک کاٹ دی ہے۔ یہ کام کوئی شہری تو نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آپ کے کسی سپاہی نے کیا ہے۔ مجرم کو کڑی سزا دی جائے۔

مسلم کماندار نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے بڑے چوک میں جمع ہو جائیں۔

کماندار نے ایک تقریر کی۔ کہنے لگا، ہم نے شہر کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ اہالیان شہر ہم سے عدل و انصاف مانگ رہے ہیں۔ اسلام کی عزت کا سوال ہے۔ لہٰذا میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ جس نے بھی یہ کام کیا ہے، وہ اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور اقبال جرم کر لے۔

کماندار نے تین بار اس اعلان کو دہرایا لیکن کسی سپاہی نے اٹھ کر اقبال جرم نہ کیا۔

اس پر کماندار نے معززین شہر سے کہا کہ ان حالات میں آپ ہم سے ہرجانہ وصول کر لیں۔ جو مطالبہ آپ کریں گے، ہم اسے پورا کریں گے۔ لیکن شہر کے بڑے اس بات پر مصر تھے کہ سر کے بدلے سر، آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک۔

کماندار نے انھیں بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے۔

بالآخر کماندار نے کہا، چونکہ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے، لہٰذا میں اپنی ناک پیش کرتا ہوں۔

کماندار کا فیصلہ سن کر مسلمان سپاہیوں میں احتجاجی شور مچ گیا۔ پھر ایک سپاہی اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا، عالی جاہ! مجھے پہلے ہی اقبال جرم کر لینا چاہیے تھے لیکن ڈر کے مارے چپ رہا۔ اب میں اقبال جرم کرتا ہوں۔ لہٰذا میری ناک کاٹ لی جائے۔

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھے کہ دوسرا سپاہی کھڑا ہوا۔ بولا، جناب! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دراصل مجرم میں ہوں۔ میں نے مجسمے کی ناک توڑی ہے۔ تیسرا سپاہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا، عالی جاہ! یہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ اہالیان شہر نے مسلمان سپاہیوں کا جذبہ ایثار دیکھا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنا مطالبہ چھوڑ دیا۔

یہ تھی عظمت ہمارے اسلاف کی۔ صرف امن میں ہی نہیں، جنگ میں بھی غیر مسلموں کے لیے ان میں اتنی رواداری تھی۔ یہ تھی ایثار، رواداری اور انصاف کی تلوار جس کے زور پر

اسلام پھیلا۔

فتح مکہ

پھر مغرب زدہ نوجوانوں کو جو اہل مغرب کے اس الزام کو درست سمجھتے ہیں کہ مسلمان ایک متعصب اور تشدد پسند مذہب ہے، فتح مکہ کا قصہ سناؤ کہ

جنگ کے بغیر ہی مسلمانوں نے مکے کو فتح کر لیا۔ اہل مکہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

مکہ وہ شہر تھا جہاں کے کفار نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بدسلوکی کی انتہا کر دی تھی۔ حضور ﷺ کا گھر سے باہر نکلنا محال کر دیا تھا۔ باہر نکلتے تو ان پر آوازے کسے جاتے، نامناسب نعرے لگائے جاتے، ان پر پتھروں کی بوچھاڑ کی جاتی، ان کے قتل کے منصوبے بنائے جاتے۔ کفار مکہ کا برتاؤ اس قدر متشدد ہو گیا کہ حضور ﷺ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ کفار مکہ نے ان کا پیچھا کیا۔

آج وہی (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکے کے فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ کفار مکہ کو یقین تھا کہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔ یہی جنگ کا دستور تھا۔

حضور ﷺ کے کردار کی عظمت ملاحظہ ہو کہ آپ نے اعلان کر دیا کہ:

1- کسی عورت یا بچے پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔
2- جو شخص زخمی ہو، معذور ہو یا بیمار ہو، اسے گزند نہ پہنچایا جائے۔
3- جو بھاگ رہا ہو، اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔
4- جو اپنے گھر میں خود کو بند کر لے، اسے قتل نہ کیا جائے۔
5- کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے۔
6- جو شخص ہتھیار پھینک دے، اسے امان دی جائے۔
7- جو شخص خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے، اس پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔
8- جو شخص ابوسفیان یا حکیم ابن حزام کے گھر میں پناہ لے لے، اسے امان دی جائے۔
یہ دونوں شخص اسلام کے بدترین دشمن تھے۔

تبلیغ اسلام کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو حضور ﷺ کے کردار کا درس دیجیے۔ انھیں بتایئے کہ غیر مسلم حتیٰ کہ اسلام کے دشمن بھی حضور ﷺ کے کردار کی عظمت کے معترف ہیں۔

نوجوانوں کو حضور ﷺ کے کردار پر مان کرنا سکھایئے۔ جان لیجیے صاحب کہ جس کے دل میں حضور ﷺ کے کردار پر مان پیدا ہو گیا، وہ اسلام کے راستے پر گامزن ہو گیا۔ ہمارے نوجوانوں کو بتایئے کہ قرآن مذہبی کتاب نہیں۔ قرآن صرف مسلمانوں سے مخاطب نہیں۔ وہ تو بنی نوع انسان سے مخاطب ہے۔

انقلابی کتاب

صاحبو! قرآن ایک انقلابی کتاب ہے۔

جب بھی انقلابی تھی جب چودہ سو سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد آج بھی انقلابی ہے۔ قرآن نے انقلاب کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ تخریبی نہیں، تعمیری طوفان۔ ذہنوں میں سوچوں کا طوفان، دلوں میں جذبات کا طوفان۔

جب قرآن نازل ہوا تو اہل یورپ ابھی رہنا سہنا سیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ابھی سوچ سمجھ کر دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یورپی ممالک میں صرف ایک ملک تھا، یونان جہاں غور و فکر کے چشمے پھوٹے تھے۔ وہاں بڑے بڑے صاحب فکر پیدا ہوئے تھے۔ ارسطو تھا، افلاطون تھا، بطلیموس تھا۔ لیکن یونان کے مفکر سب فلسفی تھے۔ سوچوں کے شیدائی تھے۔ خواب دیکھنے کے متوالے۔ اپنے اپنے خوابوں میں مگن، اپنے اپنے نظریات کے دیوانے۔ ان کے نظریات کے اثرات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

قرآن نے آ کر کہا، بس میاں بس! بہت خواب دیکھ لیے۔ نظریات کے جھن جھنے بہت جھنجھنا لیے۔ سوچوں کی آوارگی چھوڑو۔ اب خواب مت دیکھو، آنکھیں کھولو، حقائق کو دیکھو۔ ہم نے تمھارے اردگرد چاروں طرف حقائق کی بھیڑ لگا رکھی ہے کہ تم دیکھو، سوچو، سمجھو۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا، بھولنا نہیں کہ ہر چیز پر ہماری مہر لگی ہوئی ہے۔ ہر سبز پتے کے پیچھے ہم چھپے بیٹھے ہیں۔ ہر ذرے میں ہمارا پرتو ہے۔ ہر قطرے میں ہماری حکمت ہے۔ ہمارے حوالے کے بغیر نہ دیکھنا۔ ہمارے حوالے سے دیکھو گے تو راستہ ملتا جائے گا۔ منزل پر پہنچو گے۔ ہمارے حوالے سے نہیں دیکھو گے تو بھٹک جاؤ گے، راستہ نہیں ملے گا۔ کبھی پہنچو گے نہیں۔

قرآن نے بند آنکھیں کھولنے کی دعوت دی۔ دیکھنے کی دعوت دی۔ سوچوں کو آوارگی سے نکال کر ایک سمت بخشی، ایک مقصد عطا کیا۔ جمود سے نکالا، حرکت عطا کی۔

قرآن نے انسانی ذہن پر ایسا اثر کیا جیسے نمک کی چٹکی سوڈے کی بوتل پر کرتی ہے۔ بلبلے ہی بلبلے، حرکت ہی حرکت با مقصد حرکت۔ قرآن نے دو نئے نکور تخیل دے کر انسانی جذبات میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ ایک وحدانیت، دوسرے مساوات۔

صاحبو! قرآن کی آمد انسانی ذہن کے لیے ایک دھماکہ تھا۔ ایسا ہی دھماکہ جیسا کائنات کی پیدائش پر ہوا تھا اور جس کے اثرات آج تک جاری و ساری ہیں۔ اس دھماکے کا احوال عظیم مفکروں نے بیان کیا ہے۔ یہ دھماکہ انسانی ذہن میں وقوع پذیر ہوا۔

قرآن نے یوں ابتدا کی کہ اے محمد، پڑھ! ہمارے نام پر پڑھ۔ ہم جو کرم نواز ہیں، رحمت کرنے والے ہیں۔ ہم نے انسان کو قلم عطا کیا اور کہا کہ اسے استعمال کرنا سیکھ اور ہم نے انسان کو علم عطا کیا۔ قرآن نے انسان کو فکر کرنے کی دعوت دی۔ سوچ، مظاہر فطرت پر غور کر۔ آسمان اور زمین کیسے تخلیق کیے گئے؟ موسم کیوں بدلتے ہیں؟ رات اور دن کا چکر کیا ہے؟

سوچ، بادل کیا ہیں؟ ہوائیں کیسے چلتی ہیں؟ سورج، چاند اور ستارے کیوں حرکت میں ہیں؟

قرآن کہتا ہے سوچ، فکر کر کہ پیدائش کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ بوٹے سرسبز ہو جاتے ہیں، سوکھ جاتے ہیں، کیوں؟ سوچ کہ بھور سمے کیا ہے؟ سورج غروب کیوں ہوتا ہے؟ پہاڑ کیوں کھڑے ہیں؟ ندیاں کیوں چلتی ہیں؟ سمندروں پر کشتیاں کیسے چلتی ہیں؟ آسمان پر تارے کیوں ٹمٹماتے ہیں؟ سوچ کہ روح کی لطافتیں، جسم کی لذتوں سے کیوں افضل ہیں؟

قرآن نے کہا، علم تین قسم کا ہے۔ ایک وہ جس کا مشاہدہ کیا ہو، جو دوسروں پر بیتا ہو۔ دوسرا وہ جو خود پر بیتا ہو اور تیسرا وہ جو تجربے سے سمجھا ہو۔

قرآن کی انقلابی تعلیم کے متعلق Dutsch کہتا ہے: ''قرآن وہ انقلابی کتاب ہے جس کے زور پر مسلمانوں نے یورپ میں آ کر علم کے دیئے سے اس علاقے کو منور کر دیا۔ انھوں نے اہل مغرب کو سائنسی رویے اور سائنسی تحقیق سے آشنا کیا اور یوں جدید علوم کی بنیاد رکھ دی۔''

عقل اور علم کے بارے میں حضور اعلی ﷺ نے فرمایا کہ پہلی چیز جو تخلیق کی گئی، عقل تھی اور باری تعالیٰ نے عقل سے بہتر کوئی چیز تخلیق نہیں کی۔

آپ ﷺ نے فرمایا، جو شخص علم کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے، درحقیقت وہ اللہ کے راستے پر گامزن ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا، علم حاصل کرو۔ پھر تمھیں صحیح اور غلط راستے کی تمیز ہو جائے گی۔ علم بہشت کے راستے کی روشنی ہے۔ علم خوشی اور سکھ کا راستہ بتاتا ہے اور مشکل میں صبر کی توفیق عطا کرتا ہے۔ علم صحرا میں ہمارا مونس و غمخوار بن جاتا ہے۔ علم دوستی میں ایک زیور ہے اور دشمنی میں حفاظتی زرہ بکتر۔ علم تنہائی میں ساتھی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا، وہ شخص جو علم کا ذکر کرتا ہے، دراصل اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ جو علم حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، وہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ جو اس کی تبلیغ کرتا ہے، وہ گویا خیرات کرتا ہے اور جو دوسروں کو علم سکھاتا ہے، اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، عالموں کی باتیں سننا اور ان کی صحبت میں وقت گزارنا عبادت سے بہتر ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا، جو عالموں کی قدر کرتا ہے، دراصل میری عزت کرتا ہے۔

عالم کی دوات کی روشنائی مجاہد کے خون سے زیادہ متبرک ہے۔ قرآن نے عقل، علم اور تحقیق کو اہمیت دے کر ایک عظیم ذہنی انقلاب برپا کر دیا ہے۔

میرے پیارے محترم علمائے دین! اس خوش فہمی میں نہ رہیے کہ قرآن کا علم سے

مطلب علم دین ہے۔ نہیں میرے محترم! یہ بات نہیں۔ دین علم نہیں ہوتا بلکہ عمل ہوتا ہے۔ علم سے قرآن کا مطلب فزیکل علوم ہیں۔

اس سے پہلے کسی مذہب نے عقل و خرد، زندگی اور کائنات کو اہمیت نہ دی تھی۔ تمام مذاہب کی بنیاد توہمات اور مفروضوں پر قائم تھی۔ یہ خیال عام تھا کہ مذہب اور عقل دو متضاد رویے ہیں۔ تمام مذاہب اس زندگی اور کائنات کو سراب سمجھتے تھے اور آنے والی زندگی کو حقیقی۔

فادر آف ماڈرن سائنس

قرآن نے جو ذہنی انقلاب برپا کیا، اس کے نتیجے میں عقل و خرد اور علم اور تحقیق کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ بیسیوں عرب مفکر پیدا ہو گئے اور کائناتی علوم پر تحقیق کا سلسلہ چل پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سینکڑوں مسلمان سائنس دان میدان عمل میں آ گئے۔ انھوں نے سائنسی تحقیق کا بنیادی رویہ قائم کیا۔ تمام علوم کے بنیادی حقائق پر تحقیق کر کے اصول قائم کیے۔

آج کے سائنس دان، محقق اور مورخ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ عرب محققین نے ماڈرن سائنسی علوم کی بنیاد ڈالی۔ مثلاً فلپ کے ہٹی لکھتا ہے کہ ''عربوں نے علم ریاضی میں صفر کو ترقی دے کر اس مقام پر پہنچایا کہ آج کے ریاضی دان اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ علم طب کو سائنسی بنیادوں پر قائم کیا اور علم طب کے حصول کے لیے درس گاہیں قائم کیں۔ بغداد میں 860 سند یافتہ ڈاکٹر کام کر رہے تھے۔''

ڈریپر لکھتا ہے:

''عربوں نے وہ سب کچھ ایجاد کیا جس کو ہم اب اپنی ایجاد سمجھتے ہیں۔ مثلاً رصد گاہیں بنائیں، اصطرلاب بنایا، ستاروں کے نقشے بنائے، جبر و مقابلہ اور جیومیٹری کے اصول بنائے۔ علم کیمیا کے اصول بنائے، پلی اور لیور بنائے، سورج اور چاند گرہن کے اوقات متعین کیے۔

پنڈت نہرو اپنی کتاب Glimpses of World History میں لکھتے ہیں کہ عربوں

سے پہلے ہندوستان، چین، مصر، کسی جگہ کوئی سائنٹیفک علم نہیں تھا۔ عربوں نے سائنٹیفک علم کی بنیاد ڈالی اور وہ فادر آف ماڈرن سائنس کہلانے کے مستحق ہیں۔

☆

باب: 9

کریش سولائزیشن

صاحبو! کیا آپ کو پتا ہے کہ اس وقت ہم کریش (Crash) تہذیب کے طیارے میں سوار ہیں۔ اس طیارے میں صرف ایکسیلریٹر ہے، بریک (Brake) نہیں۔ لینڈنگ کے پہیے جام ہو چکے ہیں۔

کتا...... باہر کا، اندر کا

سبھی جانتے ہیں کہ حادثہ ہونے والا ہے۔ ابھی ابھی ہونے والا ہے، لیکن کوئی مانتا نہیں۔ کیسے مانے؟ مغربی تہذیب کے زیرِ اثر شدت کا جنون بڑھتا جا رہا ہے۔ حرکت کے رقص کی لے چڑھتی جا رہی ہے۔ آزادی کے جنون نے سبھی کچھ دھندلا دیا ہے۔ مغرب میں آج آزادی کا دور دورہ ہے۔ سیاسی آزادی، مذہبی آزادی، جنسی آزادی، آزادی کا ایک طوفان چل رہا ہے۔ آزادی کا یہ جنون اتنی دھول اڑا رہا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں پھر سے بندشوں کی قدر پیدا ہو گئی ہے۔

ویسے تو مفکروں نے بہت پہلے بندشوں کی اہمیت کی بات کی تھی۔ ایک نے کہا تھا:

''جانتے ہو آزادی کیا ہے؟ تمھارے پڑوسی کے کتے کے گلے کی زنجیر تمھاری آزادی ہے۔''

لیکن بات ایسے انداز سے کہی گئی تھی کہ ہمارے دلوں میں نہ بیٹھ سکی۔ ہم سمجھے کہ آزادی کے راستے کی رکاوٹ، پڑوسی کا کتا ہے۔ آزادی کا دشمن باہر ہے۔ ہم نے اپنے اندر کے کتے کی طرف توجہ نہ دی جس کے گلے کی زنجیر باہر کے کتے کے گلے کی زنجیر سے

ریادہ اہم ہے۔

ہمارے مفکروں نے یہ تو کہہ دیا کہ انسان مجلسی جانور ہے لیکن انھوں نے بات کی وضاحت نہیں کی۔ اگر انسان اپنی فطرت میں مجلسی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ میل جول کا محتاج ہے، تعلقات کا محتاج ہے، رشتوں کا محتاج ہے اور ''کسے را باکسے کارے نہ باشد کے بہشت'' کا مفروضہ غلط ہے کہ انسان کے لیے بندھن اتنے ہی ضروری ہیں جتنی آزادی۔

فیملی

......

مغربی تہذیب، جو آج کریش تہذیب بنی ہوئی ہے، بنیادی طور پر بہت خوبیاں تھیں۔ طلب علم تھی، سائنسی تحقیق کا شوق تھا۔ یہ دونوں اوصاف انھوں نے مسلمانوں سے سیکھے تھے۔ اہل مغرب میں سادگی تھی، خلوص تھا، سچائی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا، وہ حرکت کی زد میں آ گئے۔ ایک بگولے نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ Who Cares کا ایک میری گوراؤنڈ (Merry Go Round) چل پڑا۔ بے محابا آزادی کا جنون پیدا ہوا۔ انھوں نے رفتار اور شدت کو اپنا لیا۔ بندھنوں کی عظمت کو نظر انداز کر دیا اور کرپشن کو اس تہذیب کا مقصد بنا دیا۔

اب سمجھدار لوگ کھڑے دیکھ رہے ہیں کہ کب گئی؟ اب گئی کہ اب گئی۔ خوف زدہ ہیں، لیکن کوئی اسے کرپشن سے بچا نہیں سکتا۔ اس بے محابا آزادی نے ہیومن سوسائٹی کے بنیادی سیل (Cell) فیملی کو توڑ دیا۔ .

صاحبو! شادی صرف جنسی تعلق ہی نہیں، عام لوگ میاں بیوی کے تعلق کو Love Relationship سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی خوش فہمی ہے۔ دراصل شادی ایک درسگا ہے جہاں افراد ایک دوسرے کے ساتھی بن کر جینا سیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں، پسندیدگیوں، ایک دوسرے کے وہموں یعنی Irrational attitudes کو برداشت کرنا سیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طبیعتوں میں ڈھل جانا سیکھتے ہیں۔ اختلاف رائے کو برداشت کرنا سیکھتے ہیں۔ رواداری سیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو خوش رکھنا سیکھتے ہیں اور پھر جب بچے

ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے ایثار و قربانی پیدا کرنا سیکھتے ہیں۔ اپنی شخصیت کے نوکیلے چبھتے کونوں کو گول کرنا سیکھتے ہیں۔

پروفیسر احمد رفیق اختر

اس بات پر مجھے پروفیسر احمد رفیق اختر یاد آ گئے جن کا مقصد حیات ہی ہارمنی پیدا کرنا ہے، نوکیلے کونے گول کرنا ہے۔ گذشتہ چند ایک برس میں مجھے چند ایک بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ وہ عام انسان کی طرح جیتے ہیں۔ نہ لباس میں خصوصیت، نہ شکل و شباہت میں نہ انداز میں نہ برتاؤ میں۔

نہ جبہ نہ دستار، نہ گیسو نہ داڑھی، کلین شیو ہیں۔ چہرے پر مصنوعی وقار نہیں، صرف ذہانت اور انسانیت ہے۔ بات میں ''ہم'' نہیں۔ گلے میں ''اہم'' نہیں۔ انداز میں اجلاپن نہیں۔ دوسرے کو میلا ہونے کا احساس نہیں۔ کشف نہیں چلاتے۔ فراست ہے لیکن جتاتے نہیں۔ اختلاف رائے کو کاٹتے نہیں، برداشت کرتے ہیں۔ طبیعت میں بڑا ''سنس آف ہیومر'' ہے۔ صاف لگتا ہے کہ QURA دیکھنے کی حس موجود ہے لیکن ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ خود نمائی نہیں کرتے۔ دعویٰ نہیں کرتے۔ پیری مریدی نہیں کرتے۔ بیعت کی دعوت نہیں دیتے۔ مسئلہ مسائل نہیں چھانٹتے۔ قدریہ سلسلہ کے مشاہیر کو استاد مانتے ہیں۔ لیکن جو موف پروموٹ کرتے ہیں، وہ انھوں نے خود قرآن سے اخذ کیا ہے۔ لوگوں کو پڑھنے کے لیے اسماء دیتے ہیں۔

مجھے بھی دیے۔ میں نے کہا، ''پروفیسر صاحب! یہ ظلم نہ کرو۔ میں تو اللہ کا ایک ان پڑھ شی ہوں، عبادت میرا کام نہیں۔ سیانے کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجے۔''

کہنے لگے: ''یہ ضروری ہے، تین ماہ کے لیے پڑھو۔''

میں نے کہا ''تین ماہ کے بعد کیا ہوگا؟''

وہ مسکرا دیے۔

میں نے تین ماہ تسبیح چلائی۔ میرا خیال تھا تین ماہ بعد میرے ہاتھ میں ہاتھ سے آواز

آئے گی، بولا میرے آقا! میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" لیکن کوئی آواز نہ آئی۔

پروفیسر کا کہنا ہے، اسلام توازن کا نام ہے۔ اپنے اندر ہارمنی پیدا کرنے کا نام ہے۔ نہ لاگ ہو نہ لگاؤ۔

حضورﷺ نے فرمایا تھا: "لوگو! حد میں رہو، حدیں نہ توڑو۔"

میں نے پوچھا: "پروفیسر! آپ کا شغل کیا ہے؟"

بولے: "تحلیل نفسی کرتا رہتا ہوں۔ وہ کونے جو دوسروں کو چبھتے ہیں، انھیں گول کرتا رہتا ہوں۔"

میاں بیوی کا بھی یہی مسئلہ ہے، چبھتے کونے گول کرتے رہو تو Domestic Happiness حاصل ہوتی ہے۔

صاحبو! Domestic Happiness سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔

ایک دن میرے بابا نے مجھ سے پوچھا: "مفتی! دنیا میں جنت حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا: "بالکل چاہتا ہوں۔ آگے ملے نہ ملے، یہاں مل جائے۔"

بولے "آسان بات ہے کہ بیوی کوئی بات کہے، جواب میں کہو ہاں جی۔"

صاحبو! اس روز سے میں جنت میں رہتا ہوں۔

بے شک فیملی ایک عظیم درسگاہ ہے لیکن اہل مغرب نے آزادی کے جنون میں فیملی کی اہمیت کو قائم نہ رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ شادی محبت کا رشتہ ہے۔ شادی کے بعد چند روز تو محبت کی شوگر کوٹنگ قائم رہی، پھر ایک دوسرے کو چبھنے لگے تو قانون نے طلاق آسان کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے خاوند سے دو بچے ہوئے، دوسرے سے ایک بیٹی اور تیسرے سے دو بیٹے۔ ان پانچ بچوں کو گھر نصیب نہ ہوا۔ ماں باپ نصیب نہ ہوئے۔ انھیں وہ محبت نصیب نہ ہوئی جو بچے کی پرورش کے لیے ضروری ہے۔ طبعاً وہ اکھڑے اکھڑے رہے، رشتوں کے مفہوم سے ناواقف ..... (Un Owned) سیلف سنٹرڈ (Self

Centred)۔ پھر جنسی آزادی نے لٹیا ہی ڈبو دی۔ اہل مغرب کو احساس نہ ہوا کہ جنسی آزادی خودکشی کے مترادف ہے۔ وہ اسے Emancipation سمجھتے ہیں۔

حجاب، بے حجابی

صاحبو! بے حجابی اخلاقی یا مذہبی مسئلہ نہیں۔ یہ تو بیالوجی کا مسئلہ ہے۔

میرے دور میں لڑکی ہمیشہ چوبارے کی کھڑکی میں نظر آیا کرتی تھی۔ وہ بھی کھلے منہ نہیں، چق کے پیچھے۔ دو حنائی انگلیاں چق کے کونے پر نظر آتیں اور چق کی تیلیوں کے پیچھے ایک چٹا سفید دھبا سے چہرا، ایک مبہم سی مسکراہٹ، دو ڈولتی کالی کشتیاں، چق ہلتی تو دل ہلتے تھے۔ تحریک پیدا ہوتی تھی۔

برقعے میں لپٹی ہوئی عورت بازار میں نظر آتی تو ہوا کے جھونکے سے نقاب کا ایک پلو اڑتا۔ نیچے گلابی رخسار نظر آتا تو تحریک پیدا ہوتی تھی۔

اگر تحریک پیدا نہ ہو تو ملاپ نہیں ہو سکتا۔ انگریزی میں اسے Preparation سٹیج کہتے ہیں۔ پریپریشن کی ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھے مل بیٹھے۔ انھوں نے سوچا، مرد پر جو یہ ذمہ داری آ پڑی ہے، اسے نبھانا پڑے گا۔ مرد میں تحریک پیدا کرنے کا آسان اور یقینی طریقہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کو الگ الگ کر دو۔ یہ فیصلہ مشرق اور مغرب دونوں کے بڑوں نے کیا تھا۔ مشرق والوں نے نقاب عائد کر دیا، مغرب والوں نے فاصلے پر اکتفا کیا۔

صاحبو! 1921ء میں جب میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے کے لیے لاہور آیا تو دیکھا کہ انارکلی میں کوئی عورت نظر نہیں آتی تھی۔ عورت کو دیکھنے کے لیے ڈبی بازار جانا پڑتا تھا۔ سالم عورت وہاں بھی نظر نہیں آتی تھی۔ کبھی رخسار، کبھی توجہ طلب کالی آنکھیں۔ ان دنوں عشق اور محبتیں کھڑکیوں، جھروکوں اور چھتوں کی محتاج تھیں۔

اشفاق احمد اٹلی میں پروفیسری اور براڈ کاسٹنگ سے فارغ ہو کر لاہور آیا۔ یہ پاکستان کے قیام کے بعد کی بات ہے۔ اس نے مجھے بتایا:

''میں چھٹی کے دن سیر سپاٹے کے لیے شہر سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ شہر سے دس میل دور ایک گاؤں میں رکا تو گاؤں کی موٹی موٹی میموں نے مجھے گھیر لیا۔ پوچھنے لگیں، کیا تو شہر میں رہتا ہے؟ میں نے کہا، ''بالکل۔'' کہنے لگیں، ہم نے سنا ہے کہ شہر کی لڑکیوں نے پاجامے اوپر چڑھا لیے ہیں اور ننگی ٹانگوں سے گھومتی پھرتی ہیں، کیا یہ سچ ہے؟ میں نے کہا، ہاں یہ سچ ہے۔ وہ حیرت سے چلائیں ''انھیں شرم نہیں آتی۔ اتنی بے حیائی۔ توبہ توبہ توبہ۔''

برہنگی

یورپ امریکا کی یہ بے حجابی حال ہی کی پیداوار ہے۔ خواتین سمندر کے کنارے ننگی پڑی رہتی ہیں۔ بازاروں میں گھومتی پھرتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اپنی نمائش کر رہی ہیں۔ انھیں علم نہیں کہ ننگی عورت ایک عام منظر بن چکا ہے، اس قدر عام کہ وہ مرد میں تحریک پیدا نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مرد خواتین کے لیے ناکارہ ہوتا جا رہا ہے۔ عورت کی بارآوری کم ہوتی جا رہی ہے۔

مرد جنسی شاہراہ کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں میں جنسی تسکین تلاش کر رہا ہے۔ گورے خوفزدہ ہیں کہ صورت حال ایسے ہی رہی تو دس پندرہ سال میں یورپ اور امریکا میں کالے ہی کالے نظر آئیں گے۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ اسٹیٹ نے جنسی بے راہ روی کو قانونی تحفظ دے دیا ہے۔ اب وہاں مرد، مرد سے شادی کر رہا ہے اور عورت، عورت سے۔

ہاں تو مغربی تہذیب ایک کریش تہذیب ہے۔ اس طیارے میں صرف ایکسلریٹر ہے، بریک نہیں اور لینڈنگ کے پہیے جام ہو چکے ہیں۔

سبھی جانتے ہیں کہ حادثہ ہونے والا ہے۔ ابھی ابھی کیا ہوگا لیکن کوئی مانتا نہیں۔ کیسے مانے؟ شدت کا جنون بڑھتا جا رہا ہے۔ حرکت کے رقص کی لے چڑھتی جا رہی ہے۔ چڑھتی لے کو صرف وجدان جذب کر سکتا ہے۔ اہل مغرب وجدان سے محروم ہیں۔ اس لیے

چڑھتی لے ہسٹیریا پیدا کر رہی ہے۔ صاحبو! یہ مغربی تہذیب جس سے ہم اس قدر مرعوب ہیں، دنیا پر صرف دو ڈھائی سو سال تک حکمران رہی ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی تہذیب سات سو سال حکمران رہی۔ اسلامی تہذیب کریشن تہذیب نہیں تھی۔ اس میں بے محابا آزادی نہیں تھی۔ آزادی تو تھی، ساتھ بندھن بھی تھے۔ اس میں توازن تھا۔

نزول قرآن

قرآن کا نزول ایک بہت اہم واقعہ تھا۔ قرآن سے پہلے کسی مذہبی کتاب نے عقل و خرد اور علم و تحقیق کو اتنا بلند مرتبہ نہ بخشا تھا بلکہ عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ مذہب اور عقل دو متضاد چیزیں ہیں۔ قرآن کا رویہ حیرت انگیز تھا۔ وہ علم و حکمت کا خزانہ ہی نہیں تھا بلکہ سائنسی علوم کا سرچشمہ بھی تھا۔

قرآن نے عقل و خرد اور علم و تحقیق کی ایک فضا پیدا کر دی۔ جگہ جگہ علمی درسگاہیں بن گئیں۔ یونیورسٹیاں وجود میں آ گئیں۔ نوجوانوں میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ سائنسی تجربات کے لیے لیبارٹریاں بن گئیں۔ جگہ جگہ کتب خانے بن گئے۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ لوگوں میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ کتابیں اکٹھی کرنا فیشن بن گیا۔ ہر بڑے اور چھوٹے شہر میں کتب خانے بنا دیئے گئے۔ صرف شہر بغداد میں چھ ہزار کتب خانے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ کی لائبریری میں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ قرطبہ کے کتب خانے میں چار لاکھ نادر کتابیں موجود تھیں جس کا کیٹلاگ 44 جلدوں میں مکمل ہوا تھا۔ کہتے ہیں بغداد کی ایک گلی میں کتابوں کی سو دکانیں تھیں۔

علم کے اس شوق کی وجہ سے دو سو سال میں عرب علماء نے کئی ایک کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ ان کتابوں نے چاروں طرف علم کی روشنی پھیلا دی۔ جب عربوں نے سپین فتح کر لیا تو علم کا ذوق وہاں بھی پھیل گیا۔ عربوں کی تحقیقاتی کتابیں سپین، فرانس، اٹلی اور انگلستان میں پہنچ گئیں۔ ان کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے۔

بہت دیر بعد یورپ میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں تو یہی کتابیں پڑھائی جانے لگیں۔

یوں مسلمانوں کی لکھی ہوئی سائنس اور فلکیات کی کتابیں یورپی درسگاہوں میں چار سو سال تک پڑھائی جاتی رہیں، اٹھارویں صدی عیسوی تک۔

چونکہ یہی تعلیم کا مستند ذریعہ تھا۔

علم و تحقیق

قرآن کے پیغام اور حضور اعلیٰ ﷺ کے کردار کے زیر اثر صحرا نشیں عربوں کی زندگی ہی بدل گئی۔ قرآن کی راہنمائی میں عرب ہر شعبہ میں آگے بڑھنے لگے اور نصف صدی کے اندر ہی اندر علم و عمل کے متوالوں نے آدھی سے زیادہ دنیا فتح کر لی۔

انھوں نے قیصر و کسریٰ جیسی پر ہیبت سلطنتوں کو زیر نگوں کر ڈالا اور ساری دنیا میں علم و فکر کا ماحول پیدا کر دیا۔ اس علم و فکر کے ماحول کے زیر اثر سینکڑوں عرب مفکر پیدا ہو گئے۔ انھوں نے مختلف علوم میں تحقیق کا کام شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی ایجادات عمل میں آئیں۔ مثلاً تھرمامیٹر، اصطرلاب، پنڈولم والی گھڑی، قطب نما۔

ظاہر ہے جہاں ایجادات ہوں گی، وہاں پروڈکشن بھی ہو گی۔ کارخانے وجود میں آئیں گے۔ ان دنوں بغداد میں دھڑا دھڑ کارخانے بنے، یعنی قرآن نے علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا۔ تحقیق کی جانب مائل کیا۔ سائنسی سپرٹ پیدا کی اور انڈسٹریل ریوولیوشن کی ابتدا کی۔

صاحبو! ایک بات کہوں! تلخ بات ہے، ناقابل قبول، لیکن سچی ہے۔ وہ یہ کہ آپ میں ہم سب میں سے کسی نے قرآن کی عظمت کو نہیں سمجھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن ایک مذہبی کتاب ہے، اس لیے لائق صد احترام ہے۔ ہم قرآن پڑھتے ہیں تو صرف ثواب کمانے کے لیے۔ علمائے دین قرآن پڑھتے ہیں تو وہ دینی موشگافیاں پیدا کرنے کے لیے، اپنے خیالات کو تقویت دینے کے لیے اور عوام کو اللہ کے غیظ و غضب سے ڈرانے کے لیے۔ جنھیں قرآن حفظ ہے، وہ صرف لفظ سے واقف ہیں۔ اہل قرأت صرف حسن قرأت کا خیال رکھتے ہیں۔

قرآن اور سائنسی علوم

قرآن سے متعلق شماریات جمع کرنے والوں کا کہنا ہے:

1- قرآن میں اللہ کے حقوق سے متعلق کل 193 آیات ہیں۔
2- بندوں کے حقوق سے متعلق 673 آیات ہیں۔
3- کائنات سے متعلق سائنسی علوم پر 750 آیات ہیں۔

ان آیات میں مندرجہ ذیل موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے:

1- آسمان اور دنیا کی پیدائش پر غور و فکر کا بیان۔
2- آفتاب کی پیدائش کی حکمتوں پر غور و فکر کا بیان۔
3- چاند کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
4- زمین کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
5- سمندر کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
6- پانی کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
7- ہوا کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
8- آگ کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
9- انسان کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔

یہ تو کائناتی موضوعات ہیں جن پر قرآن ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ پوری بات نہیں بتاتا، اشارات دیتا ہے، راستہ بجھاتا ہے۔ ہمیں تلاش پر مائل کرتا ہے۔ پنجابی شعر کے مصداق پلا مار کر دیا بجھاتا ہے اور آنکھ کے اشارے سے بات کرتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ قرآن تو برملا کہتا ہے کہ لوگو! ذرا دیکھو، غور سے دیکھو۔ سوچو، سمجھو، دیکھو تو ہم نے کیا کیا تخلیق کیا ہے۔ جان لو کہ یہ کائنات ہم نے اس لیے تخلیق کی ہے کہ تم اسے تسخیر کر سکو۔

معجزے

اسلام تو ان کا مذہب ہے جو مظاہرۂ فطرت پر غور و خوض کے عادی ہیں۔ وہ تو غور و فکر

سے بے بہرہ ہیں جنھیں بات منوانے کے لیے معجزے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ٹالسٹائی روس کا ایک مفکر تھا۔ سفر کے دوران اسے ایک پادری ملا۔ پادری اس کے پاس بیٹھا اور حسب معمول عیسائیت کی عظمت پر باتیں کرنے لگا۔ ٹالسٹائی اس کی باتیں سنتا رہا۔ آخر میں پادری نے کہا: ''عیسائیت واحد مذہب ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ثبوت میں ایک معجزہ پیش کرتا ہے۔''

''کون سا معجزہ؟'' ٹالسٹائی نے پوچھا۔

پادری بولا: ''یہ معجزہ کہ حضرت مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔''

ٹالسٹائی نے جواب دیا: ''محترم پادری صاحب! میں اس لیے خدا کے وجود کا قائل نہیں ہوا کہ مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ میں تو پیدائش کے مسلسل معجزے پر حیران زدہ ہوں کہ میاں بیوی کے ملاپ سے دو حقیر مادے آپس میں مل جاتے اور ایک بچے کی پیدائش کا باعث بن جاتے ہیں۔ کیا عام پیدائش ایک حیران کن معجزہ نہیں۔''

ان کائناتی موضوعات کے علاوہ بھی قرآن میں زمینی علوم پر آیات ہیں، مثلاً ان کے موضوع یوں ہیں:

1- پرندوں کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
2- چوپایوں کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
3- شہد کی مکھی کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
4- مچھلی کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔
5- نباتات کی پیدائش کی حکمتوں کا بیان۔

قرآن کا نواں حصہ سائنسی علوم کے بارے میں ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے قرآن کے ان حصوں کو کبھی اہمیت نہیں دی جو عقل و دانش اور سائنسی علوم کے متعلق ہیں۔ ہمارے علمائے دین نے اپنے خطبوں میں کبھی ان امور کا ذکر نہیں کیا۔ وہ بھی مجبور ہیں کیونکہ وہ خود ان علوم سے واقفیت نہیں رکھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دین کا علم کافی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین علم ہے؟ سیانے کہتے ہیں کہ دین تو

ایک ضابطۂ حیات ہے جسے عمل سے تعلق ہے، ایمان سے تعلق ہے، علم سے نہیں۔

دین، علم

چونکہ قرآن نے علم کو فضیلت کا مقام دیا ہے، اس لیے مذہب کے اجارہ داروں نے مشہور کر رکھا ہے کہ علم سے قرآن کی مراد علمِ دین ہے۔ علم دین ہی سچا علم ہے، باقی علوم تو انسانوں کو کفر کا درس دیتے ہیں۔ اپنی ذاتی اہمیت کو قائم کرنے کے لیے انسان کو کیا کیا حیلے کرنے پڑتے ہیں!

قرآن کی عظمت کا احساس صرف ان لوگوں کو ہے جو سائنسی علوم سے واقف ہیں۔

خلفائے راشدین کے دور میں جتنے بھی مسلمان سائنس دان پیدا ہوئے، وہ سب قرآن کے مرہون منت تھے۔ ان کی تصنیفات میں جگہ جگہ قرآن کے حوالے ملتے ہیں۔

مغربی سائنس دان

مغربی سائنس دان قرآن علم سے بے بہرے ہیں، اس لیے ان کی تحقیق آوارہ ہے۔ ویسے بھی قرآن کہتا ہے:

> ''لوگو! رموز فطرت پر غور کرو۔ انھیں سمجھو۔ لیکن خبردار! ہمارے حوالے کے بغیر سمجھنے کی کوشش نہ کرنا، بھٹک جاؤ گے، راستہ نہیں ملے گا۔ کبھی پہنچ نہ پاؤ گے۔''

مغربی سائنس دان محنت، خلوص اور ذوق کے باوجود آج تک کہیں پہنچ نہیں پائے، اس لیے کہ انھوں نے خالق کے حوالے کے بغیر سچائی کی تلاش کی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک آٹومیٹزم ہے جو حادثہ کی وجہ سے وجود میں آئی ہے، جس کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ پلاننگ ہے نہ مقصد اور نہ منزل۔

صاحبو! ہم قرآن پڑھتے ہی نہیں۔ عقل و دانش کی بات آ جائے تو اسے کانی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ثواب اور عذاب کی بات آ جائے تو اٹینشن ہو جاتے ہیں۔ بڑے انہماک سے پڑھتے ہیں۔ اس زندگی کی بات آ جائے تو اسے جملہ معترضہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ آنے

والی زندگی کی بات آجائے تو توجہ مرکوز کر دیتے ہیں۔

ثواب کماؤ

ہمارے راہبروں نے ہمیشہ کنڈیشن (Condition) کر دیا ہے کہ یہ زندگی فانی ہے، بے ہودہ ہے، بکواس ہے، سراب ہے۔ اصلی زندگی وہ ہے جو آنے والی ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آنے والی زندگی تو جزا و سزا ہے۔ وہ ایک پھول ہے جو موجودہ زندگی کے بوٹے پر لگے گا۔ تمام تر اہمیت تو موجودہ زندگی کی ہے۔ ہمارے رہبروں نے اسلام کو تجارت بنا رکھا ہے۔ یہاں ایک نماز پڑھو، وہاں 70 نمازوں کا ثواب ملے گا۔ یہاں بھوکے کو ایک روٹی کھلاؤ، وہاں اس کے عوض دس روٹیاں ملیں گی۔ مولوی صاحب اپنے خطبے میں اس مسئلے پر روشنی ڈال رہے تھے۔ انھوں نے اس حوالے سے ایک قصہ سنایا۔

کہنے لگے: ''ایک روز مسجد میں ایک بزرگ مہمان آگئے۔ اس وقت دسترخوان میں صرف دو روٹیاں تھیں جو ہم نے پیش کر دیں۔ کھانے لگے تو دروازہ بجا۔ حجرہ کے باہر ایک بھوکا مسافر کھڑا تھا۔ بزرگ نے ایک روٹی اسے دے دی اور دسترخوان لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ بجا۔ ہم نے پوچھا، کون ہے بھئی؟ آواز آئی: ''جناب! ختم کی روٹیاں لایا ہوں۔''

بزرگ نے پوچھا: ''کتنی ہیں؟''

آواز آئی کہ جناب! پندرہ روٹیاں ہیں۔

بزرگ نے کہا: ''نہیں بھائی! یہ روٹیاں ہماری نہیں، لے جاؤ۔''

کچھ دیر کے بعد پھر دروازہ بجا اور آواز آئی: ''جناب چودھری صاحب نے پانچ روٹیاں بھیجی ہیں۔''

بزرگ نے کہا: ''نہیں میاں! یہ ہماری نہیں، کسی حاجت مند کو دے دو۔''

کچھ دیر کے بعد پھر دروازہ بجا اور آواز آئی کہ جناب شادی والے گھر نے روٹیاں بھیجی ہیں۔

بزرگ نے پوچھا: ''کتنی ہیں؟''

جواب آیا کہ جناب دس روٹیاں ہیں۔

بزرگ بولے: ''ٹھیک ہے! لے آؤ، یہ ہماری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایک روٹی خیرات کرو گے تو اس کے عوض دس ملیں گی۔''

چالیس نمازیں

میں نے 1968ء میں حج کیا تھا۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد ہم مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ مسافر خانے میں چند ایک پاکستانی ہمارے ساتھ رہتے تھے۔

ان کا روز آپس میں جھگڑا لگا رہتا تھا۔ ایک کہتا تھا، بھائیو! مدینہ منورہ میں ہم نے 36 نمازیں پڑھی ہیں۔ دوسرا کہتا تھا، نہیں تمھاری گنتی ٹھیک نہیں۔ ہم نے صرف 34 نمازیں پڑھیں ہیں، چھ نمازیں پڑھنی باقی ہیں۔

پتا نہیں کیوں؟ لیکن یہ خیال عام ہے کہ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران چالیس نمازیں پڑھنا ضروری ہے، اس لیے زائرین نمازوں کا حساب رکھتے ہیں۔ ابتدائی ایام میں تو مدینہ منورہ میں حاضری کا جذبہ انھیں مسحور رکھتا ہے۔ گھر پہنچنے کی خواہش ابھرتی ہے۔ جی چاہتا ہے اڑ کر گھر جا پہنچیں۔ مدینہ منورہ میں حاضری کا احساس مدھم ہو جاتا ہے۔ واپسی میں حائل وہ چالیس نمازیں ہوتی ہیں جنھیں پڑھے بغیر حج یا عمرہ کا ثواب ختم ہو جاتا ہے، اس لیے تمام تر توجہ نمازوں پر مرکوذ ہو جاتی ہے۔ زائرین بھول جاتے ہیں کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں، کن کی خدمت میں حاضری دے رہے ہیں، کن کے قدموں میں بیٹھنے کا انھیں اعزاز حاصل ہے۔

وہ چاہتے ہیں کہ جلد فرائض سے فارغ ہوں، گھر پہنچیں اور جا کر اپنے عزیزوں کو بتائیں کہ اس مقدس مقام سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ سبز جالی کو پکڑ کر بیٹھیں رہیں۔

رچوال

ہمارے راہبروں نے نماز کو بھی ایک رچوال (Ritual) بنا دیا ہے۔ ہم نماز اس لیے

نہیں پڑھتے کہ اللہ کا حکم بجالا رہے ہیں۔ اس لیے بھی نہیں کہ اللہ کے حضور حاضری دے رہے ہیں یا اللہ سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے راہبروں نے ہمیں کنڈیشن کر دیا ہے کہ ہماری سوچ ثواب اور گناہ تک محدود رہے۔ ہم نماز ثواب حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔

ہمارے راہبر ٹیلی ویژن پر آ کر ہمیں بتاتے ہیں کہ نماز بہشت کی کنجی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نماز قائم کرلو، باقی سب باتیں از خود ٹھیک ہو جائیں گی، کردار سنور جائے گا، اخلاق بہتر ہو جائے گا، معاملات ٹھیک ہو جائیں گے، لین دین درست ہو جائے گا۔ مطلب یہ کہ مسجد کو مرکز مان لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ اس میں وہ خود دیوتا سمان براجمان ہیں۔

☆

باب:10

گلاب کا پھول

صاحبو! بات کہنے کی نہیں، لیکن کہے بغیر چارہ بھی نہیں۔ بڑی تلخ بات ہے لیکن بڑی سچی۔ اتنی تلخ سچائی کہ ماننے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ یہ کہ ہم میں سے چند ایک افراد ہوں گے جو قرآن پڑھتے ہیں، انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اتنے چند! باقی سب، آپ، میں، ہم قرآن پڑھتے نہیں، اسے استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ تو ثواب کمانے کے لیے تلاوت کرتے ہیں۔ کچھ اپنے مرحوم عزیز و اقربا کو ثواب پہنچانے کے لیے قرآن پڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ آیات کو تعویز کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کچھ اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ورد کرتے ہیں۔ صوفی اکٹھے مل کر ذکر کرتے ہیں تا کہ وجدان کی کیفیت پیدا ہو۔ وجدان بھی تو ایک قسم کی لذت ہے۔ ہمیں راہ دکھانے والے اپنے نظریات کی تقویت کے لیے، عوام کو مرعوب کرنے کے لیے، شوکت نفس کے لیے قرآن پڑھتے ہیں۔ بہر صورت، کوئی شخص قرآن کو سمجھنے اور جاننے کے لیے قرآن نہیں پڑھتا۔

سیانے کہتے ہیں، قرآن گلاب کے پھول کے مانند ہے...... پتی در پتی، پتی در پتی۔ اوپر کی پتی اٹھاؤ تو نیچے ایک اور پتی۔ اسے اٹھاؤ تو ایک اور پتی۔ مفہوم در مفہوم۔ اوپر کا مفہوم ہٹاؤ تو نیچے ایک اور مفہوم۔ اوپر سطحی نیچے کائناتی۔ اکثر لوگ پہلی پتی یعنی اوپر کے مفہوم پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پالیا، ہم نے پالیا۔

قرآن کی بات تو وہی تیتر کی بولی والی بات ہے۔ تیتر بولا تو مفکر نے کہا کہ کہہ رہا ہے، سبحان تیری قدرت۔ بنیا بولا، ابے نہیں۔ کیوں خواہ مخواہ بات کو الجھا رہا ہے۔ تیتر کہہ رہا ہے، نون، تیل، ادرک۔

پہلوان بولا: تم دونوں غلط سمجھے۔ تیتر کہہ رہا ہے، کھا گھی اور کر کسرت۔

قرآن کہتا ہے، لوگو! مجھے پڑھو، سمجھو، غور و فکر کرو۔ پھر تمھیں ایسی ایسی عقل و دانش کی باتیں ملیں گی کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ پردے اٹھ جائیں گے۔ بڑے بڑے راز کھلیں گے جو تمھیں تسخیر کائنات میں مدد دیں گے۔

بچہ اور بڑا

صاحبو! ہم سب کے اندر ایک بچہ ہے۔ معصوم بچہ جو اردگرد کی چیزوں کو دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ یہ کیا ہے، کیسے ہے، کیوں ہے؟ یہ دنیا دراصل ایک ونڈر لینڈ ہے اور ہمارے اندر کا بچہ ایلس ہے۔ دنیا میں جتنا علم بھی حاصل ہوا ہے، سب اس بچے کی وجہ سے ہوا ہے جو گرد و پیش کو سرسری نظر سے نہیں بلکہ حیرت سے دیکھتا ہے۔

پھر ہمارے اندر ایک بڑا بچہ بھی ہے جو سمجھتا ہے کہ میں سب سمجھتا ہوں۔ اس میں حیرت کا جذبہ مفقود ہے۔ یہ بڑا اس بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا ہے: تو تو خواہ مخواہ حیران ہو رہا ہے۔ بھئی یہ تو پتا ہے اور یہ پھول ہے اور یہ مٹی کا ذرہ ہے۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ بڑے کو احساس نہیں کہ ہم ونڈر لینڈ میں رہتے ہیں۔ یہاں کی ایک ایک چیز حسن اور حکمت سے بھری ہوئی ہے۔

قرآن کہتا ہے لوگو! گرد و پیش کو اس بچے کی آنکھ سے دیکھو، پھر دیکھو۔ تمھیں کیا کیا نظر آتا ہے۔ اگر اس بڑے کی نظر سے دیکھو گے تو سب کچھ سپاٹ نظر آئے گا۔ سچی بات ہے جس نے تخلیق کی رنگا رنگی کو نہ دیکھا، وہ تخلیق کار کی عظمت کو کیسے سمجھے گا؟ اللہ کہتا ہے، لوگو! ہم نے یہ کائنات ایک ونڈر لینڈ بنایا ہے۔ شرط یہ ہے کہ تم میں دیکھنے کی صلاحیت ہو۔ تم اس بچے کی آنکھ سے دیکھو، بڑے کی آنکھ سے نہیں جو صرف اپنے مطلب کی چیز دیکھتا ہے اور باقی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سائنسی سپرٹ ہے۔ اس کا انداز تحکمانہ نہیں۔ اس میں رواداری ہے، عقل و فکر کی تلقین ہے۔

ہمارے رکھوالوں نے تبلیغ میں قرآن کا رویہ نہیں اپنایا بلکہ اس سے بالکل الٹ انداز

اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اندر کے بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہمیشہ کے لیے چپ کرا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، یہ بچہ خواہ مخواہ مین میخ نکالتا رہتا ہے، سیدھی باتوں کو الجھاتا ہے، کفر پھیلاتا ہے۔

جوڑے

ہمیں راستہ دکھانے والے خود کو بڑا سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، سب کچھ جانتے ہیں۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ ادھر اللہ کی عادت ہے کہ وہ چلتے چلتے بر سبیل تذکرہ اتنی بڑی بات کہہ دیتے ہیں کہ زندگی بھر سوچتے رہو اور بھید نہ پاؤ۔ اللہ کی ہر بات ہفت پہلو ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ نے بر سبیل تذکرہ قرآن میں کہہ دیا کہ ہم نے زمینی چیزوں کو جوڑوں میں بنایا ہے۔ ہمارے بڑے، جو سمجھتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، بولے یہ تو سیدھی سیدھی بات ہے۔ مطلب ہے کہ جاندار مخلوق کو جوڑوں میں بنایا ہے۔ انسان میں مرد اور عورت، باقی جانداروں میں نر اور مادہ۔

بچہ چلایا، نہیں! اللہ کی باتیں سطحی نہیں ہوتیں، ان میں گہرائی ہوتی ہے۔ توجہ فرمایئے، سوچئے، غور کیجیے، ضرور اس میں کوئی بھید ہوگا۔ بڑے بولے، ہشت بچے! خواہ مخواہ کی گڑبڑ نہ کر، ہمیں سوچوں میں نہ الجھا۔

کچھ لوگ، جو تحقیق کے رسیا تھے، کہنے لگے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نباتات میں بھی جوڑے ہوتے ہیں۔ یہ بات بالکل نئی تھی۔ یہ انکشاف سب سے پہلے قرآن نے کیا تھا۔

Polatiry

پھر صدیوں بعد جب سائنس دانوں نے Polarity کا راز فاش کیا اور غیر مادی جوڑے سامنے آئے، جب انرجی کے جوڑوں کا پتا چلا، کشش اور دور ہٹانے والی طاقتوں کا راز فاش ہوا تو سائنس دان حیرانی سے چلائے کہ یہ بات تو قرآن نے 14 سو سال پہلے بتا دی تھی۔ یہ انکشاف تو قرآن نے واضح الفاظ میں کر دیا تھا بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایسے بھی جوڑے ہیں جنھیں تم نہیں جانتے۔

صاحبو! مقام شکر ہے کہ ہم اللہ کی کائنات کی بہت سی باتوں کو نہیں سمجھتے۔ اگر خدانخواستہ ہمیں سوجھ بوجھ ہوتی تو ہم حیرت زدہ ہوکر آسمان کی طرف بٹ بٹ تکتے اور اللہ کی عظمت کے احساس سے یوں بھیگ جاتے کہ کسی کام جوگے نہ رہتے۔

بڑی باتوں کو چھوڑیئے، یہ سوچئے کہ ہم دو متضاد حرکتوں کی زد میں رہتے ہیں ..... کشش ثقل اور گردشی حرکت۔ اگر ان دونوں کے توازن میں ذرہ برابر فرق آ جائے تو ہمارا تو پٹاخہ بول جائے۔ ذرا سوچئے، میرے صاحب کہ ہماری زمین کشش ثقل اور دور ہٹانے والی قوتوں کے درمیان توازن رکھنے کی کوشش میں چار مختلف محوروں پر گھوم رہی ہے، چار مختلف سفروں پر رواں دواں ہے۔ آج جب محقق لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ قرآن چودہ سو سال پہلے جوڑوں کے بیان میں ہمیں کیا کچھ سمجھا گیا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔

اجارہ دار

لیکن ہماری بدقسمتی کہ ہم میں وہ بچہ نہیں رہا جو کیا کیوں کیسے سوچنے کا متوالا تھا، وہ بچہ سائنس دان تھا۔ قرآن کے نزول کے بعد مسلمانوں میں بہت سائنس دان پیدا ہوئے تھے۔ جس نے بھی قرآن کی سپرٹ کو سمجھا، قرآن کے اشارات پر چلا، وہ سائنس دان بن گیا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا؟ اجارہ دار میدان میں آ گئے۔ اجارہ دار ہمیشہ میدان میں آ جایا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لوگو! قرآن صراط مستقیم بتانے کے لیے آیا ہے۔ سائنسی پہیلیاں بجھوانے نہیں آیا۔ اسلام مداری نہیں ہے۔ کائنات تو اک تماشا ہے۔ تمھاری توجہ کو بھٹکانے کے لیے یہ تماشا لگایا گیا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے، اسے رد کردو۔ صراط مستقیم پر چلو، اللہ اللہ کرو۔ اگلی دنیا میں اپنے لیے ایک برتھ ریزرو کرالو اور جان لو بہشت کی کنجی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ چونکہ ہم تمھارے رہبر ہیں، تمھیں راستہ بتانے آئے ہیں۔ پتا نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے، مگر ایسے ہوتا ہے کہ ہمیشہ اجارہ دار جیت جاتے ہیں اور کامی ہار جاتے ہیں۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔

لے پالک باندی

اسلام سے پہلے عیسائیت سائنس کے سخت خلاف تھی۔ اس نے رہبانیت کو اونچا مقام دے رکھا تھا۔ دو طاقتور اجارہ دار تھے۔

کوئی مفکر کہتا مجھے لگتا ہے کہ زمین گول ہے تو پادری اس کے خلاف فتوی دے دیتے کہ یہ شخص ملحدانہ باتیں کر رہا ہے۔ مذہب کے خلاف فضا پیدا کر رہا ہے۔ اسے پکڑ لو اور سنگسار کردو۔

یوں قرآن کے نزول سے پہلے یہ خیال عام تھا کہ سائنس اور مذہب دو متضاد چیزیں ہیں۔ سائنس مذہب کی بیری ہے۔ پادری ڈرتے تھے کہ اگر سائنس کی عظمت تسلیم کر لی گئی تو ہمارا راج پاٹ ختم ہو جائے گا۔ پھر قرآن نے آ کر کہا، لوگو! یہ جو سائنس ہے، یہ کوئی غیر نہیں ہے۔ یہ تو ہماری باندی ہے۔ یہ تو وہ سیمنٹ ہے جس سے ہم نے تخلیق کائنات کی اینٹیں جوڑی ہیں۔ یہ وہ اصول اور قاعدے ہیں جو ہم نے کائنات بنانے میں برتے ہیں۔ اسے غیر نہ جانو، اسے دشمن نہ جانو۔ الٹا اسے اپناؤ۔ تحقیق کر کے بنانے میں اس کے راز جانو تاکہ تم بھی تخلیق کار بن جاؤ۔

جس طرح پادری سائنس سے خوف زدہ تھے، ایسے ہی ہمارے راہبر بھی خوف زدہ تھے۔ انھوں نے جان بوجھ کر اپنی عظمت برقرار رکھنے کے لیے سائنس کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھا اور اب وہ سائنس کو اہل مغرب کا فتنہ سمجھنے لگے ہیں۔

ایٹم

اس کے برعکس قرآن سائنسی اشارات سے بھرا ہوا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ سائنس دان روز نیا سے نیا انکشاف کرتے ہیں، پھر جو دیکھتے ہیں تو وہ قرآن میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیسی کتاب ہے جو 14 سو سال پرانی ہے لیکن ذرا بھی پرانی نہیں، Out Dated نہیں۔ ہر نئی سے نئی بات، ہر نیا سے نیا انکشاف اس میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ مثلاً ایٹم کی بات لیجیے! 23 صدیاں پہلے یونان کے مفکروں نے کہا

تھا کہ مادے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ایٹم ہوتا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ چونکہ سب سے چھوٹا ذرہ ہے۔ پھر صدیوں بعد سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ ایٹم سب سے چھوٹا ذرہ نہیں، اسے توڑا بھی جا سکتا ہے، اس کے حصے کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ نئی بات، انوکھی بات، نیا انکشاف۔

پھر جو دیکھا تو حیرت کی حد ہو گئی کہ قرآن میں یہ بات پہلے سے موجود تھی اور واضح الفاظ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، ہمیں اس کائنات کے ایک ایک ذرے کا علم ہے، شعور ہے بلکہ ذرے سے بھی چھوٹے ٹکڑوں کا علم ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن میں اتنے عظیم سائنسی حقائق موجود ہیں تو سائنس دان قرآنی خطوط پر تحقیق کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ عیسائی سائنس دان کو قرآن کے بارے میں کچھ علم نہیں۔

کروسیڈ کے زمانے میں پادریوں نے مسلمانوں کے خلاف اس قدر پروپیگنڈا کیا کہ لوگ سمجھنے لگے مسلمان ایک شدت پسند وحشی قوم ہے جو غیر مسلموں سے ظالمانہ سلوک روا رکھتے ہیں اور اختلاف رائے کو قطعی برداشت نہیں کرتے۔ حیرت کی بات ہے کہ پادری ایسا پروپیگنڈا کرنے میں کامیاب کیسے ہوئے حالانکہ مسلمان سات صدیاں آدھی دنیا پر حکمران رہے اور تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے ایسے عدل و انصاف سے حکومت کی کہ دنیا حیران رہ گئی۔

انسان یا جن

البتہ ایک بات ضرور ایسی تھی جو پادریوں کے پروپیگنڈے کو تقویت پہنچاتی تھی۔ وہ یہ کہ مذہبی جنگوں میں مسلمان شوق شہادت سے سرشار ہو کر لڑتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ایک مسلمان دس دشمنوں پر حاوی رہتا تھا۔ اس بات کو پادریوں نے جھنڈے پر چڑھا کر لہرایا کہ لوگو! یہ لوگ جو خود کو مسلمان کہتے ہیں، انسان نہیں بلکہ جنات میں سے ہیں۔ اگر انسان اس دنیا میں امن و امان سے جینے کا خواہش مند ہے تو ہمیں دنیا کو ان جنات کے وجود سے پاک

کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور بد قسمتی ہوئی۔ اجارہ داروں نے دیکھا کہ دنیاوی علوم کے سائنس دان چھا گئے ہیں اور دینی راہبروں کو کوئی پوچھتا نہیں تو انھوں نے اپنی حیثیت پیدا کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ مسلمان دین کو چھوڑ کر دنیا کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں، انھوں نے عبادات کو چھوڑ دیا ہے، یہ تنزل کا نشان ہے۔ ان کے اس پروپیگنڈے کی وجہ سے مسلمانوں نے علوم اور تحقیق کو چھوڑ دیا اور عبادات کو اپنا لیا۔

یوں عبادات کے مختلف طریقے رائج ہو گئے۔ تصوف میدان میں آ گیا۔ پھر تصوف نے کئی روپ دھار لیے، کئی سلسلے بن گئے۔ نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ، چشتیہ، یہ سب سلسلے بلاشبہ عظیم تھے لیکن نتیجہ خوشگوار نہ تھا۔ چونکہ مسلمان گروہوں میں بٹ گئے، مکہ معظمہ میں کئی ایک مصلے بچھ گئے۔

صاحبو! میں صوفیا اور دوسرے بزرگوں کا احترام کرتا ہوں۔ یہ سب بڑے لوگ تھے۔ اللہ کے عاشق تھے لیکن اللہ سے عشق کرنا افراد کا کام ہے، قوم کا کام نہیں۔ صاحبو! ذرا سوچو، ایک خاتون کا عشق فرد کو پاگل کر دیتا ہے اور وہ کسی جوگا نہیں رہتا تو اللہ کا عشق کیا ہوگا؟ شاعر کہتا ہے:

ہوش اڑا دیتا ہے اک خاک کے پتلے کا جمال
خود وہ کیا ہو گا اسے ہوش میں لانے والا

اگر میرے جیسے عام مسلمان بھی اللہ کے عشق میں گرفتار ہو جائیں تو سارا کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔ نہ دنیا رہے گی نہ دین رہے گا۔ نہ اسلام رہے گا نہ جزا نہ سزا نہ کچھ۔

سیانے کہتے ہیں اللہ کی طرف ایک قدم بڑھاؤ تو وہ تمھاری جانب دس قدم بڑھائے گا۔ صاحبو! میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اللہ کی جانب ایک سے زیادہ قدم نہ بڑھانا ورنہ اگر اس نے تمھیں چھاڑ ال لیا تو کسی جوگے نہ رہو گے۔

ساتھی ...... محبوب

بے شک اسے دوست بنا لو، ساتھی بنا لو، پر اس سے عشق نہ کرنا۔ وہ بہت ہی اچھا

ست ہے، بڑا ہی پیارا ساتھی ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل میں پانچ وقت اسے سلام کرو۔ حاضری دو، ضرور دو لیکن صرف حاضری کیونکہ پانچ وقت حاضری دینے سے وہ ساتھی نہیں بنتا۔ ساتھی بنانا ہو تو ہر وقت اسے ساتھ رکھو۔ انگلی لگا کر لیے پھرو۔ پھول کو دیکھو تو کہو، واہ بھئی واہ! کیا حسین چیز بنائی ہے تو نے۔ گائے کو دیکھو تو گائے کو نہ دیکھو، دیکھو کہ اس نے ایک چلتا پھرتا پاکیزہ دودھ کا چشمہ بنا دیا ہے۔ کوئی چیز اس کے حوالے کے بغیر نہ دیکھو۔

کھانا کھانے لگو تو اسے پاس بٹھا لو اور کہو بلے او بلے کیا کیا نعمتیں بنائی ہیں تو نے میرے لیے۔ ہر وقت اس کے وجود کا احساس رہے، اس کی کرم فرمائیوں کا احساس رہے۔ بے شک اس سے گلے شکوے بھی کرو لیکن ساتھی سمجھ کر، اپنا جان کر، بیگانہ جان کر نہیں۔ بے گانہ جانو گے تو وہ بے گانہ بن جائے گا۔ اپنا جانو گے تو وہ اپنا بن جائے گا۔ وہ تو پانی سمان ہے، چاہے کٹورے میں ڈال لو یا گلاس میں یا رکابی میں۔ نہ نہ نہ اسے محبوب نہ بنانا۔ محبوب بناؤ گے تو وہ محبوبانہ شان دکھائے گا، آزمائے گا، نخرے دکھائے گا، چھیڑے گا۔ اس کی محبوبانہ شان کا متحمل ہو جانا بڑے بڑے صوفیوں بزرگوں کا کام ہے، ہم عام لوگوں کا نہیں۔

ڈر اور پیار

ایک روز میں نے اپنے گرو سے کہا، ایک بات پوچھوں؟ بولے، پوچھو۔ میں نے کہا، اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں، مجھ سے ڈرو۔

بولے، اچھا! پھر؟

میں نے کہا، پتا نہیں کیوں مجھے اللہ سے ڈر نہیں لگتا، حالانکہ میرا ایمان ہے اللہ کے سوا کوئی قوت نہیں ہے، کوئی خوف نہیں ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ بچوں کی طرح معصوم ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ ہمارے لیے بے پناہ ہمدردی سے بھرا ہوا ہے۔ اتنا دیالو ہے کہ دینے کے لیے بہانے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

وہ ہنسے، بولے: مفتی! تم زیادہ سوچا نہ کرو۔ یہ جو سوچیں ہیں، یہ گھمن گھیریاں ہیں۔ ڈوبنے دیتی ہیں نہ تیرنے۔ بہت سے بھید ایسے ہیں جو سامنے دھرے ہیں مگر ہمیں دکھتے

نہیں چونکہ باری تعالیٰ نہیں چاہتے کہ وہ کھل جائیں۔

میں نے کہا، عالی جاہ! میں تو ڈرنے کی بات پوچھ رہا تھا کہ مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا، اس پر پیار آتا ہے۔

بولے، جنہیں ڈر لگتا ہے، وہ بھی خوش قسمت ہیں، جنہیں پیار آتا ہے، وہ بھی خوش نصیب ہیں۔

یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے چڑ کر کہا۔

مسکرا کر بولے: ڈر بھی ایک تعلق ہے، محبت بھی ایک تعلق ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ تعلق قائم رہے۔ سارا کھیل تعلق کا ہے۔ اگر اللہ سے تعلق قائم ہے تو سب اچھا۔ ہماری سرکاری فوج ایکسرسائز کیا کرتی ہے نا! آدھی فوج ایک طرف ہو جاتی ہے، آدھی دوسری طرف۔ آدھی سرکاری، آدھی باغی۔ پھر وہ آپس میں باقاعدہ جنگ کرتے ہیں۔ چاہے باغی فوج جیت جائے، چاہے سرکاری، ہر صورت میں فتح سرکار کی ہوتی ہے۔ زیادہ سوچوں میں نہ پڑو، اس رام لیلا کو دیکھو، دیکھتے رہو۔ یہ جو رنگ ہیں، سب سرکاری ہیں۔ ایک ہی پرزم (Prism) سے نکلتے ہیں۔

شیرے کی انگلی

تذکرہ غوثیہ سے مروی ہے کہ ابلیس کے ایک دوست نے ابلیس سے کہا: یار! تو تو بڑا سیانا ہے، بڑی سمجھ والا ہے، تو نے یہ حماقت کیوں کی؟

کون سی والی؟ ابلیس نے پوچھا۔

بولے، انسان کو سجدہ نہ کیا۔ بڑی سرکار کی حکم عدولی کی۔ ابلیس ہنس کر کہنے لگا: "سبھی اس بھید کو جانتے ہیں، پھر بھی سبھی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔"

دوست نے پوچھا، کس بھید کی بات کر رہے ہو؟ ابلیس نے کہا، سبھی جانتے ہیں کہ اس کائنات پر صرف بڑی سرکار کا حکم چلتا ہے۔ کسی میں دم مارنے کی سکت نہیں۔ کوئی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ جو کرتا ہے، وہ بھی اللہ کی ایما پر کرتا ہے۔ میری کیا مجال تھی کہ میں حکم عدولی

کرتا۔صرف انسان واحد مخلوق ہے جسے حکم عدولی کی توفیق عطا کی گئی ہے۔ بڑی سرکاری کا لاڈلا ہے نا،اس لیے ہم فرشتے تو حکم کے پابند ہیں۔

ابلیس نے اپنے دوست سے کہا، آؤ میں تمھیں تماشا دکھاؤں۔ یہ سامنے چھوٹی سی بستی جو ہے، اسے دیکھو۔ حکم ہے کہ آج یہ بستی ختم ہو جائے گی۔ دوست نے دیکھا کہ بستی کے بازار میں حلوائی نے ایک بڑے سے چولہے پر کڑاہی رکھی ہوئی تھی جس میں چاشنی پک رہی تھی۔

ابلیس بولا، لو تماشا دیکھو۔ یہ کہہ کر اس نے چاشنی سے ایک انگلی بھر کر اسے دیوار پر لگا دیا۔ چاشنی کی بو سونگھ کر مکھیاں آ گئیں۔ مکھیوں کو دیکھ کر چھپکلی نے تاک لگائی۔ کڑاہی کے قریب بلی بیٹھی تھی۔ بلی چھپکلی پر جھپٹی۔ اتفاق سے ایک فوجی ادھر آ نکلا۔ اس کے ساتھ شکاری کتا تھا۔ کتے نے بلی کو جھپٹتے دیکھ کر اسے جا دبوچا۔ بلی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور حلوائی کے کڑاہے میں جا گری۔ حلوائی کو غصہ آیا۔ اس نے کتے کو ایسا کفچہ مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سپاہی نے حلوائی کو پکڑ کر مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اس پر محلے والے باہر نکل آئے اور انھوں نے سپاہی پر حملہ کر دیا۔ سپاہی کی پٹائی کی خبر لشکر میں پہنچی تو وہ گولہ بارود لے کر آ گئے اور بستی کو تباہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر ابلیس نے اپنے دوست سے کہا، دیکھا تم نے، میرا قصور تو صرف اتنا تھا کہ چاشنی کی انگلی دیوار پر لگائی۔ باقی بکھیڑا کس نے کیا؟ لیکن کرنے والے کا نام کوئی نہیں لیتا۔ لوگوں نے بس مجھے ہی نشانہ بنا رکھا ہے۔

صاحبو! ایک بہت بڑا گھپلا ہو گیا۔ ایک بہت بڑا بھید کھل گیا۔ روز بروز کھلتا جا رہا ہے کہ یورپ اور امریکا کے پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں نے جان لیا ہے کہ مستقبل قریب میں اسلام کے سوا کوئی مذہب قابل قبول نہ ہوگا۔ جوں جوں لوگ تعلیم یافتہ ہوتے جا رہے ہیں، جوں جوں سائنسی تحقیق ترقی کرتی جا رہی ہے، توں توں یہ بات کھل کر سامنے آ رہی ہے کہ مذہبی توہمات کے اس بے پناہ جنگل میں صرف اسلام ہی ایک جائے پناہ ہے۔ یہ بات تو عرصہء دراز سے سامنے دھری تھی لیکن ہمیں نظر نہ آئی۔ پتا نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے کہ سامنے دھری نظر نہیں آتی۔

سامنے دھری

میری اماں کہا کرتی تھی، پتر! بات کو چھپاؤ نہیں۔ چھپی ہوئی کو لوگ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ سامنے دھری کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ چھپانا مقصود ہو تو سامنے دھر دو۔ میں پوچھتا، اماں! تو نے یہ بات کیسے جانی؟ کہتی، مجھے میری ماں نے سکھائی تھی۔ میری اماں نے مجھے یہ بات سنائی۔ کہنے لگی، یہ بات سنی سنائی نہیں، بڈ بیتی ہے۔

پرانی بات ہے۔ ان دنوں ہم شہر کے ایک مضاف میں رہتے تھے۔ دیہاتی قسم کا گھر تھا۔ گھر میں تین جی تھے۔ بابا تھے، اماں تھی اور میں تھی۔ بابا اور اماں دونوں بوڑھے تھے۔ میں ابھی کم سن تھی۔ ہمارے ایک عزیز حج پر جانے لگے تو جاتے ہوئے زیورات کی ایک پوٹلی ہمیں دے گئے کہ اس کی حفاظت کرنا۔ اس زمانے یں نہ تو لوہے کے سیف ہوتے تھے اور نہ بینکوں میں لاکر۔ جنب رات پڑی تو اماں اور بابا سوچنے لگے کہ پوٹلی کہاں رکھیں۔ بابا نے کہا، اسے لکڑی کے بڑے صندوق میں رکھ دو اور تالہ لگا دو۔ اماں کہنے لگی، نہ نہ! اگر خدانخواستہ چور آ گئے تو سب سے پہلے وہ لکڑی کا صندوق کھولیں گے۔

بابا کہنے لگے، تو پھر کہاں رکھو گی اسے؟ اماں کہنے لگی، کسی تالے والی جگہ نہ رکھوں گی، نہ صندوق میں نہ الماری میں۔ پھر اماں ساتھ والے کمرے میں گئی جہاں گائے بندھی رہتی تھی اور کونے میں اپلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے پوٹلی اپلوں کے ڈھیر تلے رکھ دی۔

اماں کی بات سچ ثابت ہوئی۔ اتفاق سے ایسا ہوا کہ کچھ دنوں بعد ہمارے ہاں واقعی چور آ گئے۔ انھوں نے سارے صندوق کھولے۔ الماری پر تالہ لگا تھا، اسے بھی توڑ دیا لیکن زیورات کی پوٹلی جوں کی توں اپلوں تلے پڑی رہی۔

اللہ کی ریت

صاحبو! اللہ نے خود اس ریت کو اپنا رکھا ہے۔ ڈال ڈال سے پات پات سے، ذرے ذرے سے جھانک رہے ہیں لیکن سامنے پڑے پر دھیان نہیں جاتا۔ کراچی کے بزرگ مولوی ایوب جو گلی گلی کپڑا بیچا کرتے تھے، بہت بڑے مفکر تھے۔ سچی بات بے دھڑک کہہ

دیتے تھے۔

کہتے تھے، ہمارے چاروں طرف وہ براجمان ہیں۔ پتے پتے سے جھانک رہے ہیں لیکن ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ میاں شکر کرو دکھائی نہیں دیتے۔ جو دکھائی دینے لگیں تو سب کچھ سپاٹ ہو کر رہ جائے۔ رنگ رہے نہ روپ۔ دین رہے نہ دنیا۔ بس اللہ ہی اللہ ہو جائے۔ صاحبو! ایسا لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے کیونکہ سامنے دھری بات لوگوں کو نظر آنے لگی ہے۔

مستقبل کا مذہب

خبریں آ رہی ہیں کہ یورپ میں لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ خبریں حیرت انگیز ہیں، اس لیے کہ یورپ اور امریکا میں عرصۂ دراز سے اسلام کے خلاف بڑی متعصب رائے عامہ پائی جاتی ہے اور وہاں کی لائبریریوں میں مذہب کے متعلق وافر لٹریچر موجود ہے ماسوائے اسلام کے۔ اس کے باوجود لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔

9-9-94 کا نوائے وقت ہی لیجیے۔ اس میں انگریزی خبروں کے صفحے میں ایک خبر درج ہے جسے نوائے وقت نے The News سے نقل کیا ہے اور دی نیوز نے لندن کے سنڈے ٹائمز سے لیا ہے۔ خبر تو لمبی ہے لیکن اس کا پہلا پیراگراف ملاحظہ ہو:

> LONDON: Thousands of British Women are becoming Muslims in a trend that has baffled feminists and caused concern to Christians- Of an estimated 10,000 British converts to Islam over the past decade, most are single, educated women- Doctors, College lecturers and lawyers have converted to the religion

> that is traditionally seen as being oppressive to women, says a report in the Sunday Times.

صاحبو! یہ جو میں نے کہا ہے کہ ایک بہت بڑا بھید کھل گیا ہے، روز بروز کھلتا جا رہا ہے کہ ساری دنیا کے پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں نے جان لیا ہے کہ مستقبل قریب میں اسلام کے سوا کوئی مذہب قابل قبول نہ ہوگا۔ یہ بات صرف میں ہی نہیں کہہ رہا۔ میری کیا حیثیت ہے کہ اتنی بڑی بات کہہ دوں، دنیا کے بڑے بڑے باحیثیت عالم نومسلم یہ بیانات دے رہے ہیں۔ مثلاً چند ایک بیانات سے مختصر اقتباسات پیش کرتا ہوں:

جاپان کے مسٹر موری

ان کا اسلامی نام علی محمد موری ہے۔ انھوں نے 1960ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ لکھتے ہیں: میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ دنیا کو اسلام کی جتنی ضرورت آج ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ اگر دنیا اسلام کی نعمت کو قبول کر لے تو سرزمین ارضی امن و راحت کا لازوال نمونہ بن سکتی ہے اور دکھوں اور بلاؤں میں گھرا ہوا یہ کرّہ باغ جنت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

امریکا کے نامور مفکر اور اہل قلم پروفیسر بینل

ان کا اسلامی نام عبداللہ بینل ہے۔ لکھتے ہیں: سچ تو یہ ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکتا ہے۔

امریکا کے مسٹر مفر

ان کا اسلامی نام سلیمان شاہد مفر ہے۔ ایک بڑے پرجوش پادری تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے ایک بیان میں کہا: حقیقت یہ ہے کہ امریکا کے ہر باشندے کو اسلام کی صحیح صورت دکھانے کی ضرورت ہے۔ آج تک مغرب میں اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں نہیں دکھایا گیا۔ یہاں لوگ عیسائیت اور یہودیت ایسے بے جان مذاہب سے اکتائے بیٹھے ہیں مگر انھیں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسلام کی

دعوت حکمت اور جرأت سے دی جائے۔ تب یہ امر یقینی ہے کہ مغرب کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہو جائے۔

جرمنی کے ڈرک والٹر موسگ

ان کا اسلامی نام سیف الدین ہے۔ کٹر رومن کیتھولک تھے۔ مذہب سے بے حد شغف تھا۔ پادری بن کر زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اپنے بیان میں لکھتے ہیں: قرآن کے بارے میں میری رائے ہرگز اچھی نہ تھی۔ کھولا تو دل و دماغ پر نفرت اور حقارت کے جذبات مسلط تھے۔ ارادہ یہ تھا کہ اس کے موضوعات کی خوفناک غلطیوں، مضحکہ خیز تضادات، بے بنیاد اوہام اور کفریات کی نشاندہی کروں گا لیکن جوں جوں میں قرآن پڑھتا گیا، میرا دل اس کی سچائی سے مسحور ہوتا گیا اور بالآخر میں نے اسلام قبول کر لیا...... میں پورا یقین رکھتا ہوں کہ جو شخص بھی قرآن کو سمجھ کر پڑھے گا، وہ اسلام قبول کر لے گا۔ انشاءاللہ۔ سلامت طبع رکھنے والا غیر متعصب شخص قرآن کو پڑھ کر بے دینی کے اندھیروں میں رہ سکتا ہی نہیں۔

انگلستان کے ایچ ایف فیلوز

برطانیہ کے شاہی بیڑے میں ملازم تھے۔ اپنے بیان میں لکھتے ہیں: اسلام ایک مرتبہ پھر بیدار ہو رہا ہے۔ یہ چیز ثابت ہوتی جا رہی ہے کہ صرف اسلام ہی عہد حاضر کے تقاضوں کو ساتھ لے کر انسان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ باقی سارے مذاہب اور نظریے اپنی حیثیت کھو چکے ہیں۔

انگلستان کے ڈاکٹر شیلڈرک

اسلامی نام خالد شیلڈرک ہے۔ 17 سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ عیسائی مصنفین بے وجہ اور بے ضرورت اسلام کی تذلیل کے درپے ہیں۔ اس پر انھیں خیال آیا کہ وہ اسلام سے اس قدر خائف کیوں ہیں؟ وجہ جاننے کے لیے انھوں نے اسلام کا

مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے جان لیا کہ عیسائی اور یہودیوں نے مل کر اسلام کے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور کہا: آج کون انسان ایسا ہو گا جو بدھ مت کا بھکشو بن کر دربدر بھیک مانگتا پھرے یا یسوع کی طرح دشت نوردی میں زندگی بسر کرے۔ آج اسلام جیسے مذہب کی ضرورت ہے جو انسان کو زندگی کی باوقار اور منفرد راہیں دکھائے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ انشاءاللہ ایک دن تمام دنیا اسلام کا پرچم تھام لے گی۔

صاحبو! یہ چند بیانات ڈاکٹر عبدالغنی فاروق کی کتاب ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں 85 نومسلموں کے بیانات شائع کیے ہیں۔

عجیب وغریب قصے

پرانے مذہبوں نے تخلیق کائنات کے متعلق عجیب وغریب قصے رائج کر رکھے تھے۔ کوئی کہتا دیوتاؤں نے ایک انڈا بنایا تھا۔ پھر اس انڈے کو چھوڑ دیا۔ اوپر کا حصہ آسمان بن گیا اور نچلا زمین۔ کوئی کہتا کہ اوپر زبردست آگ سلگ رہی ہے۔ ہمیں اس آگ سے بچانے کے لیے دیوتاؤں نے آسمان کی ڈھال بنا کر ہمارے اوپر پھیلا دی ہے تاکہ ہم محفوظ رہیں۔ اس ڈھال میں جگہ جگہ سوراخ ہیں۔ ان سوراخوں سے اوپر کی آگ کی جھلکیاں ہمیں دکھائی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ تارے ٹمٹمارہے ہیں۔

زمین کے متعلق یہ خیال عام تھا کہ یہ تھالی کی طرح چپٹی ہے اور ایک بیل نے اسے سینگوں پر اٹھا رکھا ہے۔ جب کبھی بیل پاسا پلٹتا ہے تو زمین ہلتی ہے اور بھونچال آ جاتا ہے۔ کوئی کہتا کہ زمین ساکت ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔

یونانی کہتے تھے کہ سورج ایک بڑا روشن تھال ہے جسے اپالو دیوتا نے اپنی رتھ میں رکھا ہوا ہے۔ رتھ کے آگے گھوڑے جتے ہوئے ہیں۔ اپالو روزانہ اپنی رتھ میں بیٹھ کر زمین کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ اس زمانے میں کوئی مفکر کائنات یا زمین کے متعلق کوئی اور خیال پیش کرتا

تو مذہبی اجارہ دارا سے پکڑ لیتے کہ یہ شخص باغیانہ خیالات کا مالک ہے۔ لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر رہا ہے۔ ملحدانہ خیالات پھیلا رہا ہے۔ اس پر باقاعدہ مقدمہ چلایا جاتا۔ اسے مذہبی پروہتوں کے کورٹ میں میں پیش کیا جاتا۔ اسے یا تو سنگسار کر دیا جاتا یا قتل کر دیا یا زہر دے دیا جاتا۔

یونانی دور کے بعد بھی یہ رسم صدیوں جاری رہی۔ عیسائی راہبوں نے بھی اپنی اہمیت اور عظمت قائم رکھنے کے لیے مفکروں کو ایسی سزائیں دیں جنھیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں حالانکہ عیسائیت میں کائنات کے متعلق ایسے مفروضوں کا جواز موجود نہ تھا جو پروہتوں نے رائج کر رکھے تھے۔

انوکھا مذہب

قرآن کا نزول براہمنوں، پروہتوں، پادریوں پر بم کی طرح گرا۔ ارے یہ کیسا مذہب ہے جو صدیوں پرانے جانے پہچانے مانے ہوئے اعتقادات کو رد کر رہا ہے، جو لوگوں کو علم، عقل اور تحقیق کے راستے پر چلنے کی ہدایت کر رہا ہے۔ جانے بغیر ماننے کی رسم کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔ جو مذہبی اجارہ داری کو نہیں مانتا۔ جو اپنے دین کے عالموں کو کوئی مقام نہیں دیتا۔

دنیا بھر کے براہمنوں، پروہتوں اور پادریوں کو اپنی اجارہ داری خطرے میں پڑتی نظر آئی، خصوصاً پادریوں کو۔ ان دنوں پادریوں اور راہبوں کی حکومت تھی۔ وہ اتنے طاقت ور تھے کہ بڑے بڑے بادشاہوں سے ٹکر لینے سے نہیں گھبراتے تھے۔ لوگوں پر حکومت چلاتے تھے۔ پادری اسلام سے خوف زدہ ہو گئے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف شدت سے پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ یہ قوم جو خود کو مسلمان کہتی ہے، وحشی قوم ہے۔ اپنے مذہب کو تلوار کے زور پر پھیلا رہی ہے۔

سائنسی اشارات

قرآن تخلیق کائنات کے متعلق کھل کر بات نہیں کرتا۔ مختصر اشارات دیتا ہے اور کہتا

ہے کہ ان اشارات کے مطابق تحقیق کرو اور حقیقت کو جان لو۔ مثلاً قرآن کائنات کے متعلق ایسے اشارات دیتا ہے کہ:

1- آسمان اور زمین پہلے دھواں ہی دھواں تھے۔
2- آسمان اور زمین آپس میں جڑے ہوئے تھے۔
3- ہم نے ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔
4- ستارے آسمان میں بغیر کسی سہارے کے معلق ہیں، تیر رہے ہیں۔
5- آسمان ستونوں کے بغیر قائم ہے۔
6- آسمانوں اور زمینوں کو ایک دُوسرے سے جُدا کرنے کے لیے ہم نے ایک دھماکہ کیا، ایسا زوردار دھماکہ کہ جس کی طاقت ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی وہ زمینوں اور خلا کو دھکیلے جا رہا ہے فضا پھیل رہی ہے۔

صدیوں کی تحقیق کے بعد سائنس بھی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ابتدا میں دھواں ہی دھواں تھا، پھر ایک دھماکا ہوا اور اس دھماکے کی قوت ابھی تک جاری ہے۔ سائنس آج اس نتیجے پر پہنچی ہے جس کی نشان دہی قرآن نے چودہ صدیاں پہلے کر دی تھی۔ سائنس اور قرآن میں صرف ایک فرق ہے۔ سائنس سمجھتی ہے کہ یہ کائنات خود بخود حادثہ کے طور پر ظہور میں آئی ہے۔

سائنس کی آوارگی

قرآن نے پہلے ہی ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ دیکھو، اللہ کے حوالے کے بغیر کائنات کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بھٹک جاؤ گے۔ سائنس دان اللہ کے حوالے کے بغیر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی لیے بھٹکے ہوئے ہیں اور کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

یورپین سائنس دان مذہب سے غالباً اس لیے بے زار ہوئے بیٹھے ہیں کہ مذہب کے اجارہ داروں نے ہمیشہ انھیں لعن طعن کی اور سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے گمراہ لوگ قرار دیا۔ آج کے سائنس دانوں کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہو جو عقل و تحقیق کا

شدت سے قائل ہے اور قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا نواں حصہ سائنسی اشارات پیش کرتا ہے اور قاری کو مائل کرتا ہے کہ ان اشارات کے مطابق تحقیق کرے۔

سائنس دانوں میں ایک وصف ہے کہ چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں یا مذہب سے بے نیاز ہوتے ہوں، چاہے وہ کسی ملک یا قوم سے تعلق رکھتے ہیں، وہ علم سے متعلق مخلص ہوتے ہیں۔ جو بات سائنسی طریقہ کار کے مطابق حقیقت بن کر سامنے آ جائے، اس سے انکار نہیں کرتے بلکہ سچے دل سے تسلیم کر لیتے ہیں۔

علمائے دین...... بھڑوں کا چھتہ

ہماری پرابلم صرف یہ تھی کہ یورپی سائنس دانوں کو قرآن کے سائنسی اشارات مہیا کرتے۔ یہ علمائے دین کا فرض تھا کہ یورپ میں قرآن کی اشاعت کرتے لیکن ہمارے علمائے دین تو آپس کے اختلافات میں اس بری طرح سے پھنسے ہوئے ہیں کہ انھیں ایسے کام کی توفیق ہی نہیں۔

1968ء میں جب میں حج کرنے گیا تو اسی سال حکومت پاکستان نے چند علمائے دین کا ایک وفد سرکاری خرچ پر حج کرنے بھیجا تھا۔ سعودی عرب میں چار ایک مقام پر ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں بھی علماء کی گاڑی کو ٹیکس کے لیے روکا گیا، علماء نے جھگڑا کرنا شروع کر دیا کہ ہم سرکاری مہمان ہیں، لہٰذا ہم ٹیکس ادا نہیں کریں گے۔ اس پر ٹول ٹیکس کے سٹاف نے چندہ کر کے خود ٹیکس خود ادا کیا کیونکہ وہاں کوئی ٹیکس سے مستثنیٰ نہیں۔ پھر مدینہ منورہ میں مجھے علماء کے وفد سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مسجد نبوی عام طور پر رات کو مقفل کر دی جاتی ہے۔ کبھی کبھار خصوصی مہمانوں کی درخواست پر اسے چند گھنٹوں کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ حکومت پاکستان کی درخواست پر مسجد نبوی کو علمائے کرام کے لیے کھول دیا گیا۔

وہاں عجب صورت حال دیکھنے میں آئی۔ وہاں علماء کے ذاتی اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ بھن بھن کرتا بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا۔ کوئی کسی کی امامت میں نماز پڑھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جس کو مسجد کا جو مقام ہاتھ آیا، اس نے اس پر قبضہ جما لیا اور کسی دوسرے کو وہاں

آنے کی اجازت نہ دی۔ اس کے برعکس بزرگانہ رویہ کیا تھا۔ ایک روز حضور ﷺ کی جالی تک ہماری رسائی ہو گئی۔ ابھی میں پڑھ ہی رہا تھا کہ قدرت اللہ شہاب بولے، یہاں زیادہ دیر مت رکو، دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس روز اپنے راہبروں کو نفسا نفسی کے عالم میں دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ ہمارے مبلغوں کا یہ حال ہے تو ہمارا کیا بنے گا؟ بہر حال ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تبلیغ اسلام کریں گے، کار لاحاصل ہے۔

تبلیغ اسلام

ہمارے ہاں تبلیغ اسلام کے لیے بہت سی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے ذہن میں تبلیغ اسلام کا کیا مفہوم ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ تبلیغی لوگ کچے مسلمان بنانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ نماز رائج کرنے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہمارے محلے کی مسجد کے لوگ اتنی بڑی بڑی داڑھیاں لگائے، عمامے پہنے سال میں ایک دو بار محلے میں گھر گھر جاتے ہیں، دروازہ بجاتے ہیں اور صاحب خانہ کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ مسجد میں آ کر نماز پڑھا کریں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز پڑھنے سے بندہ پکا مسلمان ہو جاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ نماز شریعت کا ایک اہم رکن ہے لیکن انھوں نے اسلام کو داڑھی رکھنے، تسبیح چلانے اور نماز پڑھنے تک محدود کر رکھا ہے۔ در پردہ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسجد مرکز بن جائے اور مولوی صاحب کی اہمیت اجاگر ہو۔

سائنس دانوں سے مشورے

چاہیے تو یہ کہ قرآن میں جتنے بھی سائنسی اشارات ہیں، سب کو ایک جگہ جمع کر کے بڑے بڑے سائنس دانوں کو بھیج دیے جائیں اور ان سے درخواست کی جائے کہ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ طرز عمل قرآن کے حکم کے عین مطابق ہے۔ قرآن کہتا ہے اگر بات تمھاری سمجھ میں نہ آئے تو ان سے پوچھ لو جو جانتے ہیں۔

حال ہی میں سعودی عرب کے شہر ریاض میں دو بھائیوں نے Foetus کے متعلق قرآن میں جو جو کچھ لکھا ہوا تھا، وہ اکٹھا کیا اور دور حاضر میں Foetus کے Specialist

ایک غیر مسلم سائنس دان کو بھیج دیا۔ اس سائنس دان کا نام تھا کیتھ مور (Keith Moore)۔ کیتھ مور یونیورسٹی آف ٹورینٹو میں پروفیسر تھا۔ اس نے Foetus پر بڑا کام کیا تھا اور بہت سی کتابیں لکھی تھیں جو ٹیکسٹ بکس کے طور پر پڑھائی جا رہی تھیں۔ دونوں بھائیوں نے کیتھ مور کی ہر طریقے سے مدد کی۔ عربی الفاظ کا مفہوم سمجھایا۔ دراصل کیتھ کے لیے ایک مشکل آن پڑی۔ قرآن میں لکھا ہے کہ ابتدائی دور میں Foetus ایک چھوٹی سی جونک کی طرح ماں کے رحم کی دیوار سے چپکا ہوتا ہے۔ کیتھ نے کبھی جونک نہ دیکھی تھی، اس لیے Zoology کے محکمے میں گیا، وہاں جا کر اس نے جونک دیکھی، اس کی تصویریں کھینچیں۔

کیتھ کہتا ہے کہ میں تو حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ قرآن نے Foetus کی جو تصویر کھینچی تھی، وہ صحیح تھی۔ حقیقت کے عین قریب تھی۔ اس کے بعد کیتھ نے اپنی تمام تصنیفات پر نظر ثانی کی اور Foetus کی نئی تصویر کتابوں میں شامل کی۔

جب کیتھ نے ٹورینٹو میں اس کے متعلق بیان دیا تو ایک ہلچل مچ گئی۔ پڑھے لکھے ریسرچ کے پروفیسر بے حد حیران ہوئے۔ اخباروں میں خبریں چھپیں جلی سرخیوں میں لیکن اخباری لوگ اخباری ہوتے ہیں۔ انھوں نے جو سرخی چھاپی، وہ ان کی ذہنیت کی مظہر تھی۔ انھوں نے لکھا:

Surprising thing found in ancient Prayer Book.

اخبار والے بھی سچے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ قرآن ایک مذہبی کتاب ہے اور مذہبی کتابوں میں یا تو نمازیں ہوتی ہیں یا دعائیں۔

قرآن مذہبی کتاب نہیں

کینیڈا کے اخبار نویسوں کا قصور نہیں۔ قصور ہمارا ہے کہ ہم آج تک اہل مغرب کو اتنی سے بات نہیں بتا سکے کہ قرآن کیسی کتاب ہے۔ وہ مسلمانوں سے نہیں، بنی نوع انسان سے مخاطب ہے۔ صاحبو! میں شرمندگی محسوس کر رہا ہوں، اس بات پر کہ ایک نومسلم گورے نے

مجھے قرآن سے متعارف کیا۔ ہمارے ہاں قرآن پر سینکڑوں کتابیں موجود ہیں لیکن یا تو وہ ایسے عالمانہ انداز میں لکھی گئی ہیں کہ ماڈرن ذہن کو اپیل نہیں کرتیں، یا ان کا بیان اس قدر جذباتی ہے کہ وہ ماڈرن ذہن پر الٹا Reaction پیدا کرتی ہیں۔

تبلیغ

سارا قصور ہماری تبلیغ کا ہے۔ ہم میں وہ مشنری سپرٹ نہیں جو عیسائی مبلغوں میں ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی تبلیغ کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ دور دراز اجنبی ملکوں میں جا کر رہتے ہیں۔ عوام میں گھل مل جاتے ہیں۔ مذہب کی بات نہیں کرتے۔ تقریریں نہیں جھاڑتے۔ بحثیں نہیں کرتے۔ مناظرے نہیں کرتے۔ صرف لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔ بیماروں کو دوا دیتے ہیں۔ مایوسیوں کو امید دلاتے ہیں۔ دکھیوں کے دکھ بانٹتے ہیں۔ نیچ ذات والوں کو مساوات دیتے ہیں۔ پاس بٹھاتے ہیں۔ اپناتے ہیں۔ ان کے برتاؤ کا لوگوں پر اتنا خوشگوار اثر پڑتا ہے کہ لوگ خود بخود عیسائیت قبول کر لیتے ہیں۔

دراصل یہ طریق کار صوفیوں کا تھا جو عیسائیوں نے اپنا لیا ہے۔ صاحبو! میں بھی احمق ہوں جو تبلیغ کی بات کر رہا ہوں۔ جب اصل ہی راہزنوں کے ہاتھ لٹ رہا ہے تو منافع کی بات کیا کرنا۔ ہمارے راہبر خود اسلام کو مسخ کر رہے ہیں۔ اسے ریچوال بنائے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اسلام کو جسم کی شکل دے رکھی ہے، روح کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ ان کا تبلیغ کا انداز جارحانہ ہے۔ ان میں شدت ہے۔ وہ حکم چلاتے ہیں حالانکہ قرآن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حکم نہیں چلاتا، Authoritarian نہیں۔ مذہب کے معاملے میں ہمارے مبلغ جذباتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کے معاملے میں جذباتی ہونا ایک وصف ہے۔

شدت

میں بھی عقیدت میں جذباتی ہونے کو ایک وصف سمجھا کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جذباتیت میں محبت ہے، لگن ہے، خلوص ہے۔ میرے بابا مجھے منع کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے،

دیکھ مفتی! عقیدت نہ پال، عقیدہ پال۔ جواب میں میں کہتا، میرے اندر تو عقیدت ہی ہے، عقیدہ نہیں۔ وہ کہتے، تو پھر حضور اعلیٰ ﷺ سے عقیدت لگا، عقیدہ خود سنور جائے گا۔ ان دنوں میرے بابا کے ایک دوست تھے، بڑے بزرگ تھے۔ وہ مجھے بے حد پسند تھے۔ ان میں بڑا جذبہ تھا، رنگ تھا، حضور ﷺ سے والہانہ عشق تھا۔ کھل کر بات کر دیتے تھے۔ بزرگوں کی طرح پہیلیاں نہیں بجھواتے تھے۔ ایک روز میں نے اپنے بابا سے بات کی۔ میں نے کہا، مجھے آپ کے بزرگ دوست بہت پسند ہیں، اس لیے کہ ان میں بڑا جذبہ ہے، بڑا خلوص ہے۔

بابا نے کہا، جذباتیت تو کوئی اچھی چیز نہیں۔

It is a disqualification

ارے! میں گھبرا گیا، چونکا...... وہ کیسے؟

کہنے لگے، حضور ﷺ کو پسند نہیں تھی۔ فرماتے تھے، حد میں رہو، حدیں پار نہ کرو۔ اسلام اعتدال پسندی کا نام ہے، توازن کا نام ہے۔ شدت مسلمانوں کو شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام ٹھنڈے میٹھے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ اس کے برعکس آج اہل مغرب سمجھتے ہیں کہ مسلمان تشدد پسند قوم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے اجارہ داروں کا رویہ شدت بھرا ہے اور وہ شدت جزیت کرتے ہیں۔

☆

باب:11

پُلاؤ کی دیگ

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے ہاں جو اسلام مروج ہے، وہ قرآنی اسلام نہیں بلکہ ان پڑھ اجارہ داروں کی خود ساختہ روایات، خوش اعتقادیاں اور توہمات کا ملغوبہ ہے تو بڑے بھیانک سوالات پیدا ہوتے ہیں:

1- پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم جو خود کو مسلمان سمجھتے ہیں، کیا واقعی مسلمان ہیں؟

2- کیا صرف نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے فرد مسلمان بن جاتا ہے؟

3- کیا اسلام ایک ریچوال کا نام ہے جس پر عمل کرنے کے بعد ہمیں مکمل آزادی ہے کہ جھوٹ بولیں، دھوکا دیں، منافقت روا رکھیں جسے مہذب دنیا ڈپلومیسی کہتی ہے، ہیرا پھیریاں کریں جسے آج سیاست کا نام دیا جاتا ہے؟

4- کیا انا پرست حاکموں اور خود ساختہ ان پڑھ مذہبی رکھوالوں کی من مانیوں کے خلاف کلمہء حق نہ کہنا اخلاقی جرم نہیں؟

آلنا

صاحبو! یہ سوالات بڑے خوفناک ہیں۔ ان پر ہم بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔ کریں تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے، چڑیا کے بوٹ (بچے) کی طرح ہم آلنے سے گر جائیں۔ ہر شخص نے اپنے متعلق خوش فہمیوں کا آلنا بنایا ہوتا ہے۔ یہ آلنا ہمارے لیے باعث سکون ہوتا ہے، باعث اطمینان ہوتا ہے، باعث تحفظ ہوتا ہے۔ یہ خوش فہمیاں ہمیں خود راضی رکھتی ہیں۔ صاحبو! جینے کے لیے خود سے راضی رہنا بڑا ضروری ہے۔

ہمیں حالات سے شکایت ہوتی ہے، خود سے نہیں، چاہے ہمارا کردار کتنا ہی ٹیڑھا کیوں نہ ہو۔ یقین کیجیے کہ ہمارے راہبر ہم سے رنجیدہ خاطر ہیں کہ ہم اسلامی اصولوں پر نہیں چلتے۔ وہ خود پر بہت راضی ہیں۔ انھیں کبھی خیال نہیں آیا کہ انھوں نے بڑی نیک نیتی سے اسلام کو ریچوال میں بدل رکھا ہے۔

دراصل یہ نیک نیتی، خوش فہمی کی پیداوار ہے جسے آج کل Wishful Thinking کہتے ہیں۔ سب سے بڑی خوش فہمی جو راہبروں میں پیدا ہوتی ہے، یہ ہے کہ میں جانتا ہوں۔ مجھے علم ہے، میں عالم ہوں۔ جو سمجھتا ہے کہ میں جانتا ہوں، اس میں مزید جاننے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ دوسروں کی بات سننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسری خوش فہمی یہ ہے کہ چونکہ میں جانتا ہوں، اس لیے میرا فرض ہے کہ عوام (جو نہیں جانتے) کو سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کروں۔

صاحبو! ایسے ہی ہوتا ہے۔ ہر مذہب کے ساتھ ایسے ہی ہوا۔ پہلے Revelation آیا، پھر Revolution آ گیا اور بالآخر Superstition چھا گیا۔ پہلے الہامی باتیں ہوتی ہیں، پھر تعمیری انقلاب ہے۔ اس کے بعد اجارہ دار آ جاتے ہیں اور پھر ریچوال..... معجزات، کرامات، توہمات۔ اجارہ داروں کی آمد کے بارے میں کسی صاحب ذوق نے کیا خوب صورت لطیفہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں:

بھوں بھوں

ایک شام پروانوں کی بستی میں ایک بھڑ بھوں بھوں کرتا آ گیا۔ پروانوں نے پوچھا، آپ کون ہیں؟ بھڑ بولا، میں بھی پروانہ ہوں۔ پروانے بہت حیران ہوئے، ایسا بھوں بھوں کرنے والا پروانہ انھوں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ کہنے لگے، میاں! آپ یہاں انتظار کریں، ہم اپنے بڑے بوڑھوں سے پوچھ آئیں۔ بڑے بوڑھوں نے کہا، یہ بتاؤ کہ وہ جو خود کو پروانہ کہتا ہے، وہ ہے کیسا؟ پروانے بولے، دیکھنے میں عجیب سا ہے، رنگ بسنتی ہے اور بھوں بھوں کرتا ہے۔

بڑے بوڑھوں نے جھانک کر نو وارد کو دیکھا تو بڑے حیران ہوئے۔ بولے، یہ تو کوئی عجیب سی شے ہے، پروانہ نہیں لگتا۔ اندر سے ایک بوڑھا پروانہ بولا، نہ میاں! جلد بازی نہ کرو، کیا پتا پروانہ ہی ہو۔ بڑے بولے، بابا! وہ تو ہم سے بالکل ہی مختلف ہے اور پھر بات یوں کرتا ہے جیسے دھونس دے رہا ہو۔ بوڑھا بابا بولا: میاں آج کل ساری چیزیں ادل بدل رہی ہیں، اس لیے یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ پروانے بولے، تو کیا کریں بابا؟

بابا نے کہا، جا کر اس سے کہو کہ بھائی پروانے! شہر جا اور جا کر دیکھ آ کیا شہر میں بتیاں روشن ہو گئی ہیں۔ پروانوں نے بھڑ سے کہا، بھائی! پہلے شہر جا، جا کر دیکھ آ کہ شہر میں تمام بتیاں جل رہی ہیں کیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد بھڑ بھوں بھوں کرتا ہوا واپس آ گیا۔ کہنے لگا، شہر میں تمام بتیاں جل رہی ہیں، جگمگ ہو رہی ہیں۔ آج عالم اسلام میں اکثر پروانے ایسے ہیں جو بڑی خوشی سے بھوں بھوں اعلان کرتے ہیں کہ شہر میں بتیاں روشن ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے جگمگ جگمگ ہو رہی ہیں۔

صاحبو! یہ کوئی انوکھی بات نہیں، ہر مذہب کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں ہر نئی حکومت کے ساتھ جیالے آ جاتے ہیں، اسی طرح ہر نئے مذہب کے ساتھ رکھوالے آ جاتے ہیں۔ اور جناب سیدھی بات ہے کہ رکھوالے ہمیشہ یہی کوشش کریں گے کہ عوام کو بھیڑیں بنائے رکھیں تا کہ ان کی اجارہ داری قائم رہے۔ ہندو آیا تو ساتھ برہمن آ گئے۔ پھر منو جی نے مستقل بنیادوں پر براہمنوں کی اجارہ داری قائم کر دی۔ ہیومن سوسائٹی کو ذاتوں میں تقسیم کر دیا۔ براہمنوں کو دیوتاؤں کا درجہ دینے کے لیے چھوت کی رسم چلا دی۔ ہندی سوسائٹی کا ایک بہت بڑا حصہ نیچ بنا دیا گیا۔ ہریجن اور غیر ہندو سبھی Untouchables قرار دے دیے گئے۔

دھرم بھرشٹ

1932ء میں جب میں دھرم سالہ کے گورنمنٹ مڈل سکول میں پڑھتا تھا تو مجھے چھوت کے صحیح معنوں کا علم ہوا۔ دھرم سالہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں ہندو

اکثریت تھی۔ سکول میں صرف دولڑکے مسلمان تھے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں بہت پیاسا ہوں۔ ہر دو چار گھنٹوں کے بعد مجھے پانی کی طلب محسوس ہوتی ہے۔ ایک روز جب جماعت کا واحد مسلمان لڑکا چھٹی پر تھا، میں نے ایک ہندولڑکے سے کہا کہ مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم پانی کیوں نہیں لاتے؟ وہ بولا، سر میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ میاں دھرم بھرشٹ تب ہوتا ہے جب تم میرے ہاتھ سے پانی پیو، مجھے پانی پلانے سے نہیں ہوتا۔ میرے سمجھانے کے باوجود لڑکے نے مجھے پانی پلانے سے انکار کردیا...... سر! میرا دھرم بھرشٹ ہوئے جائے ...... پھر دفعتاً بات میری سمجھ میں آ گئی کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں مسلمان کے ہاتھ سے کھانے پینے سے دھرم بھرشٹ ہوتا ہے لیکن ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان کو کھانے پلانے سے بھی دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔

تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ جب میں بھارت کے دارالحکومت دلی میں گیا تو حیران رہ گیا۔ ارے یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں! کیا یہ دلی شہر ہے؟ میں کسی اور جگہ تو نہیں آ گیا۔ کیا ہندو بدل گیا ہے۔ نہیں، نہیں، یہ نہیں ہوسکتا، ہندو کبھی بدل نہیں سکتا۔ کیا ہندو نے چھوت چھوڑ دی۔ کیا Untouchables ختم ہو گئے۔ نہیں نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میرے سامنے دلی کے بازار میں ٹھنڈے پانی کی ریڑیاں چل رہی تھیں۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس صرف ایک آنے میں اور ریڑی پر صرف ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ صرف ایک گلاس اور سبھی اس ایک گلاس میں پانی پی رہے تھے۔ میں نے ایک معزز لالہ جی سے پوچھا۔ میں نے کہا، لالہ جی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ بولے، مہاراج! دھرم اپنی جگہ، بیوپار اپنی جگہ۔

انسان کی تذلیل

صاحبو! سیدھی سی بات ہے، جوں جوں تعلیم عام ہو رہی ہے اور سائنس ترقی کر رہی ہے، توں توں بت پرستی ناممکن ہوتی جا رہی ہے۔ آپ دولت کی پوجا کر سکتے ہیں، اقتدار کی

پوجا کر سکتے ہیں، لیکن بتوں کی پوجا نہیں کر سکتے۔ پھر ایک اور بات ہے! اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑا شرف بخشا ہے۔ اشرف المخلوقات بنایا ہے اسے۔ یہ ساری کائنات انسان کے لیے بنائی ہے۔ قرآن میں اللہ کہتا ہے: اس کائنات کو دیکھو۔ سوچو، غور کرو۔ اس کائنات میں بڑی طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ ہم نے یہ کائنات اس لیے بنائی ہے کہ تم اسے تسخیر کرو اور ان پوشیدہ طاقتوں کو اپنے کام میں لاؤ۔ کتنا بڑا شرف ہے جو اللہ نے انسان کو بخشا ہے۔

ہندو نے انسانوں کے ایک بڑے طبقے کو اس قدر ذلت اور رسوائی کا ہدف بنا دیا ہے کہ ان سے چھو جانا بھی ناگوار ہے۔ چھونا تو درکنار، ان کا سایہ بھی پڑ جائے تو ہندو ناپاک ہو جاتا ہے اور اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ اشنان کر کے پھر سے پوتر ہو جائے۔ انسان کی یہ تذلیل فطرت کے اصولوں کے منافی ہے اخلاق کے اصولوں کے خلاف ہے انسانیت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ ایسا مذہب، قوم یا سرکار جو انسان کی تذلیل کرے، دور حاضر میں پنپ نہیں سکتے۔ اپنی تصنیف ''میکنگ آف ہیومینیٹی'' میں رابرٹ بریفالٹ لکھتے ہیں:

''کوئی انسانی نظام جس کی بنیاد غلط اصول پر قائم ہے، پنپ نہیں سکتا، چاہے ہزار چالاکی یا ہیرا پھیری سے اسے قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔'' ماضی میں بھی ایسے لوگوں کو جنھوں نے انسان کی تذلیل کی، فطرت نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ قدرت کے اس اصول کے مطابق ہندو سماج کا بھی یہی مقدر ہے۔

ناسور

1- بے شک بھارت ایک بڑا ملک ہے۔
2- ایک طاقت ور ملک ہے۔
3- بیرونی خطرات کے خلاف اپنا تحفظ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

لیکن اس کے اندر ایک ناسور ہے، انسان دشمنی۔ انسان دشمنی کا رستا ناسور جو پیپ سے بھرا ہوا ہے جو ایک روز پھٹ کر بھارتی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

صاحبو! یہ میں نہیں کہہ رہا، ساری دنیا کے دانشور بھارت کے اس المیے کو محسوس کر

رہے ہیں۔ پڑھے لکھے دانشور ہندو بھی اس حقیقت کو جانتے ہیں، اگرچہ زبان پر نہیں لاتے۔ بھارت میں علم نجوم ہے۔ بھارت کے نجومی جانتے ہیں کہ یہی بھارت کا مقدر ہے لیکن وہ اس کا اُپائے نہیں کر سکتے۔ اس لیے بے بس ہیں۔ یہ حقیقت اتنی عام ہو چکی ہے کہ آج کل دانشور اخباروں میں بھارت کا جائزہ لیتے ہوئے برملا کہہ رہے ہیں کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا بھارت کا مقدر ہے۔ مثلاً انگریزی اخبار سے ایک تراشہ ملاحظہ ہو۔ (جولائی 1994ء)

> The "aura" of Gandhi and Nehru's personalities and their cherished dream to weave the diversities of India into a beautiful mosaic of unity is fast disappearing and India, over the years, has emerged as the most troubled country where communariots inter-caste rivalries and regionalism has become rampant, threatening the very existence of the country appearing at the brink of disaster and disintegration.

(نہرو اور گاندھی کی شخصیات اور ان کے اس سہانے خواب کا "طلسم" کہ بھارت کی مختلف قومیتوں کی وحدت کی ایک خوبصورت لڑی میں پرونا ہے، تیزی سے ٹوٹ رہا ہے اور کئی برسوں سے بھارت ایک متلاطم ملک کے طور پر سامنے آ رہا ہے جہاں فرقہ ورانہ جھگڑے اور علاقائیت کے جن قابو سے باہر ہو رہے ہیں۔ ان سے ملک کے وجود کو خطرہ لاحق ہے اور بھارت تباہی اور ٹوٹ پھوٹ کے دہانے پر ہے۔)

سیکولرازم

صاحبو! مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ اسلام کیا ہے۔ ہمارے راہبر کہتے ہیں کہ میاں آسان بات ہے! داڑھی رکھ لو، لبیں کٹواؤ، مسجد میں نمازیں پڑھو، خطبے سنو، پاجامے کے پائنچے ٹخنے سے اونچا رکھو، روزے رکھو، زکوٰۃ دو، حج کرو تو تم سچے مسلمان بن جاؤ گے۔ تمھاری روح میں پاکیزگی پیدا ہو جائے گی اور تم بہشت کے حقدار بن جاؤ گے۔ کچھ لوگ جو قرآن کی رہنمائی کے قائل ہیں، کہتے ہیں کہ اسلام کا مقصد یہ نہیں کہ فرد بہشت کا حق دار بن جائے۔ Purification of Soul تو ہر مذہب کا مقصود تھا۔ دنیا میں بیسیوں مذہب آئے، ہر مذہب کا مقصد دیوتاؤں یا خدا کی خوشنودی اور روح کی پاکیزگی حاصل کرنا تھا۔ اسلام عام مذاہب کی طرح نہیں ہے۔ الٹا اسلام تو مذاہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ عام مذاہب میں تنگ نظری کا پہلو اس قدر شدید ہے کہ پڑھے لکھے مفکروں کے لیے مذہب ناقابل قبول ہو جاتا ہے۔ عام مذاہب سائنسی تحقیق کی اجازت نہیں دیتے، اس لیے سائنسی محقق مذہب سے بےزاری کا رویہ اپنانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس لیے سیکولرازم وجود میں آیا ہے۔ مذہب کے خلاف رویہ فیشن بن گیا ہے۔ دراصل یہ رویہ مذہب کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان اجارہ داروں کے خلاف ہے جو مذہب کے رکھوالے بن کر بیٹھ گئے اور احکامات جاری کرنے لگے۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، سوچنا گناہ ہے، تحقیق کرنا کفر ہے۔ عیسائی سائنس دانوں اور مفکروں نے برملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ مذہب ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مغربی مفکروں نے علانیہ کہہ دیا کہ:

1- مذہب ہمارے بچوں کو عقل پر مبنی تعلیم حاصل کرنے نہیں دیتا۔
2- مذہب ہمیں آپس میں لڑاتا ہے۔
3- مذہب امن کا بیری ہے۔
4- مذہب جزا اور سزا کے چکر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مغربی دانشوروں کا کہنا ہے کہ آج انسان اس دور کی دہلیز پر آ پہنچا ہے جسے اہل نجوم

امن کا سنہرا دور کہتے ہیں۔ اس لیے اب ہم پر لازم ہے کہ ہم مذہب کے عفریت کا قلع قمع کر دیں۔ مذہب سے بیزاری کی فضا دراصل مذہب کے اجارہ داروں کے رویے کی وجہ سے پیدا ہوئی جو روز بروز تقویت حاصل کرتی جا رہی ہے۔

سب سے بڑی رکاوٹ

جب انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت میں ہندوستان آئے تو آتے ہی انھیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان ہیں۔

ابتدائی رپورٹ میں انھوں نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے پروگرام تجویز کیے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کا رخ بدل دو۔ ان کی توجہ قرآن سے ہٹا کر فروعات میں الجھا دو۔ ان پڑھ ملا اور اجارہ داروں کی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کرو۔ دوسری تجویز تھی کہ ہندوستان میں مغربی تعلیم رائج کر دو۔ نصاب ایسا مرتب کرو کہ مسلمان نوجوانوں کی توجہ سب سے ہٹ جائے اور وہ سیکولر خیالات کی طرف مائل ہو جائیں۔

زبان

سب سے مشکل تو یہ تھی کہ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں پٹھانوں اور مغلوں کے ادوار کی وجہ سے جو سرکاری زبان رائج تھی، اس میں عربی اور فارسی زبانوں کی آمیزش تھی۔ زبان کی وجہ سے ہندی مسلمانوں کا جذباتی تعلق فارس اور عرب ممالک سے تھا۔ اس تعلق کو ختم کرنا ازبس ضروری تھا۔ لہٰذا انھوں نے اردو زبان کی بنیاد ڈالی جو مقامی زبانوں اور ہندی کی آمیزش سے مرتب کی گئی تھی۔ صاحبو! یوں ہم اردو سے ہوتے ہوئے انگریزی زبان تک پہنچے اور آج صورتحال یہ ہے کہ ہماری کوئی قومی زبان نہیں۔ اردو جسے ہم رابطہ زبان تسلیم کرتے ہیں، وہ ہمارے سیکرٹریٹ کے باہر دھتکاری ہوئی کھڑی ہے۔

سیکرٹریٹ کے اندر گورا صاحب کے بجائے کالا صاحب ہے جو گورے کی نسبت زیادہ سٹیٹس زدہ ہے۔ انگریزی ہماری سرکاری زبان ہے اور سماجی طور پر سٹیٹس سمبل ہے۔ ہمارا دارالحکومت ایک سٹیٹس کالونی ہے جس میں گریڈوں کی ذات پات سختی سے رائج ہے۔

یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو اردو سکول میں داخل کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ بچے میٹریکولیشن کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ او لیول اور اے لیول کرنے کے خواہش مند ہیں۔ انگلش سکول یوں دھڑا دھڑ قائم ہوتے جا رہے ہیں جس طرح برسات میں کھمبیاں اگتی ہیں۔ گورے کا پروگرام پھل لایا ہے۔ نوجوان، تہذیب کو عقل سے گری ہوئی گھٹیا چیز سمجھنے لگے ہیں۔ مذہب پر شرمسار ہیں۔

موسیقی

صرف مذہب ہی نہیں، ہمارا تمام ترورثہ ان کی نظر میں مضحکہ خیز چیز ہے، یہاں تک کہ نوجوانوں میں انگریزی گانے گنگنانے کا رواج چل نکلا ہے اور ان کی بے سری بھدی آوازوں کو ہمارا ٹیلی ویژن بڑے اہتمام سے پیش کرتا ہے۔

ہماری موسیقی سر کی موسیقی تھی جو سیدھی دل پر اثر کرتی تھی۔ انگلش موسیقی تال کی موسیقی ہے جو ٹانگیں جھلانے پر مجبور کرتی ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ اہل مغرب نے ٹانگیں جھلا جھلا کر اپنا سوا ستیاناس کر لیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے نوجوان ٹانگیں جھلانا سیکھ رہے ہیں۔

امن کا سنہرا دور

لوگ کہتے ہیں، مفتی پاکستان کے مستقبل کے متعلق بڑے دعوے کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ پاکستان کا مستقبل بڑا شاندار ہے۔ نشاۃ ثانیہ میں پاکستان دنیائے اسلام کا مرکز بنے گا۔ ایک پروفیسر نے کہا کہ مفتی باباؤں کی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے، ایک مستری بابا آنے والا ہے جو پاکستان کو رنگ و روغن کرے گا۔ صاحبو! میری کیا حیثیت ہے کہ میں ایسے دعوے کروں۔ ایسے دعوے تو ہمارے بزرگ صدیوں سے کرتے آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حدیث میں بھی نشاۃ ثانیہ کا ذکر ہے۔

علم نجوم کے ماہر بھی کئی ایک سالوں سے یہی کہتے آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آسمانوں پر ستاروں کے نئے جھرمٹ نمودار ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ زمین پر ایک سنہرا دور آنے والا ہے جب امن کا دور دورہ ہوگا، سکون و اطمینان ہوگا۔

آج کے دور میں شدت ہے، حرکت ہے، جلدی ہے، اضطراب ہے، بے چینی ہے، تلخی ہے، کشمکش ہے، جنگ و جدل ہے۔ بظاہر تو کوئی ایسی صورت نہیں کہ امن، سکون اور اطمینان کا دور آئے لیکن اگر بزرگوں اور عالموں کی بات مان لی جائے تو ظاہر ہے کہ ایسا دور ہماری وجہ سے نہیں بلکہ ہمارے باوجود آئے گا۔ ایسی حالت میں Providential Factor کو شامل کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

پراویڈنشل فیکٹر

مثال کے طور پر پاکستان کو لیجیے! قیام پاکستان کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں نے کئی ایک سال کوششیں کیں لیکن حالات سازگار نہ تھے۔ پاکستان بننے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ہندو نہیں چاہتا تھا کہ بٹوارہ ہو۔ وہ اٹوٹ ہندوستان کے نعرے لگا تا رہا تھا۔ انگریز کا ابتدا سے ہی ہندو سے گٹھ جوڑ تھا۔ ہندو نے ہمیشہ انگریز کا ساتھ دیا تھا۔ ویسے بھی کردار کے لحاظ سے ہندو بہترین ماتحت اور بدترین آقا ہے۔

ان حالات میں اللہ نے مسلمانوں کو ایک لیڈر عطا کر دیا۔ بے شک محمد علی جناح ایک عظیم لیڈر تھا لیکن پاکستان کے حصول کے لیے اس کا انتخاب بہت غیر موزوں تھا۔ محمد علی جناح اعلیٰ کردار کے مالک تھا۔ وہ اصولوں کا پابند تھا۔

صاحبو! تم ہی بتاؤ، کیا سیاست میں بھی کبھی کوئی اصول کا پابند لیڈر کامیاب ہوا ہے۔ خصوصاً جب مقابلے میں پنڈت نہرو اور پٹیل جیسے گھاگ سیاستیے ہوں۔ ظاہر ہے کہ قیام پاکستان ایک معجزہ تھا۔ پھر یہ بھی قابل توجہ ہے کہ گذشتہ 48 سال سے ہم ..... آپ، میں، ہم پاکستان کو توڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس خداداد پلاؤ کی دیگ کو کھا رہے ہیں، کھائے جا رہے ہیں۔ حرص اور طمع نے ہمیں پاگل کر رکھا ہے۔ شوکت نفس سے ہم فرعون بنے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سے میں میں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اقتدار کے لیے ہم آپس میں یوں لڑ رہے ہیں جیسے بچے کھلونے کے لیے لڑتے ہیں۔

ہماری کوششوں کے باوجود پاکستان نہیں ٹوٹا۔ ہماری شکم پروری کے باوجود یہ دیگ

جوں کی توں بھری ہوئی ہے۔ سڑکوں پر موٹروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دکانیں مال سے لبالب بھری ہوئی ہیں۔ پلازے یوں بن رہے ہیں جیسے برسات میں کھمبیاں اگتی ہیں۔ بازاروں میں اک ہجوم ہے، راستہ نہیں ملتا۔ مارکیٹوں میں پاؤڈر تھپے ہوئے چہروں، کاجل میں تیرتی آنکھوں، معسر خضابوں سے رنگے ہوئے بالوں اور لپ سٹک رنگے دعوتی ہونٹوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ شاپنگ، شاپنگ، شاپنگ، بخار چڑھ رہا ہے۔

ہندوستان سے آنے والے لوگ یہ مناظر دیکھ کر منہ میں انگلی ڈال لیتے ہیں۔ ہے بھگوان! یہ ملک ہے یا میلہ لگا ہوا ہے۔

بشاشت زندگی

جب میں دلی گیا تھا، ایک ہومیوپیتھک سٹور پر کتابیں خرید رہا تھا تو ایک جاندار سکھ خاتون آ گئی۔ آتے ہی بے تکلفی سے پنجابی میں پوچھنے لگی۔ بولی: ''کد آئے پاکستان توں؟'' ارے! میں حیران رہ گیا۔ اس خاتون کو کیسے پتا چلا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں؟ میں نے پوچھا، بتا تجھے کیسے پتا چلا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں؟ بولی، آ میرے ساتھ بازار کی نکڑ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں چہرہ دیکھ کر بتا دوں گی کہ کون پاکستانی ہے۔

کوئی جادو ہے تیرے پاس؟ میں نے پوچھا۔

ہاں ہے۔ وہ مسکرائی۔

وہ بھید مجھے بھی بتا۔ میں نے کہا۔

بولی، جس کے چہرے پر بشاشت ہے، زندگی ہے، رونق ہے، وہ پاکستانی ہے۔

اس لحاظ سے تو تو بھی پاکستانی ہے۔

وہ مسکرائی۔

اس کی مسکراہٹ ان کہی بات سے بھری ہوئی تھی۔ دلی کے بڑے بازاروں میں بھیڑ تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ کاروبار چل رہے تھے۔ لین دین ہو رہا تھا۔ لیکن بے نام اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ میلا نہیں لگ رہا تھا، جو پاکستان میں لگا رہتا ہے۔

کلرزدہ سانپوں کی زمین

پھر ایک اور بات ہے۔ اسلام آباد بننے سے پہلے یہ علاقہ جہاں آج ایک خوبصورت ہرا بھرا شہر کھڑا ہے، یہ علاقہ کلرزدہ ویرانہ تھا۔ راولپنڈی سے دو پتلی پتلی سڑکیں ادھر سے گزرا کرتی تھیں۔ ایک نور پور کو جاتی تھی، ایک سید پور کو۔ ان دنوں نور اور سید پور دونوں تفریح گاہوں کی حیثیت رکھتے تھے چونکہ ان مقامات پر برساتی نالے کثرت سے بہتے تھے جن کی وجہ سے یہ دونوں مقامات تفریح گاہیں بن گئی تھیں۔ ان دونوں مقامات پر پہنچنے کے لیے اس علاقے سے گزرنا پڑتا تھا جہاں آج اسلام آباد واقع ہے۔ ان دنوں یہ علاقہ بنجر اور ویران تھا۔ درخت نہ بوٹا۔ ہم مقامی لوگوں سے پوچھتے کہ بھئی یہاں کاشت کیوں نہیں ہوتی تو وہ جواب دیتے کہ اس علاقے میں کوئی درخت نہیں اگ سکتا اور نہ ہی کاشت ہو سکتی ہے کیونکہ زمین کلر سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں سانپ رہتے ہیں یا نیولے۔

آج اسلام آباد کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی کلرزدہ زمین ہے۔ اس شہر میں درختوں اور پودوں کی رونق ہے۔ اس قدر ہرا بھرا شہر سارے پاکستان میں نہیں۔ یہاں لاکھوں درخت اور پودے ہیں جو مختلف ممالک سے منگوا کر لگائے گئے ہیں۔

میرے صاحبو! مجھے بتاؤ کیا یہ معجزہ نہیں۔ صرف ایک معجزے کی بات نہیں، یہاں تو معجزوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔ ایک کلرزدہ علاقہ جو آج پھولوں کا شہر کہلاتا ہے۔ ایک پھلوں سے لدا ہوا درخت جسے لوگ بری طرح جھنجھوڑ رہے ہیں۔ جھولیاں بھر بھر کر لے جا رہے ہیں۔ پھر بھی وہ ہرا بھرا ہے، پھل سے لدا ہوا ہے۔ ایک دیگ جسے لوگ کھائے جا رہے ہیں، لیکن وہ جوں کی توں بھری ہوئی ہے۔

پلاؤ کی دیگ

تذکرہ غوثیہ سے نقل ہے کہ: شہر میں ایک فقیر آیا۔ اس نے آتے ہی لوگوں سے کہا کہ ایک بہت بڑی دیگ لاؤ۔ لوگ حیران ہوئے کہ فقیر نے دیگ کو کیا کرنا ہے۔ بہر حال انھوں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک دیگ مہیا کر دی۔ فقیر نے کہا کہ چولہا گرم کرنے کے لیے

لکڑیاں اکٹھی کرو۔ چولہا جل گیا تو فقیر نے کہا، اس دیگ کو چولہے پر رکھ دو۔ لوگوں نے احتجاج کیا۔ بولے سائیں جی! خالی دیگ کو چولہے پر رکھنے کا کیا فائدہ؟

فقیر بولا، حجت نہ کرو، جو میں کہتا ہوں، سو کرو۔

مجبوراً لوگوں نے دیگ چولہے پر رکھ دی۔

اگلے روز لوگوں نے دیگ کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دیگ پلاؤ سے بھری ہوئی تھی۔

فقیر نے کہا، اب تم شہر میں منادی کرو کہ حاجت مند لوگ جب بھی چاہیں، فقیر کے دارے میں آ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔

لوگوں نے آنا شروع کر دیا، فقیر دیگ پر کھڑا ہو گیا۔ جو بھی آتا ہے، رکابی بھر چاول نکال دیتا۔ دو ایک دن کے بعد سارا شہر دیگ پر ٹوٹ پڑا۔ فقیر سارا دن چاول بانٹتا رہا۔ رات کو دیگ پر ڈھکنا دے دیا جاتا، اگلے روز جب ڈھکنا اٹھاتے تو دیکھتے کہ دیگ جوں کی توں بھری ہوئی ہے۔

ایک روز فقیر کے سامنے ایک ملنگ آ کھڑا ہوا۔ فقیر نے کہا، میاں یہاں کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے، اپنے حصے کے چاول لے اور رخصت ہو۔

ملنگ بولا، سائیں! میں چاول لینے کے لیے نہیں کھڑا، میں تو تیری زیارت کرنے کے لیے کھڑا ہوں کہ تو اس شہر پر رب بن کر نازل ہوا ہے۔ دھڑا دھڑ لوگوں کو رزق بانٹ رہا ہے۔ فقیر بولا، میاں! رزق تو وہی بانٹتا ہے، میں تو برتاوا ہوں، برتا رہا ہوں۔

صاحبو! پاکستان کی مالی حالت بڑی پتلی ہے۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے لیکن میرے دوستو دیکھو! صرف دیکھو نہیں دیکھو اور سمجھو کہ جس پاکستان کے شہروں میں ہر چوتھی دکان کھانے پینے کی دکان ہے، جہاں لوگ کھا رہے ہیں، کباب کھا رہے ہیں، نہاری کھا رہے ہیں، سری پائے کھا رہے ہیں، یہ دیگ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ ادھر حکمران کھا رہے ہیں، ان کے جیالے کھا رہے ہیں، ادھر افسر شاہی کھا رہی ہے، اس طرف عوام کھا رہے ہیں۔ کھاؤ میرے بھائیو کھاؤ، یہ دیگ کبھی ختم نہیں ہوگی۔

صاحبو! اگر میں کہوں کہ اسلام مذہب ہی نہیں ہے تو کیا آپ میری بات مان لیں گے۔ غالباً نہیں۔ لیکن اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آ جائے گی کہ اسلام میں کوئی ایسی بات نہیں جو ہر مذہب میں لازماً پائی جاتی ہے جو مذہب کی پہچان ہے۔

کیا اسلام مذہب ہے؟

1- کوئی مذہب عقل کو اہمیت نہیں دیتا اور غور و فکر کی تلقین نہیں کرتا۔ الٹا ہر مذہب کا مطالبہ ہے کہ جانے بغیر ہماری بات مان لو۔ دل میں شک و شبہات مت آنے دو۔ عقل پر بھروسا نہ کرو چونکہ تمھاری عقل خام ہے۔ اس کے برعکس اسلام کہتا ہے، عقل انسان کے لیے اللہ کی سب سے بڑی دین ہے۔ اسے کام میں لاؤ، سوچو، سمجھو، فکر کرو، آنکھیں بند کر کے ایمان نہ لاؤ۔ اگر دل میں شکوک پیدا ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ انھیں دباؤ نہیں، ان پر غور کرو۔ جو لوگ جانتے ہیں، ان سے مشورہ کرو۔

2- کوئی مذہب دنیاوی زندگی کو اہمیت نہیں دیتا۔ کہتے ہیں، یہ زندگی ایک سراب ہے۔ آنکھ کا دھوکا ہے۔ فانی ہے، اس دنیا سے دل نہ لگاؤ۔ اصل زندگی وہ ہے جو آنے والی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کہتا ہے کہ یہ زندگی بڑی اہم ہے۔ آنے والی زندگی تو اس زندگی کا نتیجہ ہے۔ یہ بوٹا ہے جس پر وہاں پھل لگے گا۔ جیسا بوٹا ہوگا ویسا ہی پھل لگے گا۔ اس زندگی میں رچ بس جاؤ، ہم آہنگ ہو جاؤ، توازن پیدا کرو، سکھی رکھو، سکھی رہو۔ علم حاصل کرو، اپنا مرتبہ پیدا کرو، دولت کماؤ، بانٹ کر کھاؤ۔ تمام تر اہمیت اس بات پر موقوف ہے کہ تم یہ زندگی کیسے گزارتے ہو!

3- تمام مذاہب دوسرے مذہبوں کے خلاف تعصب پیدا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں صرف میں سچا ہوں، باقی سب جھوٹے ہیں۔ مثلاً ہندوازم کو لیجیے! ہندوازم کے مطابق صرف ہندو پاکیزہ ہیں، باقی تمام مذاہب اور انھیں ماننے والے پلید ہیں، ناپاک ہیں، نجس ہیں، ان سے دور رہنا چاہیے، ان کے ہاتھ سے کوئی چیز لے کر کھاؤ گے تو

دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔ ان کا سایہ بھی نہ پڑے۔ اگر پڑ گیا تو پھر سے پاک ہونے کے لیے اشنان کرنا لازم ہو جائے گا۔ اسلام دوسرے مذاہب سے تعصب کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ غیر مسلموں کے عقائد، بزرگوں، رسم و رواج کی تعظیم پر زور دیتا ہے۔ غیر مسلموں کو برابر کے حقوق دیتا ہے، انھیں نجس نہیں سمجھتا۔ مشاہیر کہتے ہیں کہ اس حوالے سے اسلام کو مذہب کہنا سراسر غلط ہے کیونکہ اسلام میں مذہب والی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔

ہائیں ایسا ہے!

لیکن اب جو بات میں آپ سے کہنے والا ہوں، اسے سن کر آپ چونک جائیں گے۔ ''ہائیں ایسا ہے!'' مسلمان ہونے کے باوجود ہم سب اس بات سے بے خبر ہیں یا اگر خبر ہے تو ہم نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا، اسے سمجھا نہیں۔ بہرحال جب میں نے قرآن پڑھا تھا تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ''ہائیں ایسا ہے!'' نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میری سوئی اٹک گئی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر اٹکی رہی۔ صاحبو! میرا کوئی قصور نہ تھا، بات ایسی ہے کہ سوئی اٹک جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلام کا مقصد صرف افراد کو انسانیت سکھانا نہیں۔ سوسائٹی کے کسی ایک گروپ کو اچھے انسان بنانا نہیں۔ مسلمانوں کو انسانیت کی منزل تک پہنچانا نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کو، چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، انھیں اچھے انسان بنانا ہے۔ انھیں انسانیت کی تمام خوبیوں سے آراستہ کرنا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ''ہمارا کام صرف انسان کی تخلیق کرنا ہی نہیں، یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم انسان کو اس کی منزل کا شعور بخشیں بلکہ اسے منزل تک پہنچائیں۔'' ایسا لگتا ہے جیسے انسانیت، اخلاق اور تہذیب اسلام کے جز و ہوں۔ اسلام کے محلے کی گلیاں ہوں، مسلمان کی پہچان ہوں۔ یارو! میرا دوست فقیر چند چ کہتا تھا۔ کہتا تھا، مفتی! تمھارا اللہ کیسا اللہ ہے، ایک طرف تو اپنی پارٹی بناتا ہے پھر اپنی پارٹی یعنی مسلمانوں کو سپورٹ نہیں کرتا۔ انھیں شہ نہیں دیتا، ان کی پیٹھ نہیں ٹھونکتا، انھیں اپنے جیالے نہیں سمجھتا، الٹا

مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے خلاف نعرے لگانے کی تلقین نہیں کرتا، تعصب کا سبق نہیں پڑھاتا۔ اس ساری دنیا کا رازق بنا بیٹھا ہے۔ ساری انسانیت کو منزل تک پہنچانے کا ذمہ لیے بیٹھا ہے۔ قرآن مسلمانوں پر نازل کرتا ہے، خطاب انسان سے کرتا ہے۔ ہمارے آخری پیغمبر محمد ﷺ جو اللہ کے احکامات جیتے تھے، قرآن جیتے تھے، انھیں ساری دنیا عظیم انسان مانتی ہے، عظیم مسلمان نہیں۔

صاحبو! سچ پوچھو تو اپنی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسلام کیا چیز ہے۔ میرا ایک دوست ہے، اس نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے کہا، یار! مجھے بھی سمجھا دو کہ اسلام کیا ہے۔ وہ ہنسا، بولا، مجھے خود سمجھ میں نہیں آیا، تجھے کیا سمجھاؤں۔ میں نے کہا، وہ جو اتنا سارا مطالعہ کیا ہے تو نے، اس کا نتیجہ نہیں نکلا کیا؟ بولا، نکلا ہے۔ میں نے کہا، کیا نکلا ہے؟ بولا: اللہ سے یارانہ لگ گیا ہے، محمد ﷺ سے محبت ہو گئی ہے، بس اور کسی بات کی سمجھ نہیں آئی۔

انوکھی تنظیم

صاحبو! اسلام ایک انوکھی اور عظیم تنظیم ہے۔

1- نہ یہ Dogma ہے۔

2- نہ Ritual ہے۔

3- نہ ہی اس میں مولویوں اور دینی عالموں کو کوئی اعزازی مقام دیا گیا ہے جیسے کہ ہر مذہب میں پادریوں کو خصوصی اہمیت سے نوازا گیا ہے۔

4- نہ ہی یہ رہبانیت کو جائز قرار دیتا ہے۔

5- نہ ہی یہ Self denial کے لیے خود کو اذیت دینے کے حق میں ہے۔ نہ ہی یہ دنیا سے تیاگ کا سبق دیتا ہے۔

6- الٹا اسلام تو کہتا ہے کہ جیو لیکن آنکھیں بند کر کے نہیں۔ ہم سے جینے کا سلیقہ سیکھو، پھر جیو، پیٹ بھر کر جیو۔ صرف خود ہی نہیں جیو، دوسروں کو بھی جینے دو۔

7- ہمارے راہبر کہتے ہیں، اسلام ایک ضابطہ حیات ہے۔ یہ بات میں ایک زمانے سے سنتا آیا ہوں لیکن میں اس کا مفہوم نہیں سمجھا۔ کسی سے پوچھا بھی نہیں۔ کیسے پوچھتا؟ لوگ کہتے، ویسے تو اُردو کا لکھاڑ بنا پھرتا ہے اور ضابطہ کا مفہوم پوچھتا ہے۔

صاحبو! بہت سے ایسے Phrase ہیں جنھیں میں سمجھتا نہیں لیکن اپنا بھرم رکھنے کے لیے سمجھتا ہوں کہ سمجھتا ہوں۔ پھر ایک دم ہومیو پیتھی کی ایک کتاب پڑھتے پڑھتے دفعتاً مجھے بات سمجھ میں آئی۔ ہومیو پیتھی کی کتاب میں اس درویش ہانمن نے لکھا تھا، ہومیو پیتھی کرو نہیں ہومیو پیتھی جیو۔

کرنا اور جینا

دفعتاً گویا ایک پردہ میری نگاہ سے اٹھ گیا جیسے کسی نے مدھم آواز میں میرے کان میں کہہ دیا میاں کچھ باتیں کرنے کی ہوتی ہیں، کچھ جینے کی۔ ٹھیک تو ہے۔ آپ نے انڈا تلنا ہے۔ یہ کرنے کی بات ہے۔ فرائی پین میں گھی ڈالا، پھر جب گھی کڑکڑایا تو انڈا انڈیل دیا۔ لیجیے انڈا فرائی ہو گیا۔ کرنے کا کام تھا، ختم ہو گیا۔ جو باتیں جینے والی ہیں، وہ ختم نہیں ہوتیں۔ فرض کیجیے، آپ کو کسی خاتون سے محبت ہو گئی ہے۔ رات کو بستر پر پڑے پڑے آپ اس کا تصور قائم کر لیتے ہیں، پھر آہیں بھرتے ہیں، شعر گنگناتے ہیں۔ اس کے بعد یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کتاب کھول کر ارسطو کا فلسفہ پڑھنا شروع کر دیں۔ نہیں جناب! عشق کرنے کی چیز نہیں، جینے کی چیز ہے۔ یہ تو روگ ہے، لگ جائے تو لگا رہتا ہے۔ صبح شام دن دوپہر رات۔ ایسے ہی سارے مذاہب Rituals ہیں۔ سب کرنے کی چیز ہیں۔ مندر میں جاؤ، پوجا کرو، آرتی چڑھاؤ۔ چلو مذہبی فرائض پورے ہوئے۔ اب باقی وقت آرام سے اپنے اپنے دھندے میں لگ جاؤ۔ اس کے برعکس اسلام کرنے کی چیز نہیں کہ دو چار فرض ادا کیے، پھر آرام سے اپنے کام میں لگ گئے۔ نہیں یہ بات نہیں۔ محبوبہ کی طرح اسلام تو کہتا ہے مجھے جیو، صبح، شام، دن، رات ہر وقت جیو۔ ہر کام میرے حوالے سے کرو۔ کوئی میری حوالے کے بغیر نہ کرو۔

اپنا جانو

مثلاً اسلام کہتا ہے، اللہ سے تعلق قائم کرو، اسے اپنا لو، اسے اپنا جانو جیسے تم بھائی بہن، ماں باپ یا دوستوں کو کو اپنا جانتے ہو۔ تعلق کوئی کام نہیں بلکہ رویہ ہے اور رویہ تو ہر وقت قائم رہتا ہے، گھڑی کی طرح ہر وقت ٹک ٹک کرتا رہتا ہے۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پانچوں وقت جائے نماز پر کھڑے ہو کر اللہ کو سلام کرنے سے اللہ سے تعلق پیدا ہو جائے گا تو یہ آپ کی بھول ہے۔ تعلق کوئی چو بچہ نہیں، وہ تو دریا ہے جو ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ اللہ سے تعلق پیدا کرنا ہے تو اسے انگلی لگا کر ساتھ ساتھ لیے پھرو۔ کھانا کھانے لگو تو پاس بٹھا لو۔ کہو یار! آج تو تو نے مجھے اتنی ساری نعمتیں دے ہیں۔ کرکٹ کھیلتے وقت اسے اپنے پاس کھڑا کر لو۔ دوست ایک چھکا لگوا دے، اپنی ٹور بن جائے گی۔ تجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ چھکا کیوں لگوایا۔ رات کو سونے لگو تو اسے ساتھ لٹا لو۔ کہو واہ میرے دوست! سارا دن قدم قدم پر تو نے میرا ساتھ دیا ہے، کیا خوب ساتھ دینے والا ہے تو۔ سبحان اللہ! اللہ سے تعلق تو ایسے ہونا چاہیے جیسے ماں سے ہوتا ہے۔ تھک جاؤ تو اسکی گود میں سر رکھ دو۔ پریشانی ہو تو اس کی آغوش میں سر رکھ کر کہو مجھے تھپک ماں۔ تیری تھپک میں پتا نہیں کیا جادو ہے کہ سب دکھ درد دور ہو جاتے ہیں۔ کھانا کھانا ہو تو اس کے "گوڈے سے لگ کر بیٹھ جاؤ۔ ڈائننگ ٹیبل پر نہ بیٹھنا، وہاں اہتمام ہوتا ہے۔ اہتمام سے بچو۔ اہتمام ہو تو ماں بھی دور ہو جاتی ہے اور وہ بھی دور ہو جاتا ہے۔ امارت سے بچو۔ امارت ہو تو وہ دور ہو جاتا ہے۔ اسے دور نہ ہونے دو۔ اقتدار کے پیچھے نہ بھاگو ورنہ تم اس سے بہت دور ہو جاؤ گے۔

غربت کی عظمت

غربت میں ماں بہت قریب آجاتی ہے، وہ بھی قریب آجاتا ہے۔ افلوس میں ماں کی ممتا کو دولت کا گرہن لگ جاتا ہے۔ صاحبو! ہم نے آج تک غربت کی عظمت کو نہیں سمجھا۔ ہمارا جو لیڈر آتا ہے، وہ آکر غربت کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہے کہ ہم غربت کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے، ہر غربت کا قلع قمع کر دیں گے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ یا اللہ! تو تو خیر عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ انوکھا بھی ہے۔ بے شک تو نے انسان کو انوکھا لاڈلا بنا رکھا ہے لیکن تو خود بھی تو انوکھا ہے، لاڈلا بھی ہے۔ تیری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں لیکن تیرے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی باتیں بھی تو سمجھ میں نہیں آتیں حالانکہ وہ آئیڈیل انسان ہیں۔

میں سوچتا ہوں، حضرت محمد ﷺ جو دو جہانوں کے بادشاہ ہیں، ان کو چولہا کیوں ٹھنڈا رہتا تھا۔ وہ چٹائی پر کیوں سوتے تھے۔ وہ ایک کچے مکان میں کیوں رہتے تھے۔ کھانے کے لیے ان کی چنگیر میں صرف دو کھجوریں ہوتی تھیں۔ کھانے لگتے تو دروازہ بجتا، میں بھوکا ہوں اور وہ ایک کھجور سائل کو دے دیتے اور ایک خود کھاتے۔ میں سوچتا ہوں، وہ جو دو عالم کے بادشاہ تھے، انھوں نے کیوں غربت Select کی۔ کیا وہ پاگل تھے، کیا وہ کم عقل تھے۔ نہیں! وہ تو عقل کل تھے۔ پھر......؟

اگر وہ عقل کل تھے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ غربت میں کوئی بڑی عظمت ہے ورنہ حضور ﷺ کبھی غربت Select نہ کرتے۔ عمومیت میں کوئی بڑی خوبی ہے ورنہ وہ عمومیت کی زندگی بسر نہ کرتے۔ عام لوگوں سا لباس نہ پہنتے۔ بوریا نشین نہ ہوتے۔ ایک عام سے کچے مکان میں رہائش نہ رکھتے۔

صاحبو! میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جن ممالک میں امارت نے قدم رکھا ہے، وہاں سے اللہ رخصت ہو گیا ہے۔ مغربی ممالک میں کوئی اللہ کا نام نہیں لیتا۔ وہاں مذہب غیر ضروری چیز سمجھا جانے لگا ہے۔ گرجے غیر آباد ہو چکے ہیں۔ اگر کچھ کچھ آباد ہیں تو صرف اس لیے کہ ان کی وجہ سے پادریوں کی شوکت نفس قائم ہے۔

روٹی، کپڑا، مکان

میرا بیٹا عکسی ڈاکٹریٹ کے لیے چیکوسلواکیہ گیا تھا۔ وہاں سے وہ مجھے خط لکھا کرتا تھا، ابو! یہاں پراگ میں بڑے خوبصورت گرجے بنے ہوئے ہیں لیکن سب غیر آباد ہیں۔ دروازوں پر زنگ آلود تالے پڑے ہیں اور ابو! ہر گرجے کے پھاٹک پر اللہ بیٹھا ہے۔ وہ

امید بھری نظروں سے راہ گیروں کو دیکھ رہا ہے کہ شاید کوئی اس کی جانب دیکھے لیکن کوئی نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہے۔ لیکن ابو! اللہ ابھی تک اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا۔ یہ وہ ملک تھا جہاں سے کمیونسٹوں نے اللہ کو ملک بدر کر دیا تھا، جہاں کے حاکموں نے کہا تھا اللہ رزق دینے والا کون ہوتا ہے۔ ہم سب کو روٹی کپڑا مکان دیں گے۔ ہم غربت کا نام مٹا دیں گے۔ ہم اس نظام کو بدل دیں گے جو انسان کو Haves اینڈ Have not میں تقسیم کر دیتا ہے، لیکن جب انھیں اقتدار حاصل ہوا تو سب کچھ فیڈ آؤٹ ہو گیا۔ صرف ہم رہ گئے، ہم جو کرتا دھرتا تھے۔ جو روٹی کپڑا مکان دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پاکستان کے ادیب جب روس کے بلاوے پر ماسکو گئے تو بانو قدسیہ بھی وفد میں شامل تھیں۔ ماسکو میں ان کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ مہمان نوازیاں کی گئیں۔ سیر و تفریح کے ٹرپ ہوئے۔

تاشقند

اس کے بعد روسیوں نے وفد کے ہر ممبر سے پوچھا، کیا کوئی ایسی جگہ ہے جسے دیکھنے کی آپ کی خواہش ہو۔ وفد کے ہر رکن نے کسی نہ کسی جگہ کا نام لیا۔ بانو سے پوچھا تو وہ کہنے لگی، میں تو تاشقند دیکھنا پسند کروں گی۔ تاشقند کا نام سن کر کمیونسٹ گھبرا گئے۔ بولے، محترمہ! وہ جگہ تو دیکھنے کے قابل نہیں۔ آپ کوئی اور جگہ منتخب کر لیں۔ بانو نے کہا، مجھے تو وہی جگہ دیکھنی ہے، اگر مجھے وہاں لے جانا ممکن ہے تو ٹھیک، ورنہ میں یہیں ماسکو میں رہوں گی۔ روسیوں نے بڑی کوشش کی کہ بانو کسی اور جگہ کا انتخاب کر لے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی کہ جاؤں گی تو تاشقند ورنہ نہ سہی۔ روسی مجبور ہو گئے۔ وہ بانو کو تاشقند لے گئے لیکن کڑی سیکورٹی میں۔

وہاں جا کر بانو نے دیکھا کہ مسجدوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ محرابوں میں جالے لٹک رہے ہیں۔ گنبد اکھڑے ہوئے ہیں۔ اندر چمگادڑوں نے ڈیرہ لگا رکھا ہے۔ گھروں میں بوڑھی مائیوں نے بانو کو گلے لگایا۔ ان کی آنکھیں خوف سے بھیانک ہو رہی تھیں، بازو

لرز رہے تھے۔ ”تو اللہ کے گھر سے آئی ہے۔“ انھوں نے زیر لبی آواز میں پوچھا اور پھر اسے چومنے لگیں۔ چوم چوم کر بے حال کر دیا، ساتھ ہی ان کے آنسو رواں تھے۔

بانو نے دیکھا کہ ”ہش ہش“ کا عالم ہے۔ بوڑھی مائیاں پچھلی کوٹھڑی میں نماز پڑھتی ہیں تو جوان لڑکے پہرا دیتے ہیں کہ کوئی مخبر نہ جان لے۔ قرآن چھپائے ہوئے رکھے ہیں۔ دروازہ بجتا ہے تو دل ڈوب جاتے ہیں، کوئی آ گیا۔ روٹی کپڑا مکان دینے والوں نے اللہ کو ملک بدر کر رکھا تھا۔

ہمارے ہاں بھی ایک حکمران آیا تھا۔ پیدائشی لیڈر تھے، عالم تھا، Hyper Intelligent تھا۔ عامل ایسا تھا کہ دکھانا جانتا تھا۔ اس نے آتے ہی روٹی کپڑا اور مکان کا دعویٰ کر دیا۔

پلاؤ بھری دیگ

نقل ہے کہ ایک شہر میں ایک مست بابا آ گیا۔ آتے ہی اس نے حکم دیا کہ ایک بہت بڑی دیگ لاؤ۔ دیگ گئی تو بولا، اس دیگ کے لائق ایک چولہا بناؤ، اس میں لکڑیاں رکھ کر بھانبڑ لگا دو۔ چولہا جل گیا، مست نے حکم دیا کہ دیگ میں پانی بھر دو، اوپر ڈھکنا لگا دو، اسے چولہے پر رکھ دو۔ اگلی صبح انھوں نے دیگ کا ڈھکنا اٹھایا کہ وہ پلاؤ سے بھری ہوئی ہے۔ سارے شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ حاجت مند آئیں، انھیں مفت کھانا تقسیم کیا جائے گا۔ اس اعلان پر سارا شہر دیگوں پر اُمڈ آیا مست پلاؤں کی تھالیاں بھر بھر کر دینے لگے۔ اگلے روز انھوں نے دیگ کا ڈھکنا اٹھایا تو دیکھا کہ دیگ جوں کی توں بھری ہوئی تھی۔ اس پر شہر میں مست بابا کی دھوم مچ گئی۔ برتاوے تھالیاں بھر بھر کر لوگوں کو بانٹتے مگر دیگ جوں کی توں بھری تھی۔ حاجت مندوں میں ایک فقیر بھی تھا۔ وہ خالی ہاتھ آتا اور سارا دن کھڑا تماشا دیکھتا رہتا۔ برتاوے کہتے، میاں تو کیوں خالی ہاتھ کھڑا ہے، برتن لا اور چاول لے لے۔ وہ کہتا، میں حاجت مند نہیں ہوں۔

اس بات پر برتاوے بہت حیران ہوتے کہ کھڑا بھی رہتا ہے، ٹر ٹر دیکھتا بھی رہتا

ہے، مگر کھاتا پیتا نہیں۔ انھوں نے مست بابا سے بات کی۔ مست بابا نے کہا، اس شخص کو میرے پاس لاؤ۔ وہ فقیر کو مست بابا کے پاس لے گئے۔ مست بابا نے پوچھا، میاں کیا بات ہے کہ تو سارا دن دیگ کے سامنے کھڑا رہتا ہے لیکن دیگ کے چاول نہیں کھاتا۔

فقیر بولا، میں یہاں چاول کھانے کے لیے نہیں آتا اور نہ ہی اس دیگ کو دیکھنے آتا ہوں، جو سدا بھری رہتی ہے۔ مست بابا نے پوچھا، پھر تو یہاں آتا کیوں ہے؟ فقیر بولا، میں تو تیری زیارت کرنے آتا ہوں، تو جو اس شہر کا رب بنا ہوا ہے اور لوگوں کو رزق تقسیم کر رہا ہے۔

مست بابا کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ وہ چلا کر بولا: ''دیگ کو انڈیل دو۔ چولہے پر پانی ڈال دو۔'' یہ کہہ کے مست بابا نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور شہر سے باہر نکل گیا۔

پاکستانی دیگ

میرے کئی ایک دوست کہتے ہیں، مفتی! یہ کہانی تو نے خود گھڑی ہے۔ یہ تو پاکستان کی کہانی ہے۔ لوگ اس دیگ کو کھا رہے ہیں۔ وہ چلا جاتا ہے تو دوسرا گروپ آتا ہے۔ کھاتا ہے، وہ چلا جاتا ہے تو دوسرا گروپ آتا ہے۔ اس کے جیالے دیگ پر ٹوٹ پڑتے ہیں لیکن یہ دیگ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ دیکھنے میں زبوں حالی کا دور دورہ ہے لیکن سڑکوں پر کاروں کی لائنیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ دکانوں میں مال کے انبار بڑھتے جا رہے ہیں۔ شاپنگ کا بخار چڑھتا جا رہا ہے۔ ہوٹلوں میں فنکشن بڑھتے جا رہے ہیں۔ خواتین کے چہرے گلال ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی بھور کالی آنکھوں سے کرنیں پھوٹتی ہیں۔ سٹیٹس کے درجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ دیگ مست نے چڑھائی تھی اور یہ خود رب جلیل نے چڑھائی ہے لیکن یہ دیگ کی بات تو خواہ مخواہ در آئی ہے، ہم تو غربت کی بات کر رہے تھے۔

ارے یہ میں کہاں آ نکلا ہوں؟

صاحبو! غربت کے چند ایک اوصاف تو سبھی جانتے ہیں، اگرچہ مانتا کوئی نہیں۔ میں

بھی نہیں مانتا تھا۔ میں اس سٹیٹس زدہ شہر اسلام آباد میں 1972ء سے رہتا ہوں۔ یہاں سڑکوں پر بیرے، باورچی، ڈرائیور اور چوکیدار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ صاحب اور بیگمات بنگلوں کے اندر بند ہیں۔ کاروں میں آتے جاتے جھلکی دکھاتے ہیں۔ ہوٹلوں میں، کلبوں میں، فنکشنوں میں جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ باہر سے دیکھو تو یہ شہر ویرانہ ہے۔ اندر تو محفلیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک دن پتا نہیں کیا ہوا، غالباً میں راستہ بھول گیا۔ ایک گلی میں داخل ہوا تو منظر دیکھ کر حیرت سے رک گیا۔ ارے یہ میں کہاں آ نکلا ہوں۔ لگتا تھا جیسے اسلام آباد نہ ہو کوئی اور شہر ہو۔ گلی کے بیچ میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے، ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ چارپائیوں کے اردگرد ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ غل مچا رہے تھے۔ بیبیاں پیڑیوں پر بیٹھی دال چن رہی تھیں۔ جوان لڑکیاں کوارٹروں کی کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں، ایسا لگتا تھا جیسے وہ گلی نہیں بلکہ ایک گھرانہ ہو۔ پتا چلا کہ وہ کوارٹر چپڑاسیوں کی بستی کے ہیں۔ وہ رونق، وہ خوشی، وہ قہقہے، وہ رشتے، ہمدردیاں، اپنائیت غربت کی تھی۔ اللہ خود گلی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور اپنی مخلوق کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

صاحبو! ایسی چند ایک گلیاں آج بھی اسلام آباد میں موجود ہیں۔ اگر آپ اللہ کو دیکھنا چاہیں تو مسجد میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہاں اللہ نہیں ملتا، وہاں اللہ کے اجارہ دار بیٹھے ہیں۔ اللہ سے ملنا ہے تو غریبوں کے محلے میں جاؤ، وہاں اللہ خود بیٹھتا ہے۔ اس کا نام چاروں طرف گونجتا ہے۔ وہاں گھر میں، رشتے ہیں، مامے چاچے ہیں، وہاں اپنے ہیں، وہاں ہمدردی کی محبت ہے، وہاں ملک کی لگن ہے، درد ہے۔

اے پُتر

صاحبو! صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بڑا عالم تھا، استاد تھا، شاعر تھا۔ اس سے غلطی ہو گئی۔ اس نے لکھ دیا:

اے پُتر ہٹاں تے نئیں وِکدے

کیوں لبدی پھریں بازار گوے

اسے لکھنا چاہیے تھا:

اے پُتر بنگلیاں اج نئیں لبدے
کیوں لبدی سلاماں باد گوے

صاحبو! اے پُتر دین ہے غربت کی۔

1965ء کی جنگ میں اگران پتروں کی یلغار کو نہ روکا جاتا تو آج پاکستان کی شکل کچھ اور ہوتی اور انھیں روکا کس نے؟ تنخواہ دار مفاد پرستوں نے جو ڈالروں کے عوض بکے ہوئے تھے۔

صاحبو! میں مستحق نہیں ہوں جو غربت کی عظمت کی تصویر کشی کرسکوں، صرف چند ایک باتیں جانتا ہوں،

1- غربت میں اللہ قریب آجاتا ہے۔

2- غربت ایک دوسرے سے ہمدردی کا درس دیتی ہے۔ غربت کے زور پر ابھی تک ہمارے ہاں فیملی قائم ہے۔ یورپ میں فیملی ٹوٹ چکی ہے۔ بچی کھچی پر جھاڑو پھر رہا ہے۔ جہاں فیملی نہیں، وہاں رشتے نہیں۔ وہاں انسان سوشل اینیمل نہیں بلکہ سٹیٹس اینیمل ہے۔

3- غربت خدمت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

4- مشاہیر کا کہنا ہے کہ دنیا میں جو بڑا آدمی پیدا ہوا، عالم، سائنس دان، محقق، سوشل ورکر، ٹیکنیشن، وہ ہمیشہ غریبوں میں سے ابھرا ہے۔ آج تک دولت مندوں نے کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں کیا۔ دولت مندوں نے ہمیشہ عیاش لوگ پیدا کیے ہیں۔

کالے گورے

5- سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ لوگ جوں جوں امیر ہوتے جاتے ہیں، توں توں ان میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ یورپ اور امریکا میں Fertility کم

ہوتی جارہی ہے۔ اول تو وہاں فیملی ہی نہیں رہی، دوسرے فرٹیلٹی کم ہوتی جارہی ہے۔ تیسرے مادر پدر آزادی کی وجہ سے نوجوان میمیں رات کو گھر جاتے ہوئے رات ساتھی کی تلاش کرتے ہوئے گورے کی نسبت کالے کو ساتھ لے جانے کی خواہاں ہوتی ہیں۔ پتا نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ کالے جوڑے کے ملاپ میں Viberations زیادہ ہوتی ہیں اور جنس کی ساری لذت وائی بریشنز پر موقوف ہے۔ جذبات کے تموجات بڑھتے بڑھتے طوفان بن جاتے ہیں۔

کچھ لوگ تموجات کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ کالے کا جسم Compact ہوتا ہے مسام قریب قریب ہوتے ہیں۔ قریب قریب ہوں تو جسم گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں پکڑ ہوتی ہے۔ جان ہوتی ہے، دھماکہ ہوتا ہے۔ چاہے کوئی بات سچ ہو، نتیجہ یہ ہے کہ کالے گورے کا ملاپ مقبول ہوتا جارہا ہے۔ اس بات پر گورا خوف زدہ ہے کہ پچاس سال کے بعد یورپ اور امریکا میں کالے ہی کالے نظر آئیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے جب گورے کو دیکھنے کے لیے آپ کو چڑیا گھر جانا پڑے۔

صاحبو! معافی چاہتا ہوں، پھر پٹڑی سے اتر گیا، ڈائی گریشن ہوگئی۔

کنڈوم

ادھر امیر لوگوں کی فرٹیلٹی گھٹتی جارہی ہے، ادھر غریبوں کی بڑھتی جارہی ہے۔ گھر کھانے کے لیے روٹی نہیں لیکن آٹھ بچے اودھم مچا رہے ہیں اور نویں کی آمد آمد ہے۔ مغربی مشاہیر کہتے ہیں کہ کنڈوم کو عام کردو، مفت بانٹو، سکول کے بچوں پر عائد کرو کہ ان کی ہر جیب میں ایک کنڈوم ہونا لازمی ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ مجھے یاد ہے جب میں سکس کا طالب علم تھا تو میں نے اپنے ایک دوست کو کنڈوم کا مشورہ دیا تھا۔ جب اس کا تیسرا بیٹا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام ابن کنڈوم رکھ دیا۔

صاحبو! غربت کی خوبیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ غربت تکلیف سہنے کی شکتی پیدا کرتی ہے۔ Resistence کی طاقت پیدا کرتی ہے۔ Survival کی ذمہ داری ہے۔

مجاہد پیدا کرتی ہے۔ آخر میں دنیا کے امیر ترین ملک جاپان کے ایک نومسلم ناکنچی کے بیان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آج عالم یہ ہے کہ جاپان صنعتی اعتبار سے ایشیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک ہے۔ ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی اور اس کے اثرات نے ہمارے معاشرے کو کلیۃً بدل دیا ہے اور مادی نقطہ نظر ہر بات پر حاوی ہے۔ چونکہ ہمارے ملک میں قدرتی وسائل کا فقدان ہے، اس لیے تمام تر انحصار سخت کوشی پر ہے۔ ہمیں اپنا معیار زندگی برقرار رکھنے کے لیے شب و روز محنت کرنی پڑتی ہے اور صرف یہی وہ ذریعہ ہے جس کے سبب ہماری تجارت اور صنعت زندہ رہ سکتی ہے۔ چنانچہ ہم ایک ایسی مادی دوڑ میں مصروف ہیں جہاں روحانیت کا دور دور تک کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ جاپانیوں کی ساری جدوجہد محض دنیاوی مفادات کے لیے ہے۔ انھیں مابعد الطبیعاتی مسائل پر سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ان کا کوئی مذہب ہے نہ روحانی معیار۔ وہ ان نقوش پر سجدہ کناں ہیں جو یورپ کی مادیت نے زمانے پر مرتسم کر رکھے ہیں۔ اس ساری یک طرفہ دوڑ کا نتیجہ ہے کہ روحانی طور پر جاپان زبردست افلاس کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور خوبصورت لباس میں ملبوس ان کے صحت مند جسموں کے اندر بیمار اور مایوس روحیں کراہ رہی ہیں۔

''مجھے یقین واثق ہے کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت اور فروغ کے لیے موجودہ دور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ نام نہاد ترقی یافتہ قوموں نے مادی ترقی تو بلاشبہ کی ہے، مگر وہ زبردست روحانی خلا کا شکار ہیں۔ اسلام اور صرف اسلام اس خلا کو پر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اگر جاپان میں اسلام کی اشاعت کے لیے مناسب اور مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں تو میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ دو یا تین نسلوں کے اندر اندر پورے کا پورا جاپان اسلام کی آغوش میں آ سکتا ہے اور اگر یہ قلعہ سر ہو جائے تو میں سارے مشرق بعید میں اسلام کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر سکتا ہوں۔ مسلم جاپان پوری انسانیت کے لیے باعث رحمت بن سکتا ہے۔''

-☆-

باب:12

دشمنی یا خوف

حیرت کی بات ہے کہ مغربی ممالک میں عام لوگوں کے دلوں میں جو حقارت بھرا تعصب اسلام کے خلاف پایا جاتا ہے، وہ کسی اور مذہب کے خلاف نہیں پایا جاتا۔

مغربی ممالک میں مسلمانوں کو وحشی قوم سمجھا جاتا ہے۔ اسلام ایسا مذہب سمجھا جاتا ہے جو تلوار کے زور پر پھیلا۔ مسلمان کثرت ازواج کی وجہ سے بدنام ہیں، مسلمان عورت کو اپنی جنس کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور بس۔

حقارت بھرا تعصب

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق نے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ عنوان ہے: ''ہم مسلمان کیوں ہوئے؟'' اس کتاب میں 85 نومسلموں کے بیانات درج ہیں۔

تقریباً سب کے سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مغربی ممالک میں اسلام کے خلاف حقارت بھرا تعصب پایا جاتا ہے یہاں تک کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے روادار نہیں۔ مثلاً چند ایک مغربی نومسلموں کی آرا ملاحظہ ہوں:

انگلستان کی محترمہ فردی

جو چرچ آف انگلستان سے وابستہ تھیں، کہتی ہیں: ''اس وقت میں اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اخبارات کے مضامین سے اتنی خبر ضرور تھی کہ اسلام غلامی کا قائل ہے اور اب تک عرب ممالک میں غلامی کا مکروہ کاروبار جاری ہے۔ تعداد ازواج کی صورت میں عورتوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں...... اسکول کے زمانے میں صلیبی جنگوں کے بارے

میں بھی پڑھا تھا جن میں مسلمانوں کو پرلے درجے کا سفاک اور بے رحم بتایا گیا تھا۔''

ڈاکٹر شیلڈرک

انگلستان کے صحافی تھے، وہ لکھتے ہیں:

''مذاہب عالم پر انگلستان کی لائبریریوں میں جتنی بھی کتابیں ملیں، میں نے سب پڑھ ڈالیں۔ کتابوں میں یہودیت، ہندومت اور بدھ مت وغیرہ کے بارے میں تو صرف معلومات تھیں مگر اسلام کا جہاں بھی ذکر آتا تھا، کوئی مصنف بھی طعن و تشنیع کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اسلام کے بارے میں ان کتابوں کا ماحصل یہ تھا کہ اسلام بذاتہ کوئی مستقل مذہب نہیں، بلکہ محض عیسائی لٹریچر سے ماخوذ چند اقوال کا مجموعہ ہے۔ اگر عیسائی مصنفین مذہب اسلام سے خائف نہ ہوتے ..... نہ ہی اُٹھتے بیٹھتے، اس کی توہین و تذلیل کے درپے ہوتے تو میں اسلام کا مطالعہ کبھی نہ کرتا۔''

امریکا کی سسٹر امینہ

جو امریکا کے سنڈے سکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دیا کرتی تھیں، لکھتی ہیں:

''مجھے مسلمانوں سے سخت نفرت تھی۔ میرے نزدیک جیسا کہ عام یورپین سمجھتے ہیں، اسلام وحشت اور جہالت کا مذہب تھا اور مسلمان غیر مہذب، عیاش، عورتوں پر ظلم کرنے والے، اپنے مخالفوں کو زندہ جلا دینے والے لوگ تھے۔ امریکا اور یورپ کے عام مصنفین اور مؤرخ یہی لکھتے آ رہے ہیں۔''

یہ تر خیر پرانی باتیں ہیں جو کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ آج کی بات بھی سن لیجیے جس کو ہفت روزہ ''تصویر پاکستان'' کے 23 ستمبر کے شمارے میں جاوید چودھری نے اپنے کالم میں سنڈے ٹائمز لندن کی حالیہ اشاعت کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرا خیال تھا اسلام ایسا جال ہے جو جکڑ لیتا ہے۔ زندگی کی ساری آسائشیں، آرام اور آزادی شجر ممنوعہ ہو جاتی ہے اور مسلمان ..... ایک بدتہذیب، اجڈ اور وحشی قوم ہیں جو بات بات پر تلواریں سونت کر گلے کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کو سنگسار کر

دیتے ہیں۔ شراب پینے والوں پر کوڑے برسائے جاتے ہیں۔ مرد چار چار عورتیں رکھتے ہیں جو گھروں میں بڑی غلامانہ زندگی گزارتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اپنے اسی تصور کی وجہ سے میں لندن اور اس کے گردونواح میں آباد مسلمانوں سے بچ بچا کر رہتی تھی۔ لیکن ایک دن مجھے مذاہب عالم پر کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا تو محسوس ہوا مصنف جہاں اسلام کا ذکر آتا ہے، فوراً جانبدار ہو کر اس کے خلاف تبلیغ شروع کر دیتا ہے اور اس سلسلے میں اس کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں ہوتی۔ مجھے تجسس ہوا اور میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا اور پھر تیسرے مہینے میں مسلمان ہو گئی۔

یہ ماریہ ہے جو یورپ، امریکا، آسٹریلیا اور مشرق بعید کے ان ڈیڑھ لاکھ افراد میں سے ایک ہے جو پچھلے چند برسوں کے دوران حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اس کا انکشاف ''سنڈے ٹائمز'' نے اپنی حالیہ اشاعت میں کیا۔ اخبار کا کہنا ہے کہ گذشتہ چند برسوں کے دوران برطانیہ کے دس ہزار انگریز شہریوں نے اسلام قبول کیا۔

ان جانے میں

اسلام کے متعلق ایسے حقارت آمیز خیالات رکھنے میں یورپ اور امریکا کے عوام کا کوئی قصور نہیں۔ سالہا سال کے مسلسل اور منظم پروپیگنڈے سے انھیں Condition کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ اور امریکا کے عوام مخلص ہیں، متعصب نہیں، تنگ دل نہیں، تنگ نظری کا شکار نہیں۔

درحقیقت اسلام کے خلاف یہ ایک منصوبہ بند سازش ہے۔ مغرب میں بیسیوں خفیہ سوسائٹیاں اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ پروپیگنڈا عام طور پر بین السطور ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں برملا اور بھونڈے انداز میں بھی ہوتا ہے۔ ان سوسائٹیوں کے محرک یہودی پادری اور راہب ہیں۔

اس پروپیگنڈے کی کامیابی کی وجہ صرف یہ ہے کہ اہل مغرب اسلام کے متعلق بالکل بے خبر ہیں۔ اس کے علاوہ کالے مسلمانوں کا ابتدائی رویہ گوروں سے حقارت پر مبنی تھا۔

علامہ جلال العالم ایک عربی مصنف ہیں جنھوں نے اس موضوع پر ایک کتاب ترتیب دی ہے۔عنوان ہے: ''اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یورپی سازشیں۔''

یورپی سازشیں

ادارہ ندائے فرقان لاہور کے ناظم اعلیٰ قاضی ابوسلمان محمد کفایت اللہ نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور اسے شائع کیا ہے۔اس کتاب سے میں چند ایک اقتباسات اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی اقوام کے اسلام سے متعلق کیا جذبات تھے:

مسٹر آئی یوجین روستو

جو امریکا کا نائب وزیر خارجہ تھا، ساتھ ہی منصوبہ بندی کے شعبے کا صدر تھا، وہ 1967ء تک صدر جانسن کا مشیر خاص رہا تھا۔اس نے اپنے ایک بیان میں کہا:

''حقیقت تو یہ ہے کہ امریکا اسلام کے حوالے سے معاندانہ مؤقف کے سوا کوئی دوسرا مؤقف اختیار کر ہی نہیں سکتا اور امریکا کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ مغربی دنیا اور صیہونی ریاست (اسرائیل) کے بارے میں غیر دوستانہ رویہ اختیار کرے۔ہم امریکیوں کی منصوبہ بندی کی اصل بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم یورپ والوں اور مسلمانوں کے مابین ہر قیمت پر صلیبی جنگیں جاری رکھیں۔''

جنگ عظیم اول میں جنرل ہنی نے بیت المقدس پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا تھا۔اس پر سارے یورپ اور امریکا میں خوشیاں منائی گئیں۔برطانوی وزیر خارجہ مسٹر لائڈ جارج نے اسے صلیبی جنگوں کا آٹھواں حملہ قرار دیا۔جنرل ہنی اور اس کے رفقا کار کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

فرانسیسی جرنیل غورو

شام کو فتح کرنے کے بعد جب دمشق پہنچا تو غازی اسلام صلاح الدین ایوبی کی قبر پر

لات مار کر بولا: ''او صلاح الدین! اٹھ اور دیکھ کہ ہم اپنی شکستوں کا بدلہ لے چکے ہیں اور تیری سرزمین پر فاتحوں کی حیثیت سے لوٹ آئے ہیں۔''

فرانسیسی پارلیمنٹ کے ایک وفد نے کہا کہ مراکش میں ہمیں جنگ و جدل ختم کر دینی چاہیے۔اس پر فرانس کے وزیر خارجہ نے کہا، یہ معرکہ نہیں رکے گا۔ یہ معرکہ فرانس اور مراکش کے مابین نہیں چل رہا بلکہ ہلال اور صلیب کے درمیان چل رہا ہے۔

پھر مسٹر چرچل

بولے۔کہنے لگے: ''بیت المقدس کو مسلمانوں کے غلبے سے رہائی دلانا ہم مسیحیوں اور یہودیوں کا مشترکہ خواب تھا۔ ہمارا نصب العین تھا..... اس بیت المقدس کو اب دوبارہ کسی قیمت پر مسلمانوں کو واپس نہیں کیا جائے گا۔''

صیہونیوں نے اس روز نعرے لگائے: ''آج کے دن خیبر کا انتقام لیا جا چکا ہے۔ محمد ﷺ کا دین دم دبا کر بھاگ گیا۔''

صاحبو! ملکوں اور قوموں کے درمیان جنگیں تو ہوتی رہتی ہیں، پھر صلح بھی ہو جاتی ہے، تعلقات از سر نو نارمل ہو جاتے ہیں۔لیکن مسلمانوں کے خلاف یہودیوں اور عیسائیوں کا رویہ ہمیشہ انتقامی رہا۔صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے انھوں نے جو شکستیں کھائی تھیں، ان کے زخم آج تک رسنے بند نہیں ہوئے۔

آج بھی بیسیوں سوسائٹیاں مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں جن کے متعلق علامہ جلال العالم نے اپنی کتاب ''اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یورپی سازشیں'' میں کوائف جمع کیے ہیں۔مصنف نے ان کوائف سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یورپی اقوام تو اسلام دشمنی سے بھری بیٹھی ہیں۔

دشمنی یا خوف

مجھے مصنف کے اس خیال سے اتفاق نہیں۔میری دانست میں انھیں مسلمانوں سے دشمنی نہیں بلکہ ان کے ذہنوں پر اسلام کا خوف طاری ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک ایسی

تلوار ہے جو اُن کے سروں پر لٹک رہی ہے۔ انھیں احساس ہے کہ اگر یورپی عوام کو اسلامی اصولوں کا پتا چل گیا تو وہ عیسائیت اور صیہونیت سے منحرف ہو جائیں گے، اس لیے وہ اسلام کے متعلق ڈس انفرمیشن پھیلاتے رہتے ہیں۔

بہر حال ان کے بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی عظمت کی معترف ہیں اور اسلام سے خوف زدہ ہیں، مثلاً لارنس براؤن اپنے بیان میں کہتے ہیں۔

''جو چیز حقیقی طور پر ہمارے لیے خطرہ ہے، وہ صرف اسلام ہے ...... ہمارے وجود کے لیے، ہماری تہذیب وثقافت کے لیے کیونکہ اسلام میں آگے بڑھنے، پھیلنے، عوام کے قلب اور ذہن کو مسخر کرنے اور اپنے اندر جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔''

فرانس کے ایک سابق وزیر خارجہ ہانوتو نے اپنے بیان میں لوگوں کو خبردار کیا۔ انھوں نے کہا: ''روئے زمین پر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اسلام نہ پہنچ چکا ہو اور اس نے لوگوں کے دلوں پر اثر نہ کیا ہو۔ اسلام میں بڑی کشش ہے، جاذبیت ہے۔''

جہاد بھرا جن

ایک اور مغربی دانشور البر مشادور نے کہا: ''میرے ہم وطنو، میری بات غور سے سنو! مسلمان بیدار ہو چکا ہے۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ میں موجود ہوں، وہ ہرگز مرا نہیں۔''

اشیابومان نے کہا: ''مسلمان اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے، وہ آگے بڑھ رہا ہے، پھیلتا جا رہا ہے، ڈرو کہ اس میں جہاذ کی قوت ہے۔''

فرانس کی وزارت خارجہ کے ایک افسر نے 1952ء میں بیان دیا: ''مسلمان سے خبردار رہو۔ وہ عالم نو (New World) کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ ایک شاندار مستقبل کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ ہم فرانسیسیوں نے الجزائر میں اپنی حکمرانی کے دوران پوری کوشش کی لیکن ہم مسلمان کا تشخص نہیں چھین سکے۔ مسلمان ایک جن ہے جسے ہم یورپ والوں نے فی الحال مقید کر رکھا ہے۔ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے، اس قابو میں نہ رکھ سکے تو وہ سارے یورپ پر مسلط ہو جائے گا۔''

یورپ اور امریکا کے چند ایک مشاہیر نے اپنے بیانات میں بات بالکل ہی کھول کر سامنے رکھ دی۔ مثلاً برطانیہ کے مشہور وزیر اعظم گلیڈ سٹون نے ایک بیان میں کہا: ''جب تک قرآن مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں پر حکمران رہے گا، اس وقت تک ہم اسلامی مشرق کو اپنے قبضے میں نہیں لا سکتے اور اگر بغرض محال لے بھی آئیں تو تادیر تسلط کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔''

الجزائر میں سو سالہ فرانسیسی قبضے کی ایک تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں فرانس کے گورنر نے تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے برملا کہہ دیا:

''ہم فرانسیسی الجزائر پر اپنے غلبے کو برقرار نہیں رکھ سکتے جب تک الجزائری قرآن پڑھتے رہیں گے اور عربی بولتے رہیں گے، لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہم ان کے دل و دماغ سے قرآن کو محو کر دیں۔''

صرف عیسائیت اور صیہونیت ہی اسلام سے خائف نہیں، کمیونزم کو بھی پورے طور پر احساس تھا کہ اسلام ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

ازبکستان سے اشتراکی پارٹی اپنا ایک روزنامہ ''کیزیل'' شائع کیا کرتی تھی۔ اس روزنامے کے 22 مئی 1952ء کے شمارے پر ایڈیٹر نے جو اداریہ شائع کیا تھا، اس میں انھوں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر لکھا تھا: ''اسلام کو نیست و نابود کیے بغیر کمیونزم کے لیے ازبکستان میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں کہیں بھی جڑ پکڑنا ممکن نہیں۔''

انقلابی مذہب

روس کے مشہور وزیر اعظم خروشیف نے ایک دفعہ الجزائر کے انقلابیوں کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا: ''اسلام اپنی انقلابیت کی حفاظت کرتا رہے گا کیونکہ اسلام انقلابی عوام اور انقلابی اقوام کا دین ہے جسے یورپ کی جنگجویانہ صلیبی ذہنیت کے ہاتھوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔''

اسرائیل کے ایک سابق وزیر اعظم گوریاں نے ایک بیان میں کہا: ''میں بڑی شدت

سے اس بات کا خطرہ محسوس کر رہا ہوں ...... اور ہم میں سے کون ہے جو یہ خطرہ محسوس نہیں کر رہا کہ ایسا نہ ہو کہ کل کلاں عالم عرب یا عالم اسلام میں ایک نیا محمد ﷺ پیدا ہو جائے۔''

اسلام قرآن اور محمد ﷺ کا خوف بھی اہل مغرب کے دلوں پر چھایا ہوا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، باطل ہمیشہ حق سے خائف رہا ہے۔

ماؤ

ایک دن قدرت اللہ شہاب بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے، ماؤ واقعی بڑا آدمی تھا۔

''آپ کے کیسے پتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے، ایک بار میں ان سے ملا تھا۔ ہوا یوں کہ میں چین کے دورے پر گیا تو وہاں میں نے انتظامیہ سے درخواست کی کہ اگر آسانی سے ممکن ہو تو مجھے ماؤ صاحب سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ انھوں نے کہا کہ ان سے ملنے کا کوئی خاص مقصد ہے کیا؟ میں نے کہا، نہیں، بالکل نہیں۔ ان سے ملنے کا کوئی خاص مقصد نہیں۔ میں انھیں بڑا آدمی سمجھتا ہوں اور ان کا احترام کرتا ہوں۔ میں انھیں ایک عام مداح کی حیثیت سے ملنا چاہتا ہوں۔ قدرت اللہ شہاب نے کہا، انتظامیہ کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ بات ٹال دی جائے۔ بہر حال انھوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد مجھے ماؤ سے ملنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ نحیف ہو چکے ہیں اور لمبی ملاقات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا آپ ملاقات کو طول نہ دیں۔

قدرت اللہ نے کہا، میرا خیال تھا کہ ماؤ کسی شاہی حویلی میں مقیم ہوں گے لیکن وہ مجھے ایک عام سی آبادی میں لے گئے۔ ایک عام سی گلی کے ایک عام سے کوارٹر میں وہ مقیم تھے۔ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے پہلا سوال مجھ سے یہ کیا کہ کہنے لگے، کیا یہ ملاقات کسی خاص مقصد کے لیے ہے؟ میں نے کہا، نہیں جناب کوئی مقصد نہیں۔ میں تو آپ کا ایک مداح ہوں اور اظہار تعظیم کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر ان کی خوشی دوچند ہو گئی

اور وہ کھل کر باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔

کمیونزم اور خدا

باتوں کے دوران میں نے کہا، اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک سوال پوچھوں۔

''بالکل پوچھیے۔'' انھوں نے کہا۔ میں نے عرض کی کہ آپ نے جو اپنی تحریک کو God-Less رکھا، کیا اس کا کوئی خاص مقصد تھا؟ وہ مسکرا کر بولے، یہ سوال ہماری مجلس میں اٹھایا گیا تھا۔ وہاں اختلاف رائے تھا۔ کوئی کسی خدا کے حق میں تھ، کوئی کسی اور کے، اس لیے فیصلہ ہوا کہ اس ایشو کا فیصلہ اگلی میٹنگ میں کیا جائے۔ ہر کوئی اپنا مشورہ لکھ کر لے آئے۔

ماؤ نے کہا، میں فلسفے کا طالب علم ہوں اور تمام مذاہب کا مطالعہ کر چکا ہوں، اس لیے میری دانست میں کمیونزم کے پیچھے اسلام کے خدا کے سوا کوئی خدا قائم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس موضوع پر ایک مقالہ تیار کر لیا تا کہ اسے اگلی مجالس میں پیش کر دوں۔

پتا نہیں کیسے ہمارے پروگرام کا انگریزوں کو علم ہو گیا۔ انھوں نے ہندوستان کے علمائے دین سے کمیونزم کے خلاف فتوے حاصل کیے۔ یہ فتوے بہت متشدد تھے۔ انھوں نے ان فتووں کو شائع کر کے لاکھوں ہینڈ بل ہوائی جہاز کے ذریعے گرا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہماری مجلس کی نشست ہوئی تو ہر رکن کی میز پر ہینڈ بل پڑا تھا، لہٰذا میرا مقالہ پڑھنا آؤٹ آف کوسچن ہو گیا۔

قدرت اللہ نے ماؤ سے پوچھا، کیا میں آپ کے اس بیان کا حوالہ دے سکتا ہوں۔

ماؤ نے سر نفی میں ہلا دیا۔ کہنے لگے، میری زندگی میں نہیں۔

ایک روز میں نے قدرت اللہ سے پوچھا کہ فرض کیجیے، ماؤ کا مشورہ قبول کر لیا جاتا اور کمیونزم اسلام کے خدا کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟

قدرت اللہ نے جواب دیا کہ کمیونزم کبھی اللہ کو قبول نہ کرتا۔ اگر کر لیتا تو ساتھ ہی اسلام کو قبول کرنا پڑتا اور اگر اسلام کو قبول کر لیتا تو اس کا اپنا تشخص ختم ہو جاتا۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں

یورپ اور امریکا کے عیسائی اور صیہونی پادریوں اور راہبوں نے اسلام کے خلاف نفرت اور حقارت بھرے جذبات پھیلانے کا ایک مربوط پروگرام بنایا۔ انھوں نے مصنفوں، مفکروں، دانشوروں، عالموں اور لیڈروں سے اسلام کے خلاف تحقیر آمیز بیانات دلوائے اور میڈیا کے ذریعے ان کی تشہیر کی۔ ان کا یہ پراجیکٹ بہت کامیاب رہا، لیکن اس دوران مغربی عوام نے بہت ترقی کر لی۔ اب انھیں یہ بات کھلنے لگی کہ بغیر کسی وجہ کے، بغیر کسی دلیل کے اسلام کے خلاف ایسے حقارت بھرے بیانات کو کیوں نشر کیا جا رہا ہے۔ ان کی توجہ اسلام کی طرف مبذول ہو گئی اور ان کے دلوں میں اسلام کے متعلق جاننے کا جذبہ بیدار ہو گیا یعنی اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈا مثبت جذبات پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔

عرصہ دراز تک مغربی اخبارات اور مصنف مسلمانوں کو محمڈن لکھتے رہے۔ مطلب یہ تھا کہ یہ مذہب محمد ﷺ نے تخلیق کیا ہے اور قرآن الہامی کتاب نہیں بلکہ محمد ﷺ نے تصنیف کی ہے۔ محمد ﷺ کو Mohammad نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ Mohammet لکھا جاتا تھا اور یہ "t" تحقیر کی علامت تھی۔

تشخص بدل دو

پھر بقول نومسلم فارنیرز کے Wiser Councils prevailed صیہونی اور عیسائی علما نے سوچا کہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنا بے کار ہے بلکہ الٹے اثرات کا حامل ہے، اس لیے آسان کام یہ ہے کہ مسلمانوں کا رخ بدل دو۔

مسلمانوں کا رخ بدلنے کے لیے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ مغربی تعلیم کو عام کر دو۔ مغربی تہذیب کو فیشن میں بدل دو۔ سٹیٹس سمبل بنا دو۔ مغربی خیالات کے زیر اثر مسلمانوں کی توجہ مذہب سے ہٹ جائے گی۔ وہ مذہب کو ایک غیر ضروری چیز سمجھنے لگیں گے اور زندگی کی جانب ان کا رویہ مادی اور سیکولر ہو جائے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی شکل مسخ کر دو۔ اسلام کو بھی عام مذہبوں کی طرح

ریچوال میں بدل دو۔ مسلمانوں کی توجہ علم، عقل اور تحقیق سے موڑ دو اور انھیں رسمی عبادات، پیر پرستی اور خانقاہی نظام کی طرف متوجہ کر دو۔ اس طرح وہ ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی کی جانب چل نکلیں گے۔ تعویز گنڈے اور وظیفے وظائف کو اپنا لیں گے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان پڑھ اجارہ داروں کی ایک ایسی جماعت قائم کر دو جو مسلمانوں کو فروعات میں پھنسائے رکھے۔

اپنے ان منصوبوں میں مغربی اقوام کامیاب ہیں اور انھیں اپنی کامیابی کا پورا شعور ہے۔

فرانس کا بادشاہ لوئی ہشتم جب مسلمانوں کی قید سے آزاد ہوا تو اس نے یورپی عیسائیوں کے ارباب اختیار سے مل کر ایک لائحہ عمل بنایا جس کا مقصد اسلام کو ختم کرنا اور مسلمانوں کو یورپی تسلط میں لانا تھا۔

اس پالیسی ساز کا لائحہ عمل آج بھی پریس میں محفوظ ہے۔ اس کی شقیں مختصر طور پر یہ ہیں؟

1- مسلمانوں کے درمیان اختلاف وتفرقہ پیدا کرو۔
2- تفرقہ پیدا ہو جائے تو اسے مزید گہرا کرو۔
3- مسلمان ممالک میں نیک اور صالح حکمرانوں کے قیام کو ناممکن العمل بناؤ۔
4- مسلمان ممالک میں Corruption کو ہوا دو۔ انتظامیہ میں رشوت اور اقربا نوازی کی رسم ڈالو۔
5- عورتوں کے ذریعے اہلکاروں کے اخلاق داغ دار کرو۔
6- مسلمانوں میں جذبہ جہاد کو کمزور کرو۔
7- عرب ممالک میں پھوٹ ڈالنے کی پالیسی پر عمل کرو۔

بے شک یورپی ممالک اس تخریبی پروگرام میں بہت کامیاب ہیں۔

ان کی سب سے بڑی کامیابی تعلیم کے میدان میں ہے۔ انھوں نے ایک ایسا نظام تعلیم چلا رکھا ہے جس کے تحت مسلمان نوجوانوں میں سیکولر جذبات پرورش پا رہے ہیں۔ وہ

مذہب کو تنگ دلی کا نظام سمجھنے لگے ہیں۔ اپنے مذہب اور کلچر پر شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ مغرب کے میس (Mass) کلچر نے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ انگریزی زبان اور یورپی کلچر ہمارے لیے سٹیٹس سمبل بن چکے ہیں۔

قومی زبان

1947ء میں جب برطانیہ ہندوستان سے گیا تھا تو لاہور میں صرف تین انگریزی سکول تھے، اب تین ہزار سے زائد ہیں۔ اسلام آباد کے سکولوں میں بچے میٹریکولیشن کے لیے نہیں بلکہ او لیول (O, Level) اور اے لیول (A, Level) کے لیے تیاری کر رہے ہیں۔ ان کا نصاب آکسفورڈ اور کیمرج میں تیار ہوتا ہے۔

ہمیں آزادی ملے 48 سال ہو چکے ہیں لیکن آج تک ہماری کوئی قومی زبان نہیں۔ اس مسئلے کو ایسا سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے کہ لگتا ہے جیسے قومی زبان کا مسئلہ کبھی حل نہ ہوگا اور دفتروں میں انگریزی زبان کا راج رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بیوروکریٹ انگریزی رنگ میں رنگے رہیں گے۔ وہ انگریزی کو سٹیٹس سمبل سمجھتے رہیں گے۔ اسلام آباد میں 20 گریڈ کا افسر 18 گریڈ کے افسر سے سوشل رابطہ نہیں رکھے گا۔ سی ایس پی کا 17 گریڈ کا افسر نان سی ایس پی افسر سے ملنے میں کسر شان محسوس کرے گا۔ سکولوں اور کالجوں میں گروپ بنے ہوئے ہیں۔ انگلش میڈیم والے اردو میڈیم کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

حالات بہت تاریک ہیں۔ مسلم ممالک پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے...... لیکن ٹھہریے! اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک کرن چمکی ہے۔

بین الاقوامی مسلمان علماء اور دانش وروں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

وہ مسلمانان عالم سے پوچھ رہے ہیں کہ بھائیو! کیا ہم مسلمان ہیں؟

بیداری کی کرن طلوع ہو رہی ہے۔

صاحبو! مغرب کی اسلام دشمن تحریکوں کے بارے میں جان کر اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو

جایئے گا کہ مغرب کے عوام، اسلام کے خلاف تعصب سے بھرے ہوئے ہیں۔ اہل مغرب کے خلاف ہم عیب جوئی کرتے رہتے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغرب کے عوام منافق نہیں ہیں اور وہ ذہنی طور پر بددیانت نہیں ہیں۔

حکومتیں، عوام

صاحبو! میں مغربی عوام کی بات کر رہا ہوں، حکومتوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔

امریکی حکومت اور اس کے صلاح کار یہودیوں کی تعصب بھری پالیسیوں کی وجہ سے آج امریکا ہماری نگاہ میں بری طرح سے گر چکا ہے۔ امریکا کا نام ہی اس قدر متعفن ہو چکا ہے کہ ہمارے عوام اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ امریکی حکومت اور چیز ہے، امریکی عوام اور چیز۔

تعصب بھری فضا

باقی مغربی ممالک کی حکومتوں اور عوام کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ اگر مغرب کے عوام، اسلام کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں نے، صدیوں کے جلی اور خفی پروپیگنڈے سے اسلام کے خلاف ایک تعصب بھری فضا پیدا کر رکھی ہے جس طرح اونچی ذات کے ہندوؤں نے ہریجنوں کے خلاف نفرت اور حقارت کی فضا پیدا کر رکھی ہے۔

اہل مغرب اسلام سے واقف نہیں ہیں۔ یا تو وہ پادریوں اور یہودیوں سے کروسیڈز کے سنے سنائے قصوں سے متاثر ہیں یا ان لوگوں کے رویوں کو دیکھ کر اندازے لگاتے ہیں، جو خود کو مسلمان کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں بھی مذہبی اجارہ داروں نے اہل مغرب کے خلاف، تعصب کی ایک فضا پیدا کر رکھی ہے کہ وہ مذہب کے دشمن ہیں، سیکولر ہیں، جنسی اخلاق سے بے بہرہ ہیں، جنسی عیاشی کے دلدادہ ہیں، برہنگی اور ہم جنسی کو روا رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں تصویروں کی ایک نمائش ہو رہی تھی۔ گیلری میں بہت سے لوگ تصویریں

دیکھ رہے تھے۔ ایک تصویر کے سامنے برناڈ شا کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ایک معمر خاتون کھڑی تھی خاتون نے غور سے تصویر کی جانب دیکھا۔ پھر بولی: ''اس تصویر میں مجھے عریانی کی جھلک نظر آ رہی ہے، کیوں مسٹر شا! آپ کا کیا خیال ہے؟''

شا نے جواب دیا: ''محترمہ! تصویر کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا، البتہ آپ کی نگاہ میں Obscenity کی جھلک ضرور ہے۔''

صاحبو! سچی بات یہ ہے کہ ہم سب حق کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اہل مغرب بھی سیدھا راستہ تلاش کرنے میں مصروف ہیں، ایسا راستہ جو انسان کو فلاح و بہبود کی طرف لے چلے۔ جو متلاشی راستہ ڈھونڈے گا، وہ غلط راستے پر بھی نکل سکتا ہے، جان بوجھ کے نہیں سہواً۔ اہل مغرب آج مذہب سے اس لیے بیزار ہیں کہ مذہب کے نام پر بھی آج تک بلکہ آج بھی ظلم ڈھائے گئے ہیں۔ اس وجہ سے اہل مغرب سیکولر ہو گئے، لیکن اہل مغرب ایک بہت بڑی حقیقت کو نظر انداز کر گئے اور آج بھی نظر انداز کیے بیٹھے ہیں۔

اللہ

صاحبو! مذہب کو ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اللہ کو نہ ماننے سے بہت فرق پڑ جاتا ہے۔

اگر آپ اللہ، یعنی اس عظیم کائنات کے تخلیق کار کو نہ مانیں تو کائنات کی یہ معظم تخلیق ایک بے ربط پھیلاؤ بن جاتی ہیں۔ ایک بے معنی بے مقصد گورکھ دھندا، ایک اندھا بہاؤ جس کی نہ کوئی سمت ہے نہ منزل، جو اتفاقاً ظہور پذیر ہو گیا۔

مجھے حیرت ہوئی ہے کہ مغربی ممالک کے دانشور، سائنس دان حتیٰ کہ عوام بھی، جو عقل کے دلدادہ ہیں اور شعور کو اہمیت دیتے ہیں، وہ اس کائنات کو ایک اتفاقیہ تخلیق کیسے مان سکتے ہیں؟ پھر یہ بھی ہے کہ اتفاقیہ تخلیق میں اتنا کڑا نظم و نسق تو نہیں ہو سکتا اور اگر یہاں نظم و نسق نہیں تو پھر تحقیق ایک لاحاصل عمل ہے، پھر وہ تحقیق میں کیوں مصروف ہیں؟ اس قدر مصروف کہ خود کو بھلائے بیٹھے ہیں۔

ڈاکٹر شمشاد ہارون جب امریکا سے پیرا سائیکالوجی کی تعلیم مکمل کر کے پاکستان آئیں تو مجھ سے کہنے لگیں: مفتی! میں نماز پر ایک کتابچہ لکھنا چاہتی ہوں۔

نماز

میں نے کہا: ''بی بی! نماز پر تو بیسیوں کتابیں لکھی ہوئی ہیں، اردو بازار بھرے پڑے ہیں۔ تو نماز پر کیا لکھے گی؟''

کہنے لگی: ''وہ سب کتابچے جن سے اردو بازار بھرے پڑے ہیں، ان میں نماز لکھی ہوئی ہے کہ کون کون سی آیت پڑھو، رکوع میں کیا پڑھو، سجود میں کیا پڑھو، ان میں تو نماز پڑھنے کے طریقے لکھے ہوئے ہیں۔ نماز پر تو آج تک کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔''

میں نے کہا: ''بی بی! نماز تو اللہ کا حکم ہے۔ پڑھو، فرض ادا کرو اور جان چھڑاؤ۔ تم نماز پر کیا لکھو گی؟''

کہنے لگی: ''کبھی کسی نے حفظان جسمانی صحت کے نقطہ نظر کے حوالے سے نماز پر کچھ نہیں لکھا۔ ذہنی حوالے سے کچھ نہیں لکھا۔ ٹرانکولائزر کے حوالے سے کچھ نہیں لکھا، ہمارے راہبر نماز لکھتے ہیں، نماز پر نہیں لکھتے اور اگر لکھیں بھی تو جزا سزا کی ڈگڈگی بجاتے ہیں، خوف کا بندر نچاتے ہیں، لوگوں کو سکون پہنچانے کے بجائے اضطراب پھیلاتے ہیں۔ مفتی جی! نماز تو بہت بڑی Tranquiliser ہے۔''

محروم

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا: ''ڈاکٹر! یہ بتاؤ کہ تو جو اتنے سال امریکا رہی ہے، وہاں بھرپور زندگی گزاری ہے۔''

''اونہوں۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا: ''امریکا میں سب کچھ میسر ہے، سب کچھ، لیکن بھرپور زندگی نہیں ہے۔ وہ لوگ بھرپور زندگی سے محروم ہیں۔''

''ارے۔'' میں نے کہا، ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انھیں سب کچھ حاصل ہو لیکن بھرپور زندگی سے محروم ہوں۔''

پتا نہیں ایسا کیوں ہے، لیکن ایسا ہے۔" اس نے جواب دیا: "ان کی زندگی میں صرف دو چیزیں ہیں...... کام، کام، کام اور پھر وہ کام اور تفریح کے چکر میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ انھیں کبھی فرصت نہیں ملی۔ انھیں مادیت نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اتنی فراغت نہیں ملتی کہ وہ سوچیں کہ یہ کام اور تفریح کا چکر کیا ہے، کیوں ہے، اس کا انجام کیا ہے، مقصد کیا ہے؟"

ڈاکٹر شمشاد سچ کہتی ہے۔

مادیت کا گرداب

اہل مغرب نے اکنامکس کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں اکنامکس حاوی ہے۔ انھیں "سٹینڈرڈ آف لونگ" کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ معیار زندگی اونچا کرو، اور اونچا، اور اونچا اور سٹینڈرڈ آف لونگ کیا ہے؟ چیزیں، چیزیں، چیزیں۔ فرد کی حیثیت چیزوں سے ناپی جاتی ہے۔ صرف فرد کی بات نہیں، ملکوں اور قوموں کی حیثیت اور اہمیت "سٹینڈرڈ آف لونگ" سے ماپی جاتی ہے۔ لمبے چوڑے شمارے مرتب کیے جاتے ہیں، پھر باقاعدگی سے شائع کیے جاتے ہیں کہ فلاں ملک کی کیا حیثیت ہے، اس کے افراد کی "پر کیپٹا انکم" کیا ہے، ان کے پاس کتنے ریڈیو سیٹ، کتنے ٹیلی ویژن سیٹ ہیں، کتنی کاریں ہیں؟ جن ملکوں کے افراد کے پاس زیادہ چیزیں ہیں، وہ "ایڈوانسڈ" یا ترقی یافتہ سمجھے جاتے ہیں۔ جن کے پاس کم چیزیں ہیں، وہ "بیک ورڈ" سمجھے جاتے ہیں یا ان کا دل رکھنے کے لیے انھیں ترقی پذیر کہا جاتا ہے۔ بہرحال ترقی کا انسان یا افراد سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی چیزوں سے تعلق ہے، اس کی آمدنی سے تلعق ہے، دولت سے تعلق ہے۔ اہل مغرب کے نزدیک زندگی کا مقصد "اکنامک ڈویلپمنٹ" ہے، ہمدردی، قربانی یا خدمت اور محبت نہیں۔ اگر یہ انسانی اوصاف ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت رکھتے ہیں تو صرف اکنامک ڈویلپمنٹ کے حوالے سے۔ اگر وہ اکنامک ترقی میں مدد دیتے ہوں تو، ورنہ ذاتی طور پر انھیں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اس صورتحال کا نتیجہ کیا ہے؟

بیداری کا لمحہ

کام اور تفریح کے چکر میں چلتے چلتے دفعتاً ایک دن فرد رک جاتا ہے۔ سوچنے لگتا ہے، یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ اس Merry go round کا مقصد کیا ہے؟ انجام کیا ہے؟ کیا انسانی زندگی کا یہ مقصد ہے کہ مشقت کرو، کماؤ اور پھر اپنی پونجی تفریح گاہ کی نظر کر دو؟ اور یہ تفریح کیسی ہے؟ سکون دیتی ہے نہ اطمینان۔ الٹا شدت کی گھمن گھیری چلا دیتی ہے۔ کھاؤ، پیو اور ننگی عورتوں کے جھرمٹ میں اپنی نسوں کو تن تنا کر شہوت کا گٹار بجاؤ اور لذت کی گھمن گھیری کے بعد بے جان ہو کر گر پڑو۔ سوچ کا یہ لمحہ، ہر فرد کی زندگی میں آتا ہے۔ کوئی اسے ٹال دیتا ہے، کوئی ڈوب جاتا ہے۔

بہرحال اس لمحے کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکا کے آدھے ہسپتال، مینٹل ہسپتال ہیں۔ ریاست نیویارک کا 1/3 سے زائد بجٹ اپنے مینٹل ہسپتالوں کو چلانے پر خرچ کیا جاتا ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ مغربی ممالک میں خودکشی اس قدر عام کیوں ہے؟ مشاہیر کا کہنا ہے کہ یہ سب اس ایک لمحے کا نتیجہ ہیں۔ ایک امریکی فرد چونک کر رک جاتا ہے، یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ میں کس "میری گو راؤنڈ" کے چکر میں پھنسا ہوا ہوں؟ اس مشقت اور تفریح کا مقصد کیا ہے؟ انجام کیا ہے؟

صاحبو! یہ ایک لمحہ بڑا ظالم ہے جو مغرب میں ایک شخص کی زندگی میں آتا ہے اور طوفان کی طرح سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔

کام اور عیاشی کا میری گو راؤنڈ

لیجیے ایک نومسلم سے اس لمحے کی کہانی سنیے۔ کہتے ہیں، یونیورسٹی سے نکل میں عملی زندگی میں آیا۔ نیویارک، ہالی وڈ کیلی فورنیا، شکاگو، جہاں بھی گیا، وہاں کے شب و روز میں غرق ہو گیا۔

یہ زندگی سراپا عیش و عشرت کی زندگی تھی۔ کوئی مادی آسائش ایسی نہ تھی جو میسر نہ ہو۔ میری زندگی ایک خوش کن خواب کے مانند تھی۔ پھر دفعتاً ایک روز میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کیا ہو

رہا ہے؟ مجھے دنیا کی ہر متاع حاصل ہے، اس کے باوجود میری زندگی کھوکھلی ہے۔ اس روز میرا جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جاؤں لیکن کہاں؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس بے چارگی کا شدید ردعمل ہوا اور میں شہوانی لذات میں پھر سے ڈوب گیا اور ایسی پستیوں پر جا پہنچا جہاں خواہشات نفسانی کا الاؤ بھڑ بھڑ جل رہا ہے۔ اب میرے سامنے صرف دو راستے تھے یا اسی جہنم زار میں جل جل کر راکھ ہو جاؤں یا کوئی اور راستہ تلاش کرو۔

ایک روز دفعتاً میں چونکا۔ ایسے لگا جیسے کسی نے کان میں کہہ دیا ہو کہ جس راستے کی تمھیں تلاش ہے، وہ صرف مذہب ہی دکھا سکتا ہے۔ صاحبو! اس مادی دنیا کے گرداب سے بچنے کے لیے جس میں آج اہل مغرب ڈب جھلکے کھا رہے ہیں، صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ بہت ہی آسان اور سادہ صورت ہے۔ خود پر ایک خدا مسلط کر لو۔ بس اتنی سی بات ہے اور اتنی سی بات سے عظیم فرق پڑ جاتا ہے۔

یہ کائنات بے معنی پھیلاؤ نہیں رہتی، ایک بامقصد تخلیق بن جاتی ہے۔ زندگی محنت اور عیاشی کا ''میری گوراؤنڈ'' نہیں رہتی بلکہ بامقصد ہو جاتی ہے۔ چیزیں اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ انسان ابھرتا ہے۔ انسانی قدریں اہمیت حاصل کر لیتی ہیں۔ انسانوں سے ایک بھائی چارے کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ چاہے خدا کو جانیں یا نہ جانیں، سمجھیں یا نہ سمجھیں، لیکن اسے مانے بغیر چارہ نہیں۔ اگر آپ اسے نہیں مانیں گے تو مادیت کا ایک جہنم آپ کو چاروں طرف سے گھیر لے گا۔

ہائیں یہ کیسا مذہب ہے؟

اس ضمن میں فرانس کے پروفیسر جاء گارودی کا اعتراف بھی ملاحظہ ہو۔

آپ تقریباً بارہ سال فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین رہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ میرا دور، یورپ میں فکری انارکی اور عملی انتشار کا دور تھا۔ ذاتی طور پر میرا یہ عالم تھا کہ ان گنت لوگوں کی طرح مجھے ساری آسائشیں، عیش اور مسرتیں حاصل تھیں۔ اس کے باوجود

میں ذہنی سکون اور اطمینان سے محروم تھا۔ لگتا تھا جیسے میں کسی خلا میں بھی رہا ہوں۔ جب کبھی اکیلا ہوتا تو سوچتا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے، میں پرسکون کیوں نہیں ہوں؟ کیوں مضطرب ہوں؟ کس بات پر غمگین ہوں؟ میرے والدین دہریے تھے اور میں کمیونسٹ تھا۔ میری زندگی میں سبھی کچھ موجود تھا لیکن خدا نہیں تھا۔ سوچ سوچ کر میں نے محسوس کیا کہ میری یہ کیفیت صرف اس لیے تھی کہ میں خدا کے تصور سے محروم تھا۔ میں نے جانا کہ یہ کائنات خود بخود نہیں بنی۔ انسان کے لیے خدا کا سہارا بنیادی ضرورت ہے۔ اس لیے میں عیسائیت پر ایمان لے آیا اور کیتھولک نوجوانوں کی تنظیم کا ممبر بن گیا۔

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں، میں قید کر لیا گیا اور الجزائر کے جنگلی کیمپ میں منتقل کر دیا تھا۔ کیمپ کمانڈر نے ایک روز حکم دیا کہ مجھے گولی مار دی جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مجھے دو مسلمان فوجیوں کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں فوجیوں نے کمانڈر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا، ہمارا مذہب نہتے انسان پر گولی چلانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کسی نے انھیں سمجھایا کہ احمقو! یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر تمھارے کمانڈر کو پتا چل گیا کہ تم نے اس کی حکم عدولی کی ہے تو وہ تمھارا کورٹ مارشل کر دے گا۔ انھوں نے جواب دیا: بے شک کورٹ مارشل کر دے لیکن ہم اپنے اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ پروفیسر جاء گارودی کا کہنا ہے کہ ان سپاہیوں کی بات سن کر میں تو ششدر رہ گیا۔ یہ کون سا مذہب ہے؟ میں نے سوچا، جو نہتے پر گولی چلانے کے خلاف ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا مذہب بھی ہے جو انسانیت کی اقدار پر عمل کرنا سکھاتا ہے؟ جب مجھے پتا چلا کہ یہ مذہب اسلام ہے تو میں نے دیوانہ وار اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا۔

اطمینان اور کھونٹی

صرف پروفیسر گارودی کی ہی بات نہیں، مغرب میں بے اطمینانی کی فضا عام ہے۔ لوگوں کو زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہیں، عیاشی کے تمام سامان حاصل ہیں، اس کے باوجود

ایک بے نام سا احساس محرومی ہے۔ دل کا اطمینان نہیں، سکون نہیں، فرصت نہیں، فراغت نہیں، ایک بے چینی، بے کلی، بے اطمینانی لگی ہے، حرکت کا ایک ریلا چل رہا ہے، اک دوڑ لگی ہوئی، بے مقصد دوڑ، بے منزل حرکت۔

پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اگر کوئی کھونٹی نہیں جس پر آپ خود کو ٹانگ سکیں تو سکون حاصل نہیں ہوتا۔ ایک بے نام، بے چینی لگی رہتی ہے۔

مغرب میں بہت سے لوگ مادی زندگی سے اکتا کر مذہب کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں، اس لیے وہ مذہب کی طرف رجوع کر رہے ہیں لیکن مغرب کے مروجہ مذہب اتنے کھوکھلے اور بے ہنگم ہیں کہ وہ جدید انسان کے لیے قابل قبول نہیں۔

عیسائیت کو کوئی صاحب عقل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آج کی دنیا میں جب سائنسی تحقیق اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ نر اور مادہ کے ملاپ کے بغیر بچہ جنم لے سکتا ہے۔

اہل یہود کے مذہبی مطالبات تو بالکل قابل قبول ہیں۔ مغرب میں بہت سے لوگ، تمام مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہاں کی لائبریریوں میں اسلام کے سوا تمام مذاہب کے بارے میں مکمل معلومات دستیاب ہیں۔ پتا نہیں کیسے یہودی راہبوں اور عیسائی پادریوں نے اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کا ایسا جال بچھا دیا ہے کہ اہل مغرب اسلام کو مذہب سمجھتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان متعصب لٹیروں کا ایک ٹولہ ہیں جسے اخلاق سے قطعی طور پر کوئی تعلق نہیں۔

اس بات پر لوگ اس حد تک یقین رکھتے ہیں کہ انھیں اسلام کے متعلق جاننے کی کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔

مغرب کے وہ تمام لوگ جنھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اسلام کے ابتدائی اصولوں کو جان کر حیرت زدہ ہو گئے اور انھوں نے اسلام کو قبول کر لیا۔

مغرب اور اسلام

یورپ اور امریکہ کے تمام نو مسلموں کا متفقہ خیال ہے کہ آج کے دور میں صرف

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہو جو ''ماڈرن مین'' کے لیے قابل قبول ہے۔ باقی تمام مذاہب توہمات کا پلندہ ہیں جنھیں دور جدید کا فرد قبول نہیں کر سکتا۔

اہل مغرب کے اسلام قبول کرنے میں صرف ایک رکاوٹ ہے۔ وہ یہ کہ انھیں اسلام کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ایک ایسا مذہب بھی ہے جو عقل کو اہمیت دیتا ہے، حصول علم کا بھی داعی ہے اور تحقیق کے کام کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔

یہ سراسر ہمارا قصور ہے کہ ہم نے تبلیغ اسلام میں کوتاہی کی ہے۔

ہمارے ہاں بیسیوں تبلیغی جماعتیں ہیں۔ لاکھوں مسجدیں، ہزاروں دینی مکتب ہیں جو تبلیغ دین کے داعی ہیں، لیکن ان کی تبلیغ کا انداز کچھ ایسا ہے جو آج کے نوجوانوں میں مثبت اثر پیدا کرنے کے بجائے ''ری ایکشن'' پیدا کرتا ہے۔

خالد لطیف گابا اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ میرے اسلام قبول کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلام دور حاضرہ کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔ اس عہد کی مشکلات کا حل کسی دوسرے مذہب کے پاس نہیں۔ آج دنیا اخوت اور مساوات چاہتی ہے۔ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جو اسلام کی طرح اقوام کے اقتصادی اور اخلاقی مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکے۔

امریکا نو مسلم سلیمان مسفر کا کہنا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے دین حق کی توفیق عطا فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا کے باشندے کو اسلام کی صحیح صورت دکھانے کی ضرورت ہے۔ آج تک مغرب میں، اسلام کو اس کی صحیح صورت میں نہیں دکھایا گیا۔ آج لوگ عیسائیت اور یہودیت کے بے جان مذاہب سے اکتا کر ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں، انھیں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسلام کی دعوت، حکمت اور جرأت سے دی جائے۔ یہ امر یقینی ہے کہ مغرب کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہے۔

الٹی چرخی

صاحبو! اس کے برعکس، ہمارے مبلغ عوام، اہل مغرب کے خلاف تعصب پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ کچے مسلمانوں کو پکا مسلمان بنانے میں شدت سے مصروف ہیں۔ وہ

اسلام کو ایک Ritual بناتے جا رہے ہیں۔ انھیں شعور نہیں کہ وہ جس ٹہنی پر بیٹھے ہیں، اسے ہی کاٹنے میں مصروف ہیں۔ وہ مغرب اور اسلام کے درمیان فاصلے پیدا کر رہے ہیں حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل مغرب اور اسلام کے درمیان یہود نے جو دیوار کھڑی کر رکھی ہے، اسے ڈھا دیا جائے۔

جرمنی کے ڈرک والٹر موسک لکھتے ہیں کہ میں نے ہر مذہب کا بغور مطالعہ کیا ہے، لیکن اسلام کے سامنے دوسرے مذاہب کی حیثیت وہی ہے جو سورج کے سامنے ماچس کی تیلی کی ہوتی ہے۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ جو شخص بھی قرآن کو سمجھ کر پڑھے گا، وہ انشاء اللہ اسلام قبول کرے گا۔

انگلستان کے ایک نومسلم، محمد المہدی کا بیان ہے کہ جہاں تک میرا اندازہ ہے، یورپ میں اشاعت اسلام کے حیرت انگیز امکانات ہیں۔ میرے تاثرات یہ ہیں کہ یورپ میں اسلام کا فروغ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کی وساطت سے ہوگا۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں اسلام کی اجارہ داری ان پڑھ لوگوں نے سنبھال رکھی ہے۔ یہ لوگ اپنی تقویت کے لیے دھڑا دھڑ دینی مدارس قائم کر رہے ہیں جہاں یتیم، لاوارث بچوں کو قرآن منہ زبانی رٹا دیا جاتا ہے تا کہ وہ محفلوں میں قرآن خوانی کریں۔ ان بچوں کو نہ تو قرآن کے مفہوم سے شناسا کیا جاتا ہے نہ ہی انھیں دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دراصل ان مکتبوں کے ذریعے وہ اپنی اکثریت قائم کر رہے ہیں

☆

انوکھا شہنشاہ

مجھے ایک قاری کا خط موصول ہوا ہے۔ لکھتے ہیں، آپ نے تلاش میں کبھی سائنس اور مذہب کے تضاد پر روشنی نہیں ڈالی۔

سائنس علم نہیں

دراصل سائنس کے متعلق ہم نے ایک غلط فہمی پال رکھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سائنس ایک علم ہے۔ یہ ہماری بھول ہے۔ سائنس علم نہیں بلکہ کسی حقیقت کو جاننے یا سمجھنے کا طریق کار ہے۔ ایسے ہی علوم کے متعلق بھی ہم نے خوش فہمیاں پال رکھی ہیں۔

دراصل اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ہمارے چاروں طرف اپنی حکمتیں بکھیر رکھی ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے اپنی آسانی کی خاطر ہم نے ان کی درجہ بندی کی ہے۔ مثلاً پودوں کے متعلق حکمتیں، مچھلیوں کے متعلق حکمتیں، موسموں کے متعلق حکمتیں۔ فرض کیجیے، ہم پودوں کے متعلق حکمتوں کو سائنسی طریق کار سمجھ کر اکٹھا کر لیتے ہیں، تو یہ پودوں کے متعلق علم ہوگا جسے ہم باٹنی کہتے ہیں۔ عام زبان میں ہم باٹنی کو سائنس کہتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ باٹنی سائنس نہیں بلکہ پودوں کے بارے میں علم ہے جسے سائنسی طریق کار سے حاصل کیا گیا ہے۔

فرض کیجیے، آپ حلوہ پکانا چاہتے ہیں۔ پہلے آپ نے سوجی کو گھی میں بھون لیا، پھر اس میں شکر کا شیرا ڈال دیا۔ لیجیے حلوہ تیار ہو گیا۔ حلوہ اور چیز ہے لیکن جس طریقے سے وہ بنایا گیا ہے، وہ اور چیز ہے۔ ایسے ہی فزکس طبیعات کا علم ہے، سائنس نہیں ہے۔ تو ظاہر ہے کہ سائنس کوئی علم ہے نہ اس کی کوئی منزل ہے۔ وہ ایک طریق کار ہے، جہاں چاہو، لگا لو۔

پانچ حواس کے قیدی

صاحبو! ہمارے احساسات محدود ہیں جن کی مدد سے ہم اپنے گردوپیش کو سمجھتے ہیں۔ مثلاً ہماری سماعت محدود ہے۔ ہم چھوٹی آوازیں نہیں سن سکتے اور نہ ہی بڑی آوازیں سن سکتے ہیں۔ یہی کیفیت ہماری آنکھ کی ہے۔ ہم کچھ چیزیں دیکھ سکتے ہیں، کچھ چیزیں نہیں دیکھ سکتے۔ مثلاً قرآن میں اللہ نے کہا، لوگو! ہم نے تمام ذی حیات مخلوقات کو پانی سے پیدا کیا۔

لوگوں نے کہا، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ پانی تو پینے کی چیز ہے۔ اس سیال سے مخلوقات کیسے بنائی جاسکتی ہیں۔ پھر صدیوں بعد کسی شخص نے خوردبین بنائی جس کی مدد سے ہمیں وہ چھوٹی چیزیں نظر آسکتی ہیں جنھیں ہماری آنکھ نہیں دیکھ سکتی ... پھر جو کسی نے خوردبین کی مدد سے پانی میں جھانکا تو دیکھا، پانی تو جیتے جاگتے کیڑوں سے بھرا ہوا ہے۔

ہومیوپیتھی

ظاہر ہے کہ سائنس کا طریقہ کار ہر بات پر حاوی نہیں۔ مثلاً ہومیوپیتھی کو لیجیے۔ یہ ایک درویش صفت آدمی کو جس کا نام ہالیمن تھا، بیٹھے بٹھائے سوجھی۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ علم جب بھی آتا ہے، انٹیوشن کے ذریعے آتا ہے۔ کسی فرد کے ذہن میں ایک حقیقت چمکارہ مارتی ہے، پھر اس فرد کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول ہوجاتی ہے۔ یہ سوچ بچار کرتا ہے، فکر کرتا ہے، تحقیق کرتا ہے حتیٰ کہ وہ حقیقت واضح طور پر سمجھ آجاتی ہے؟

ایسے ہی ہالیمن کے ذہن میں ایک حقیقت کرن کی طرح پھوٹی۔ وہ حقیقت تھی کہ دوا خالص ہو تو وہ کم پُراثر ہوتی ہے۔ اگر اس میں پانی ملا دیا جائے یعنی اسے Dilute کردیا جائے تو اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ ہالیمن نے اس حقیقت پر غور کرنا شروع کردیا۔ تجربات کیے، پھر اس نے مریضوں کو خالص دوائیوں کے بجائے Diluted دوائیاں دینا شروع کردیں، اس کے بہت عمدہ نتائج برآمد ہوئے۔

مروجہ طریقہ علاج والوں کو یہ بات مضحکہ خیز لگی۔ لہٰذا انھوں نے سائنس دانوں سے کہا کہ اپنی لیب میں اس بات کو جانچو کہ کیا واقعی Diluted دوا زیادہ پُراثر ہوتی ہے۔

لیب کے سائنس دانوں کو ڈائلیوٹ دوا مہیا کی گئی۔ انھوں نے اپنے اوزاروں کی مدد سے جانچا پرکھا۔

ہومیوپیتھک دوا اس حد تک ڈائلیوٹ کردی گئی تھی کہ سائنسی آلات دوا کی موجودگی کو جانچ نہ سکیں۔ لہٰذا انھوں نے اعلان کردیا کہ اس Sample میں خالص پانی ہے، دوا کا کوئی عنصر موجود نہیں۔

مضحکہ خیز

سائنسی طریق کار ایک لحاظ سے بڑا مضحکہ خیز ہے۔ وہ نتائج کو نہیں دیکھتا، مثلاً ہالیمن نے وہی دوا کئی ایک مریضوں کو دی اور وہ شفایاب ہوگئے۔ سائنسی طریق کار یہ نہیں دیکھتا کہ دوا کے نتائج کیا ہیں؟ اس میں شفا بخشنے کی طاقت ہے یا نہیں؟ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے طریق کار پر پورا اترتی ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مروجہ طریق علاج کے ڈاکٹروں نے اعلان کردیا کہ ہومیوپیتھی سائنٹیفک طریقہ علاج نہیں۔

اس کے باوجود ہومیوپیتھک علاج چلتا رہا اور روز بروز مقبول ہوتا گیا، تاہم مروجہ طریقہ والے اسے غیر سائنسی طریق علاج گردانتے رہے۔

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ کسی دواساز کمپنی نے ایک دوا دو چار لیبارٹریز میں بھیجی تاکہ وہ انسانی جسم پر اس کے اثرات کا جائزہ لیں۔ اس کے اثر کو لیب والے روز ماپتے۔ نتیجہ تقریباً وہی رہتا۔ ایک روز لیب کی لڑکی نے جو اسے جانچا تو وہ حیران رہ گئی۔ اثر دگنے سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ گھبرا گئی۔ بار بار اس نے جانچا لیکن نتیجہ دگنا ہی رہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بات کی۔ وہ سب اس بات پر حیران ہوئے۔ انھوں نے کہا، شاید اس دوا میں کسی نے ملاوٹ کردی ہو۔ دوا کی مقدار کو دیکھا تو وہ واقعی بڑھی ہوئی تھی۔ تحقیق کے بعد پتا چلا کہ کسی نے دوا میں پانی ڈال دیا ہے۔ اس پر ایک اور مسئلہ سامنے آگیا۔ کیا پانی ملانے

سے دوا کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔

انھوں نے دوا میں اور پانی ملایا، پھر ٹیسٹ کیا تو پتا چلا کہ واقعی دوا میں پانی ملایا جائے تو اس کی طاقت کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔

انھوں نے اس تجربے کو بار بار آزمایا اور جب اس کی حقیقت پر یقین آ گیا تو انھوں نے ایک سائنسی جریدے میں اسے تفصیل سے شائع کر دیا۔

یہ دیکھ کر مروجہ طریقہء علاج والے تاجر گھبرا گئے کہ اگر ہومیو پیتھک طریقہء علاج کو سائنٹیفک مان لیا گیا تو ان کے لیے باعث نقصان ہوگا۔

مفاد پرستوں کی باندی

بہر صورت ایک حقیقت ظاہر ہے کہ سائنسی طریق کار نہ تو یقینی ہے اور نہ مکمل۔

سائنس تو اللہ تعالیٰ کی حکمتیں سمجھنے کے لیے ہم نے ایک باندی مقرر کر رکھی ہے۔ یہ تو مغربی تہذیب کا چمتکار ہے کہ انھوں نے سائنس کو اس قدر اہمیت دے رکھی ہے ورنہ آج کل تو سائنس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو کبھی پہلے ہوا کرتی تھی۔ پہلے وہ کائنات کے راز یعنی اللہ کی حکمتوں پر تحقیق کیا کرتی تھی۔ تعمیری چیزوں کا کھوج لگایا کرتی تھی۔ آج کل تو وہ حکومتوں، تاجروں اور دیگر مفاد پرستوں کے لیے چھوٹے چھوٹے تخریبی کام کرنے پر مجبور کر دی گئی ہے۔ سائنس دان اب اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کرتے۔ یا تو حکومتیں انھیں خرید لیتی ہیں یا اگر وہ بکنے سے انکار کر دیں تو انھیں زبردستی یرغمال بنا لیا جاتا ہے۔ حکومت کے علاوہ تاجر لوگ اپنے جائز ناجائز مفادات حاصل کرنے کے لیے سائنس دانوں کو استعمال کرتے ہیں۔

مغربی تہذیب نے اکنامکس کو زندگی کا معیار اور مقصد قائم کر کے مفاد پرستی کو ہوا دی ہے۔ مثال کے طور پر جب نئی ای ایس پی رائج ہوئی تو انسانی ذہن کی ایک نئی طاقت ٹیلی پیتھی ظہور میں آئی کہ انسان اپنا خیال دوسرے انسان کے ذہن میں منتقل کر سکتا ہے۔ اس پر بہت سے تجربات کیے گئے مثلاً دو دوستوں کو دور دراز بٹھا دیا گیا۔ دونوں کے سامنے تاش کی

گڈیاں رکھ دی گئیں۔ ایک نے حکم کی بیگم کو اٹھایا اور لاشعوری طور پر کوشش کی کہ اس کا دوست جو کئی ایک میل دور بیٹھا تھا اور اس کی طرف متوجہ تھا، وہ بھی حکم کی بیگم اٹھا لے۔ مطلب تھا کہ ایک فرد کا خیال دوسرے فرد کے ذہن میں منتقل کرنا۔ اس طاقت کو مختلف تعمیری صورتوں میں ترقی دی جا سکتی تھی لیکن مفاد پرستی کی اس فضا میں جو مغرب نے قائم کر رکھی ہے، علم یا اخلاق یا روحانیت کا کوئی مقام ہی نہیں۔ لہٰذا ٹیلی پیتھی کی طرف توجہ نہ دی گئی۔

''وار مانگرز'' کا ہتھیار

آخر روس کو سوجھی، اس نے سوچا کہ ٹیلی پیتھی کو فوجی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ جب باہمی رابطہ ٹوٹ جائے اور دو یونٹوں کے درمیان کمیونیکیشن کی کوئی صورت نہ رہے تو ٹیلی پیتھی کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

یہ بھی سننے میں آیا کہ روس میں میٹا نفسیات اور روحانی علوم پر ریسرچ ہو رہی ہے لیکن مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ان قوتوں کو فوجی طاقت کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ مغربی نظام کے تحت سائنسی ترقی انسانی فلاح پیدا نہیں کرتی بلکہ ذہنوں میں انتشار، محرومی اور پریشانی پیدا کرتی ہے۔ نو مسلموں کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ مغرب میں انتشار بڑھتا جا رہا ہے۔

مذہب کا سہارا

مغربی ممالک کے لوگ کام اور تفریح کے چکر سے بے زار ہو چکے ہیں۔ وہ مذہب کے سہارے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ مذہب کے بغیر زندگی ایک بے مقصد شورا شوری ہے، ایک آوارگی!

مغرب میں جتنے مذہب بھی رائج ہیں، وہ طوطا مینا کی کہانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

پرانے زمانے میں جب عقل و دانش نے اتنی ترقی نہ کی تھی، لوگ ان طوطا مینا کہانیوں کو تسلیم کر لیتے تھے۔ اب صورت حالات مختلف ہے۔ آج کے ماڈرن آدمی کے لیے

عیسائیت یا یہودیت کے قصے کہانیاں قابل قبول نہیں، وہ عقل کی نفی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ پادریوں اور راہبوں کو جو ارفع حیثیت دی گئی ہے، وہ جمہوریت کے اصول کے منافی ہے۔لہٰذا مغربی انسان ان دونوں مروجہ مذاہب کو قبول نہیں کرتا، اس لیے کام، عیاشی اور مفاد پرستی کے چکر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔

کوئی کوئی ایسا خوش قسمت آدمی ہوتا ہے جو اتفاقاً اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتا ہے لیکن اسے ان معلومات پر یقین نہیں آتا۔بہر حال انجانے میں تحقیق کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور جب اسے حقیقت کا پتا چل جاتا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مثلاً ایک مغربی نومسلم کا بیان ہے کہ اگرچہ میں اس بے مقصد زندگی سے مطمئن نہ تھا، لیکن اس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔اس لیے عام لوگوں کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی دفتری ڈیوٹی کے تحت میں بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات پڑھ رہا تھا۔ابھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باب شروع ہوا تھا کہ میں ایک جملہ پڑھ کر چونکا۔لکھا تھا: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے کہہ دو کہ میں تو بس تمھارے جیسا ہی ایک انسان ہوں۔

یہ جملہ پڑھ کر میں چونکا۔ارے! خدا یہ کیا کہہ رہا ہے۔کیا یہ مسلمانوں کو خدا کہہ رہا ہے! اور کیا خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ رہا ہے۔جس کو اس نے سب انسانوں سے عزت کا مقام دیا ہے۔

یہ فقرہ میرے دل میں سوئی کی طرح چبھ گیا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا جس شخص کو تمام انسانوں کا سردار بنائے، اس سے کہے کہ تم لوگوں سے کہہ دو کہ میں بھی تمھارے جیسا ایک انسان ہوں۔دوسرے مذہبوں میں تو جو شخص خدا کی طرف سے بھیجا جاتا ہے، وہ یا تو دیوتا بن جاتا ہے یا خدا کا اوتار یا اس کا بیٹا۔

ان کی بات چھوڑیئے! ہمارے ہاں تو وہ لوگ جو گرجے میں دعائیں کرتے ہیں اور پادری کہلاتے ہیں، ان کا مرتبہ بھی عام انسانوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

تو صاحبو! یہ جملہ میرے حلق میں اٹک گیا۔میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس شخصیت کے متعلق مزید باتیں جانوں۔میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر لکھی ہوئی کئی ایک کتابیں پڑھ ڈالیں۔جوں جوں میں پڑھتا گیا، حیرت میں ڈوبتا گیا۔

انوکھا شہنشاہ

"میں کسی سپر نیچرل کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔"

"میرے پاس آسمانوں کے خزانوں کی کنجیاں نہیں ہیں۔"

"میں غیب کی باتیں نہیں جانتا۔"

"میں انسان ہوں تم جیسا انسان۔"

یہ جملے میرے لیے حیران کن جملے تھے۔

ایسے جملے میں نے کسی مذہبی مصلح کی زبان سے نہیں سنے تھے۔میں نے سوچا، یا خدا! یہ کیسا مذہب ہے جو عقلِ انسانی سے اس قدر ہم آہنگ ہے!

پھر میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیوگرافی غور سے پڑھی۔

وہ عرب کا مطلق العنان حکمران تھا۔

مسلمانوں کا سردار تھا۔

اور اپنے علاقے میں سب سے زیادہ محترم حیثیت کا مالک تھا۔

اس کے باوجود اس کے گھر میں کوئی نوکر نہ تھا۔

وہ اپنا کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔

اپنے کپڑوں پر اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتا تھا۔

اپنے جوتوں کی خود مرمت کرتا تھا۔

مویشیوں کو اپنے ہاتھ سے چارہ ڈالتا تھا۔

اپنے ہاتھ سے دودھ دوہتا تھا۔

میری دانست میں دُنیا بھر میں کوئی حکمران ایسا نہیں ہوگا جو اپنے کام اپنے ہاتھوں سے

کرتا ہواور زندگی یوں گزارتا ہو جیسے کوئی عام آدمی گزارتا ہے۔

میں نے محسوس کیا جیسے اس کے کردار میں مساوات، جمہوریت اور رحمت یوں سموئی ہوئی ہے جیسے گلاب کے پھول میں خوشبو سموئی ہوتی ہے۔ میں اس ہستی کے کردار سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اسلام کو جانے بغیر، قرآن کا مطالعہ کیے بغیر اسلام قبول کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایسا انسان کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، کبھی خود فریبی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جس مذہب کا وہ پرچار کرتا ہے، وہ مذہب لازماً سچا ہے۔

حضور ﷺ کا کردار

حضور ﷺ کے کردار سے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی متاثر ہیں۔

☆ حضور ﷺ ہمیشہ ہنس مکھ رہتے تھے۔

☆ کبھی غصہ کھاتے نہ قہقہہ لگاتے۔

☆ باوقار انداز اپنائے رکھتے۔

☆ کسی کے سلام کا انتظار کیے بغیر خود آگے بڑھ کر سلام کرتے۔

☆ چھوٹوں کو بھی سلام میں پہل کرتے۔

☆ نوکر چاکر اور ماتحتوں کے ساتھ نرم مزاجی اور تحمل سے پیش آتے۔

☆ ملاقاتی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے تو ان کا ہاتھ تھام کر ان سے گفتگو کرتے۔ خود ہاتھ پیچھے نہ ہٹاتے جب تک کہ ملاقاتی نہ ہٹاتا۔

☆ کوئی شخص بھی حضور ﷺ کو پکارتا تو چاہے وہ کسی بھی حیثیت کا مالک ہوتا، بڑی ہمدردی سے اس کی طرف رجوع فرماتے۔

☆ کوئی سخت کلامی کرتا تو مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔ صبر کرتے۔ آپ کی حیا مثالی تھی۔

☆ سر بزم گفتگو میں جتنے نرم تھے، جہاد کے میدان میں اتنے ہی گرم تھے اور ثابت قدم۔

☆ اصولوں میں بے لچک رویہ اختیار کرتے۔

☆ عدل و انصاف کے قائل تھے لیکن اگر گنجائش ہوتی تو رحمت کو افضل تر سمجھتے۔

☆ فتح مکہ کے موقع پر فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوئے۔ قریش کے سردار لرز رہے تھے۔ انھیں احساس تھا کہ انھوں نے کیا کیا ظلم ڈھائے تھے۔ وہ خوف زدہ تھے لیکن حضور ﷺ نے فرمایا، لوگو! آج تم سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا۔ اللہ تمھیں معاف کرے۔

☆ آپ ﷺ تاریخ انسانی کے پہلے راہنما ہیں۔ اولین قانون ساز ہیں جنھوں نے عورت کو مردانہ شاونزم سے نجات دلائی۔ عورت کو مرد کے برابر مساویانہ حقوق دلائے۔

مغرب میں تو آج بھی عورت کو جائیداد میں حصے کا حق نہیں لیکن آپ ﷺ نے چودہ سو سال پہلے عورت کو یہ حق دیا۔ آپ ﷺ کی تعلیمات میں عورتوں کے حقوق پر بڑا زور دیا گیا ہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ماں کے قدموں میں جنت ہے۔

غیر مسلموں کے تاثرات

مغربی مصنفوں نے اسلام دشمن قوتوں کے پھیلائے ہوئے تعصبات کے باوجود کچھ لکھنے والے ایسے ہیں جنھوں نے تعصبات سے اثر نہیں لیا۔ مثلاً کارلائل نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ'' میں حضور ﷺ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

''منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے قبل ہی اس سیاہ چشم، روشن جبیں، فراخ حوصلہ، کریم النفس، محفل پسند اور درد بھرے مخلص بادیہ نشین کے خیالات جاہ طلبی سے کوسوں دور تھے۔

''دوسرے سنی سنائی توہمانہ باتوں کو اپنا مسلک قرار دے کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتے تھے مگر محمد ﷺ کی تسکین اس انداز کی باتوں سے نہیں ہوتی تھی۔ وہ عرصہ کائنات میں واقعی اکیلے کھڑا تھا اور اس کا دماغ اس نوعیت کے ہزاروں خیالات سے بھرا رہتا تھا کہ میں کیا ہوں؟ یہ دنیا کیا ہے؟ زندگی اور اس کا مدعا کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ میں مانوں تو کیا مانوں؟ کروں تو کیا کروں؟ ان سوالات کے ساتھ وہ کوہ حرا کی ہیبت ناک چٹانوں اور ریگستانوں

کی درشت تنہائیوں میں سرگرداں رہا اور آخر کار اسے ان کا جواب مل گیا۔ خدا کی الہامی قوت نے اسے انسانوں کی رہنمائی کے لیے چن لیا۔''

مریم جمیلہ

محترمہ مریم جمیلہ ایک نومسلم خاتون ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ پاکستان آ گئیں اور آج کل لاہور میں سنت نگر میں مقیم ہیں۔ انھوں نے ایک مسلمان شخص محمد یوسف خان سے شادی کر لی اور اسلامی انداز سے گھریلو عورت کی طرح رہتی سہتی ہیں۔

وہ دھڑا دھڑ اسلام پر کتابیں تصنیف کر رہی ہیں۔

اپنی ایک کتاب ''اسلام اینڈ ویسٹرن سوسائٹی'' میں وہ لکھتی ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ صرف خود ہی سادہ زندگی بسر نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی گھر والیاں بھی ایسی ہی زندگی بسر کرتی تھیں۔ لکھتی ہیں:

''ایک روز حضرت علیؓ نے اپنے ایک شاگرد سے کہا، آؤ میں تمھیں بی بی فاطمہ ؓ کی کہانی سناتا ہوں جو محمد الرسول اللہ ﷺ کی چہیتی بیٹی ہیں۔

''فاطمہ ؓ روز خود اناج پیستی ہیں، چکی چلاتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں چھالے نکل آتے ہیں۔ روز کنویں سے مشکیزے میں پانی بھر کر لاتی ہیں تا کہ گھر کی ضرورتیں پوری ہوں۔ مشکیزہ لٹکانے کی وجہ سے ان کے جسم پر نشان پڑ جاتے تھے، پھر وہ روزانہ خود گھر کی صفائی کرتی ہیں۔

''ایک دفعہ ایسا کہ ہوا کہ مدینہ میں کچھ جنگی قیدی لائے گئے۔ میں نے فاطمہ ؓ سے کہا، بی بی! آپ اپنے والد ﷺ سے جا کر درخواست کریں کہ جنگی قیدیوں سے ایک خاتون آپ کو دے دیں جو گھر کے کام میں آپ کا ہاتھ بٹایا کرے۔ میرے کہنے پر وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں لیکن اس وقت ان کے گرد سائلوں اور حاجت مندوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

''فاطمہ ؓ طبیعت کی بڑی شرمیلی تھیں، اس لیے وہ حضور ﷺ سے بات نہ کر سکیں، بات کیے بغیر لوٹ آئیں۔

''اگلے روز نبی کریم ﷺ خود ہمارے گھر آئے۔ بولے، فاطمہ ؓ! تو جو کل میرے پاس آئی تھی، کیا بات تھی؟

فاطمہ ؓ نے آپ کے سوال کا جواب نہ دیا بلکہ شرما کر سر جھکا لیا۔ یہ دیکھ کر میں نے خود ان سے بات کی۔ میں نے کہا، اے نبی کریم ﷺ! فاطمہ ؓ روز روٹی پکانے کے لیے چکی پیستی ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں اور روز کنویں سے بھر پانی کا مشکیزہ گھر لاتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے جسم پر دانے نکل آئے ہیں۔ سارا دن وہ گھر کے کام میں جتی رہتی ہیں۔ میں نے ہی مشورہ دیا تھا کہ آپ کے پاس جائیں اور آپ سے درخواست کریں کہ جو جنگی قیدی آئے ہیں، ان سے ایک خاتون انھیں دے دی جائے تا کہ گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا سکے۔

یہ سن کر نبی کریم ﷺ ایک ساعت کے لیے خاموش رہے، پھر فاطمہ ؓ سے بولے: فاطمہ ؓ! اللہ سے ڈرو، تقویٰ کو اپناؤ۔ جب تم سونے لگو تو 33 بار سبحان اللہ پڑھو، 33 بار الحمدللہ پڑھو اور 34 بار اللہ اکبر۔ نوکر کی نسبت تقویٰ تمھارا بہتر مددگار ثابت ہوگا۔''

صاحبو! ہمارے پاس صرف قرآن ہی نہیں، محمد ﷺ بھی ہیں۔ جس طرح قرآن بے مثل کتاب ہے، ویسے ہی حضرت محمد ﷺ بے مثل انسان ہیں۔ قرآن لفظوں میں اللہ کے احکامات ہیں، حضرت محمد ﷺ کی شکل میں اللہ کے احکامات ہیں۔

صاحبو! وہ لوگ جو عقل کے گرویدہ ہیں اور عقل کی راہبری میں زندگی گزارتے ہیں، وہ بڑے خوش قسمت ہیں، بڑے مبارک ہیں۔ دعا کرو کہ اللہ کسی کو روحانی یا سپرنیچرل کے جھنجھٹ میں نہ ڈالے ورنہ عقل پر بھروسا نہیں رہتا اور سپرنیچرل یا روحانیت کا سرا نہیں ملتا۔ اس بدنصیب فرد پر یہ بات صادق آتی ہے:

کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

نیچرل، سپر نیچرل

ایک روز قدرت اللہ شہاب سے میں نے کہا:

''جناب جب سے روحانیت کا تجربہ ہوا ہے، میری تو مت ماری گئی ہے۔ جناب والا! اس سے پہلے میں تو بڑا عقل مند آدمی تھا۔ عقل پر بھروسا کرتا تھا۔ حقائق پسند تھا اور زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔''

شہاب صاحب بولے:

''یہ جو ہم نے نیچرل اور سپر نیچرل کے خانے بنا رکھے ہیں، یہ سراسر ہماری بے سمجھی کی وجہ سے ہیں۔ جس بات کو ہماری عقل سمجھ لیتی ہے، اسے ہم نیچرل کا نام دے دیتے ہیں۔ جس بات کا ہماری عقل احاطہ نہیں کر سکتی ہے، ہم اسے سپر نیچرل سمجھتے ہیں۔ سارا قصور ہماری عقل کا ہے ورنہ سپر نیچرل کا کوئی وجود نہیں۔ سب نیچرل ہے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ہماری عقل پر بھید کھل جائیں گے اور ہر بات نیچرل نظر آئے گی۔''

ماننا اور جاننا

میں نے پوچھا: ''آپ کا مطلب سپر نیچرل سے روحانی ہے؟''

وہ بولے: ''روحانیت کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ دنیا اور روحانیت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ہم نے خواہ مخواہ انھیں الگ الگ کر رکھا ہے۔''

پتا نہیں کس دانشور نے کہا تھا کہ ایمان اندھا ہوتا ہے۔ اس نے سچ کہا تھا۔ میرا ایمان بھی اندھا ہے۔ میں قرآن حکیم کی ہر بات کو سچے دل سے مانتا ہوں اگرچہ قرآن حکیم کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ نور بابا کہا کرتے تھے، صاحبو! ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔

ایک تو جزا و سزا کا مسئلہ ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انصاف اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ اٹل اصول ہوتے ہیں جو بدلتے نہیں، جو ہر شخص پر یکساں لاگو ہوتے ہیں چاہے وہ شخص ارتقاء کی کسی سٹیج پر ہو۔ یہ ہماری بھول ہے۔

پرانی بات ہے تب میں کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ ہمارے پروفیسر ایک بار ہمیں پاگل خانے لے گئے تاکہ ہم ذہنی مریضوں کی کیفیات کو دیکھیں، سمجھیں۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب اور ان کا عملہ بڑے اخلاق سے ہمیں ملے۔ انھوں نے ہمیں سمجھایا کہ عام طور پر ذہنی مریض تشدد پسند نہیں ہوتے وہ وزیٹرز سے بڑے اخلاق سے ملتے ہیں اس لیے گھبرانے کی بات نہیں البتہ ایک بات کا خیال رہے کہ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے وہ خوف زدہ ہو جائیں۔ وہ خوف زدہ ہو جائیں تو وہ Violent ہو جاتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ کے عملے نے ہمیں چند ایک ضروری باتیں سمجھا دیں۔ اس کے بعد ہم راؤنڈ پر چل نکلے۔

صحن میں ہمیں سب سے پہلے ایک صاحب ملے، اس کے ہاتھ میں دودھ کی ادھ بھری بالٹی تھی۔

گھنڈی

ہمیں دیکھ کر وہ رک گیا۔ بالٹی زمین پر رکھ دی۔ کہنے لگا: ''کتنی خوشی کی بات ہے کہ آپ تشریف لائے ہیں۔ السلام علیکم۔''

اس کے بعد اس نے ہم سے مصافحہ کیا، حال احوال پوچھا۔ پھر بولا، ''ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ بالٹی کی طرف بڑھا اور بولا، ''دودھ پیجیے۔''

جب اس نے ہمیں دودھ پلانے کی ضد کی تو عملے نے کہا:

''یہ لوگ ذرا راؤنڈ کر لیں، پھر آپ سے دودھ پئیں گے جب تک آپ انتظار کریں۔''

یہ سن کر وہ مطمئن ہو گیا اور ہم چل دیے۔ جب ہمارا آخری ساتھی اس کے پاس سے گزرا تو اس نے ایک جست بھری اور ہمارے ساتھی کی ٹوپی اتار کر بھاگ گیا۔

اس پر ہم بہت حیران ہوئے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ وہ سٹاف کا آدمی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب مسکرائے، بولے: ''نہیں یہ شخص پیشنٹ ہے۔''

"لیکن اس کا برتاؤ؟" ہم نے پوچھا۔

انھوں نے بات کاٹ کر کہا: "اس کا برتاؤ بالکل نارمل ہے۔ ذہن میں صرف ایک گھنڈی ہے۔ جب بھی یہ شخص کسی کے سر پر ٹوپی دیکھتا ہے تو اس پر دیوانگی طاری ہو جاتی ہے اور یہ لپک کر اس کی ٹوپی اتار کر بھاگ جاتا ہے۔"

اختیار، بے اختیاری

صاحبو! ہم سب کا یہی حال ہے۔ دیکھنے میں ہم نارمل لگتے ہیں، لیکن ہر شخص کے ذہن میں ایک گھنڈی موجود ہے۔ جب وہ اثر انداز ہوتی ہے تو ہم پر ایک دیوانگی طاری ہو جاتی ہے جس کے تحت ہم کوئی ایسا کام کر جاتے ہیں جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔ یہ گھنڈی جب طاری ہوتی ہے تو ہم پر ایک وحشت سوار ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے بس میں نہیں رہتے۔ ہمارا کنٹرول سسٹم اختیار میں نہیں رہتا۔

یہ گھنڈیاں ہمیں ورثے میں ملتی ہیں۔ کوئی گھنڈی ماں سے مل گئی، کوئی باپ سے، کوئی دادا پردادا سے۔ صاحبو! میری دانست میں سیدھی بات ہے کہ جو بات ہماری مرضی کے باوجود عمل میں آئے، ہم پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی، اس لیے وہ جزا سزا سے مبرا ہونی چاہیے۔

جزا سزا کے اصول قائم نہیں کیے جا سکتے۔ انصاف اصول پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک منفرد مسئلہ ہے۔ ہر شخص کے لیے انصاف الگ ہوگا۔

سیانے کہتے ہیں، ہم تقریباً نوے فی صد Predestined ہیں۔

پیدا کرنے سے پہلے ہمیں پوچھا نہیں جاتا کہ میاں کس گھرانے میں پیدا ہونا پسند کرو گے؟ امیر کے گھر میں، غریب کے گھر میں یا مڈل کلاس کے گھر میں۔ مسلمان کے گھر میں، عیسائی کے گھر میں یا دہریے کے گھر میں۔ ہمیں اپنی موت کے بارے میں علم ہوتا ہے نہ شادی کے بارے میں اور نہ ہی اولاد کے متعلق۔

زندگی میں بیشتر واقعات Predestined ہوتے ہیں۔ صرف چند ایک ہمارے

اختیار میں ہوتے ہیں۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعات جو اختیار میں آتے ہیں، واقعی ہمارے اختیار میں ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی اختیاری نہ ہوں اگرچہ ہمیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ اختیاری ہیں۔

ایشور لال

پرانے زمانے کی بات ہے جب کالج میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں میرا ایک ہندو دوست ایشور لال تھا۔ ایشور لال کا والد بنیا تھا۔ پیسے والا تھا لیکن وہ بیٹے کو کھلا پیسہ نہ بھیجتا تھا، لہٰذا ایشور لال ہمیشہ مالی مشکلات کا شکار رہتا تھا۔

ایک دن میں نے ایشور لال سے پوچھا:

"کیا تمھارے والد تمھاری تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے؟ جبھی وہ تمھیں پورا خرچہ نہیں بھیجتے۔"

ایشور لالا بہت ہنسا۔ قہقہہ مار کر ہنسا۔ کہنے لگا:

"میرے پتا جی لکھ پتی ہیں۔ علاقے میں سب سے زیادہ امیر ہیں۔"

"پھر وہ تمھیں پورا خرچہ کیوں نہیں بھیجتے؟"

کہنے لگا: "ان کا حوصلہ نہیں پڑتا کہ یک مشت مجھے سارا خرچہ بھیجیں۔ اس لیے تین قسطوں میں بھیجتے ہیں۔"

"تم تو کہتے ہو کہ وہ لکھ پتی ہیں۔"

وہ بولا: "بالکل لکھ پتی ہیں اور اسی وجہ سے سارا خرچہ ایک دم بھیجنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔"

میں نے کہا: "تمھیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی؟"

بولا، "بہت۔"

میں نے کہا: "پتا جی پر غصہ آتا ہوگا۔"

کہنے لگا: "پہلے آتا تھا، اب نہیں آتا۔"

میں نے کہا: "وہ کیسے؟"

ایشور لال پھر ہنسنے لگا۔ بولا: ''پہلے میں ان کی مجبوری کو نہیں سمجھتا تھا۔ اب سمجھتا ہوں۔''

''اب کیسے سمجھتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

بولا: ''ہمارے ہوسٹل میں بڑے منگتے آتے ہیں۔ کئی تو خیر خاندانی منگتے ہوتے ہیں، کچھ واقعی ضرورت مند ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ترس آتا ہے۔ ہوسٹل کے لڑکے ایسے بھکاریوں کو خیرات دیتے ہیں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ انھیں خیرات دوں۔ دینے کے لیے میرے پاس پیسہ ہوتا ہے لیکن جب میں جیب میں ہاتھ ڈالنے لگتا ہوں تو پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے، جیسے کوئی میرا بازو جکڑ لیتا ہے۔ ساری بانہہ اکڑ جاتی ہے اور میں جیب میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ پھر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کئی بار آزمایا ہے۔ اب میں جانتا ہوں کہ میں دے نہیں سکتا۔ یہ پتا جی کی مجبوری ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے تو اب مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں۔''

دواور لو

میں اس زمانے میں ایشور لال کی بات کو پورے طور پر نہ سمجھ سکا۔ ان دنوں مجھے Compulsion کا علم نہ تھا۔

میرے ایک دوست ہیں شیخ محمد علی۔ وہ شیخ برادری کے فرد ہیں۔ شیخ نومسلم ہوتے ہیں صدیوں بنئے رہے پھر مسلمان ہوئے۔ لیکن ابھی تک اندر بنیوں سے متعلق Compulsion موجود ہیں حالانکہ تقسیم کی وجہ سے انھیں موقع ملا، کاروباری صلاحیتیں موجود تھیں، چند برسوں میں کروڑ پتی بن گئے۔

شیخ محمد علی میں بڑا ''سنس آف ہیومر'' (Sense of Humour) ہے۔ ایک روز اس موضوع پر بات چل نکلی تو کہنے لگے:

''ایک روز شیخ صاحب ایک گڑھے میں گر گئے۔ گڑھا خاصا گہرا تھا۔ خود بخود باہر نکل نہیں سکتے تھے۔ راہ گیر رک گئے۔ ایک نے کہا: ''شیخ صاحب! دیجیے اپنا ہاتھ۔'' اور اپنا ہاتھ

پھیلا دیا لیکن شیخ صاحب نے اپنا ہاتھ نہ دیا۔ پھر دوسرے، تیسرے، چوتھے نے ہاتھ پھیلا کر کہا: ''شیخ صاحب! دیجیے اپنا ہاتھ۔'' اس کے باوجود شیخ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس پر لوگ حیران ہوئے۔ شیخ صاحب نے کہا: ''یہ نہ کہہ دیجیے اپنا ہاتھ، بلکہ یہ کہو کہ شیخ صاحب لیجیے میرا ہاتھ۔''

یہ سن کر ایک صاحب نے ہاتھ بڑھا کر کہا:

''شیخ صاحب! لیجیے میرا ہاتھ۔''

شیخ صاحب نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور نوجوان نے انھیں گڑھے سے باہر کھینچ لیا۔

یہ دیکھ کر لوگوں نے بڈھے شیخ سے پوچھا کہ جناب! لیجیے ہاتھ اور دیجیے ہاتھ میں کیا فرق ہے۔ کیا بھید ہے؟

''کوئی بھید نہیں پڑتا۔'' شیخ بولا۔ ''بنیا دینے سے ہچکچاتا ہے، لینے پر فٹ راضی ہو جاتا ہے۔''

ڈاکٹر امانت مفتی

ڈاکٹر امانت مفتی میرا ماموں زاد بھائی ہے۔ اگرچہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے لیکن میرا دوست ہے۔ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ وہ شریعت کے حوالے کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا، میں مغرب زدہ تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھے دوست جانتا تھا۔ زندگی میں مجھ پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو میں نے ڈاکٹر امانت کے ہاں پناہ لی۔

حال ہی میں وہ مجھ سے ملا۔ کہنے لگا: ''ایک بات پوچھوں؟''

میں نے کہا: ''پوچھو، ایک نہیں دس پوچھو۔''

کہنے لگا: ''تم تو ادبی آدمی ہو، ہمیشہ ادبی مضامین لکھتے رہے ہو، تم نے مذہب پر لکھنا کیسے شروع کر دیا؟ میں تمھارا سلسلہ وار مضمون ''تلاش'' باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم اس موضوع پر کیوں لکھنے لگے ہو؟''

میں نے کہا: ''ڈاکٹر! میں تو پھنس گیا ہوں، بری طرح سے پھنس گیا ہوں۔''

وہ بولا: ''دیکھ! ٹال مٹول نہ کر، یہ بتا کہ تجھے ہو کیا ہے؟''

میں نے کہا: ''مجھے وہم ہو گیا ہے، شدت کا وہم کہ جب تک میں یہ کام نہیں کروں گا، مجھے چھٹی نہیں ملے گی...... اور ڈاکٹر میں اب جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے بات جاری رکھی۔ ''میں 90 سال کا ہو چکا ہوں۔ میرے اعضا تھک گئے ہیں۔ کہتے ہیں، اب بس کرو، بہت ہو چکا۔ ہم ٹک ٹک کرتے کرتے گھس گئے ہیں۔ وہ سچ کہتے ہیں ڈاکٹر۔ میرے لیے جینا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ بولا ''اس بات کا مذہب پر لکھنے سے کیا تعلق ہے؟''

''ٹھیک کہتے ہو تم۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں وضاحت کرتا ہوں۔''

کشف اور وہم

آج سے چھ سات سال پہلے کی بات ہے، میں بیمار پڑا تھا۔ ہسپتال میں داخل تھا۔ ان دنوں میں ''الکھ نگری'' لکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں الکھ نگری مکمل نہیں کر سکوں گا۔''

''انھی دنوں لاہور کی ایک صالح خاتون صغیرہ شیریں کا مجھے خط موصول ہوا۔ خط میں برسبیل تذکرہ انھوں نے اپنے مرشد شاہ صاحب کا ذکر کیا تھا۔ شیریں نے لکھا کہ شاہ جی بڑے صاحب کشف ہیں۔

''میں نے جواب میں شیریں کو لکھا کہ اگر شاہ جی صاحب کشف ہیں تو ان سے پوچھ کر مجھے بتا کہ کیا میں الکھ نگری مکمل کر پاؤں گا۔''

جواب میں شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے مجھے لکھا کہ ''الکھ نگری ہم نے مکمل شکل میں دیکھ لی ہے۔ ابھی آپ کو ایک اور کتاب تصوف پر لکھنی ہے۔''

''جب الکھ نگری شائع ہو گئی تو ایک سال بعد میں لاہور گیا۔ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے کہا ''شاہ صاحب! یہ آپ نے کیا لکھ دیا ہے کہ ابھی میں نے تصوف پر کتاب لکھنی ہے۔ جناب والا! میں تو ایک منہ زبانی مسلمان ہوں۔ اسلام کے متعلق کچھ بھی

نہیں جانتا۔ دنیاوی علوم میں ادھ پڑھ ہوں لیکن اسلام میں ان پڑھ ہوں۔ میں تصوف پر کیا لکھ سکتا ہوں۔''

شاہ صاحب سمجھاتے رہے کہ انسان یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، حالات بدل جاتے ہیں، رخ بدل جاتے ہیں، مفہوم بدل جاتے ہیں۔

میں نے اپنی رٹ لگائے رکھی۔

آخر وہ تنگ آ کر بولے: ''دیکھو میاں! ہمیں تو جو نظر آیا، ہم نے بتا دیا۔ اب تمھاری مرضی ہے مانو یا نہ مانو۔ لکھو یا نہ لکھو۔''

شاہ صاحب سے ملنے کے بعد میں نے اپنے دل کو تسلیاں دیں۔ میں نے سوچا کشف برحق، لیکن آخری فیصلہ تو اللہ کا ہوتا ہے، Finality rests with God۔ کشف مستقبل کی ادھوری جھلکی ہوتی ہے۔ لہٰذا کشف کو اس حد تک اہمیت دینا مناسب نہیں۔ بہر حال میں نے بڑی محنت سے اس بات کو ٹال دیا، ذہن سے نکال دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

اسلامی دانشور

تین سال گزر گئے۔ ایک روز اسلام آباد کی جانی پہچانی خاتون سرفراز اقبال، متیاز بخاری کے ساتھ میرے گھر آئی۔

سرفراز آتے ہی بولی، ''مفتی! چلو اٹھو، ہمارے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

بولی ''ایک صاحب سے تجھے ملانا ہے۔''

''خواہ مخواہ۔'' میں نے کہا۔ ''میں نہیں ملتا کسی سے۔''

سرفراز میری پرانی سہیلی ہے اور مجھ پر حکم چلانے کی عادی ہے۔ بولی: ''نہیں، ملنا پڑے گا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کو مفتی سے ملاؤں گی۔ یہ بخاری صاحب بڑے افسر ہیں۔ تمھیں ان سے ملانے کے لیے لاہور سے گاڑی لائے ہیں۔''

''وہ ہے کون؟'' میں نے پوچھا۔ ''جس سے مجھے ملنا ہے۔''

بخاری نے کہا: ''پہلے وہ انگریزی لٹریچر کے پروفیسر تھے، میرے دوست ہیں۔''

''بڑا ہی بزرگ ہے وہ۔'' سرفراز بولی۔

بزرگ کا نام سن کر میں ڈر گیا اور فوراً تیار ہو گیا۔

واقعی وہ ایک عالم شخص تھا، اردو اور انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ قرآن تو اس طرح پڑھتا تھا جیسے ماں بولی ہو۔ ساتھ ہی مفہوم سمجھاتا تھا۔ وہ ایک دانشور تھا۔ اس کی اپروچ عقل پر مبنی تھی اور اس کی باتوں میں بلا کا تاثر تھا۔

اس کی عقلیہ باتیں سن کر اور عوامی انداز میں دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ باتیں کرتے کرتے دفعتاً وہ رک گیا۔ میری طرف متوجہ ہوا اور مدھم آواز میں بولا: ''آپ نے مذہب پر ایک کتاب لکھنی ہے۔'' یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

عقیدہ اور عقیدت

چند دنوں کے بعد ایک بزرگ میرے گھر تشریف لے آئے۔ ان کے سر پر بھاری عمامہ تھا، جسم پر لمبا چوغا، انداز رسمی بزرگوں کا سا اور ہاتھ میں دو کتابیں۔ آتے ہی فرمانے لگے:

''دیکھیے، جو کتاب آپ لکھ رہے ہیں، اس میں ہمارا ذکر ضرور کریں۔''

وہ دنوں کتابیں چھوڑ کر خود رخصت ہو گئے۔

اس واقعہ نے میرے اندر ایک ہلچل مچا دی۔ کہیں یہ جال شہاب صاحب کا پھیلایا ہوا تو نہیں ہے؟

قدرت اللہ شہاب زندگی بھر مجھ سے کہتے رہے کہ عقیدت کوئی اچھی چیز نہیں، عقیدہ پالیے۔ جواب میں، میں ان سے کہا کرتا تھا ''شہاب صاحب مجھ میں تو صرف عقیدت ہے، عقیدہ نہیں۔ جو چیز میرے اندر نہیں، اسے میں کیسے پال سکتا ہوں!''

بار بار مجھے خیال آتا کہ شاید شہاب صاحب اس پراسرار طریقے سے مجھے عقیدے

کے متعلق جاننے پر مائل کر رہے ہوں۔

محمد طفیل

پھر ایک واقعہ ہوا۔ ایک روز میں گھر آیا تو پتا چلا کہ کوئی صاحب چند قرآن چھوڑ گئے ہیں۔ دیکھا تو وہ قرآن بہت قیمتی تھے۔ ایک امریکا کا چھپا ہوا تھا، ایک انگلستان کا۔

میں نے بیوی سے پوچھا کہ قرآن کون چھوڑ گئے ہیں؟

اس نے کہا: ''اپنا نام بتا کر نہیں گئے۔''

تقریباً ایک ماہ کے بعد وہ پھر آئے۔

ان کا نام محمد طفیل ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ انڈسٹریلسٹ ہیں۔ قرآن کے پروانے ہیں۔ لوگوں کو قرآن اور اسلامی کتابیں بانٹتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے اسلامی کتابیں مہیا کرنی شروع کر دی اور میں نے مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نا کسی پرچے میں قسط وار مضامین چھپواتا جاؤں۔

قومی ڈائجسٹ کے مدیر انور سدید میرے دوست ہیں۔ انھوں نے میرے مضامین چھاپنے کی ہامی بھر لی، تو ڈاکٹر! میں نے امانت علی سے کہا، میں گذشتہ تین سال سے اسلام پڑھ رہا ہوں۔ کتابیں لکھنے والے اونچی باتیں کرتے ہیں۔ علم چھانٹتے ہیں۔ دانشوری جتاتے ہیں۔ مصنف علما کے لیے لکھتے ہیں، مجھ ایسے مبتدی کے لیے کوئی نہیں لکھتا۔ اسلام پر لکھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مجھے یہ حوصلہ تھا کہ صرف کتاب لکھنے کی شرط لازم ہے۔ اس بات پر کوئی پابندی نہیں کتاب کیسی ہو؟ ٹھیک ہو یا غلط، سرسری ہو یا بامعنی۔

باندھ کر مروایا

ڈاکٹر! میری کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے تذکرہ غوثیہ کے حکیم کی تھی۔

''نقل ہے کہ ایک آدمی بہت غریب تھا۔ سارا دن دوڑ بھاگ کرتا لیکن مزدوری نہیں ملتی تھی۔ ملتی بھی تو معاوضہ اس قدر قلیل ہوتا کہ پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوتا۔ وہ اس مشقت سے اکتا گیا، زندگی سے اکتا گیا۔ اس نے سوچا، ایسے جینے سے مر جانا بہتر ہے۔

ایک روز وہ خودکشی کے ارادے سے جنگل کی طرف چل پڑا۔ گلے میں پھندا ڈالا، لٹکنے کے لیے چھلانگ لگانے والا ہی تھا کہ عزرائیل نمودار ہوا۔

عزرائیل بولا: ''میاں یہ کیا کر رہا ہے تو! تجھے نہیں پتا کہ خودکشی حرام ہے۔''

وہ بولا: ''جناب کیا کروں! پیٹ بھرنے کے لیے روٹی نہیں ملتی، بھوکوں مرنے سے تو خودکشی بہتر ہے۔''

عزرائیل نے کہا: ''اگر تجھے کھانے کو روٹی مل جائے تو خودکشی سے باز آ جائے گا کیا؟''

مزدور نے کہا: ''میں کیا پاگل ہوں کہ پھر خودکشی کا سوچوں۔''

عزرائیل نے کہا: ''اچھا تو تو حکیم بن جا۔ جب تو مریض کو دیکھنے جایا کرے گا تو ہم تجھے نظر آ جایا کریں گے۔ اگر ہم مریض کے سرہانے کھڑے ہوں تو سمجھ لینا کہ مریض کو شفا حاصل ہوگی، پھر تو اسے کوئی سے پڑیا دے دیا کرنا، وہ صحت مند ہو جائے گا اور اگر ہم مریض کی پائینتی پر کھڑے نظر آئیں تو جان لینا کہ مریض کا وقت پورا ہو چکا۔''

عزرائیل کے کہنے کے مطابق مزدور حکیم بن گیا۔ اس کی حکمت اتنی کامیاب ہوگئی کہ شہر بھر میں اس کا چرچا ہو گیا۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی تو بادشاہ نے اسے آزمایا۔ آزمائش میں وہ پورا اترا تو بادشاہ نے اسے شاہی حکیم مقرر کر دیا۔

ایک روز حکیم صاحب خود بیمار پڑ گئے۔ پھر جو آنکھ اٹھائی تو دکھا کہ عزرائیل ان کی پائینتی پر کھڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر حکیم صاحب گھبرا گئے۔ انھوں نے سرہانہ اٹھا کر پائینتی پر رکھا اور رخ بدل کر لیٹ گئے۔

پھر جو دیکھا تو عزرائیل پھر پاؤں کی طرف کھڑے تھے۔

حکیم صاحب نے پھر سرہانہ بدل لیا۔

گھر والوں نے دیکھا کہ حکیم صاحب بار بار سرہانہ بدل رہے ہیں تو وہ گھبرا گئے۔ وہ کسی اور حکیم کو بلا لائے۔ معالج نے آتے ہی دیکھ کر کہا کہ سرسام کا دورہ پڑا ہے۔ ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ لہٰذا انھیں چارپائی پر باندھ دو تا کہ بار بار دیوانہ وار رخ

نہ بدلیں۔

گھر والوں نے معالج کے حکم کے مطابق حکیم صاحب کو چارپائی پر باندھ دیا۔

اس پر حکیم صاحب نے بڑی بے بسی سے منہ پر ہاتھ پھیر کر عزرائیل سے کہا:

''حضور! میں ہرگز نہ مرتا، لیکن گھر والوں نے باندھ کر مروا دیا۔''

تو ڈاکٹر! یہی میری کیفیت ہے۔ اس موضوع پر لکھنے کی جسارت میں کبھی نہ کرتا لیکن بزرگوں نے باندھ کر مروا دیا۔

وسعت ہی وسعت

ڈاکٹر امانت نے کہا: ''اچھا تو تم تین سال سے اسلام پڑھ رہے ہو! کیا اسلام کے متعلق کچھ پتا چلا؟''

''کچھ پتا نہیں چلا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''پہلے جب میں اسلام سے واقف نہ تھا تو کچھ کچھ پتا تھا۔ اب بالکل ہی کنفیوز ہو گیا ہوں۔''

''مثلاً پہلے کیا پتا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''مثلاً پہلے اسلام میری نظر میں ایک چھوٹا سا خوبصورت سا سنگ مرمر کا تالاب تھا، لیکن اب...... اب تو وہ بے کراں سمندر نظر آتا ہے، وسعت ہی وسعت۔''

''مجھے ایسے لگتا ہے ڈاکٹر، جیسے اسلام شالیمار باغ کے مانند ہو جس میں کئی ایک تختے ہیں۔ ایک میں خوبصورت درخت ہیں، پارک ہیں، روشیں ہیں۔ دوسرے میں سنگ مرمر کی بارہ دری ہے، تالاب ہیں، فوارے ہیں۔ تیسرے میں جنگل کا سماں ہے۔ سچی بات یہ ہے ڈاکٹر کہ میں بات سمجھا نہیں سکتا۔ مطلب ہے جو میرے جیسے کلمہ گو ہیں، وہ بھی مسلمان ہیں۔ جو نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، وہ بھی مسلمان ہیں۔ جو دنیا کو تیاگ کر عبادات میں مصروف ہیں، وہ بھی مسلمان ہیں جو اسلامی اصولوں کے مطابق دنیاوی زندگی گزار رہے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں اور جو اللہ کے عشق میں دیوانے ہو رہے ہیں، وہ بھی مسلمان ہیں۔ عجب گورکھ دھندہ ہے۔''

بشریت اور ڈیوائن

''عیسائیت کہتی ہے کہ اگر کوئی تمھارے منہ پر تھپڑ مارے تو اسے دوسرا گال پیش کر دو۔ یہ بات بشریت کے منافی ہے۔ اسلام بشریت کے منافی نہیں۔ اسلام کہتا ہے، اگر کسی نے تم سے زیادتی کی ہے تو بے شک انتقام لو۔ یہ تمھارا حق ہے، لیکن صرف اتنی زیادتی کرو جتنی تم سے کی گئی ہے، اس سے زیادہ نہیں...... لیکن اگر تم معاف کر دو تو یہ افضل ہے۔ ہر بات میں اسلام کا رویہ ایسا ہی ہے کہ اگر تم انتقام لینا چاہو تو تمھیں حق حاصل ہے بشرطیکہ جتنی زیادتی تم پر ہوئی ہے، اس سے نہ بڑھو، لیکن اگر معاف کر دو تو افضل ہے۔ اسلام بشریت کے تقاضے کو تسلیم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی بشریت سے بے نیاز ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ ایک ہاتھ بشریت پر ہے، دوسرا Divine پر۔

''اتنی وسعت ڈاکٹر کہ حد ہے۔ تم بتاؤ ڈاکٹر! تم ساری عمر اسلام جیے ہو، کیا تمھیں سمجھ میں آیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟''

ڈاکٹر امانت مسکرایا، بولا: ''ممتاز! میں تو صرف یہ سمجھا ہوں کہ اسلام کا مطلب ہے ''محمد ﷺ''۔

-☆-

خطوط

تلاش...... خدا کی، سچائی کی، دانش کی یا پھر اپنے آپ کی۔ کوئی دانش ہے کہ اس سلسلہ ہائے مضامین میں موجزن ہے، کوئی روشنی ہے کہ دلوں کو منور کر رہی ہے۔ ممتاز مفتی اب ایک لیجنڈ کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ مردوں میں ایک زندہ شخص اور زندوں میں زندہ دل۔ یہ سلسلہ تادیر جاری رہنا چاہیے۔

محمد شفیع بلوچ

اٹھارہ ہزاری، جھنگ

ممتاز مفتی صاحب کا ''تلاش'' ان کی مخصوص ذہنی سوچ اور منفرد اسلوب کا حامل سلسلہ ہے۔ اللہ تادیر ایسی تحریریں سپرد قلم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ''ورثے کی تلاش'' انتہائی دلچسپ تحریر ہے اور گذشتہ اقساط کی طرح قاری کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں کرتی۔

یوسف خالد

سرگودھا

ممتاز مفتی صاحب کا مضمون ''تلاش'' سیکولرانہ جذبات سے لبریز، اور غیر متوازن ہے۔ اس میں علمائے دین پر بھرپور تنقید بہ انداز تنقیص کی گئی ہے۔ انھیں جاہل، کور ذوق، زمانہ ناشناس، مفاد پرست وغیرہ جیسے ''اعزازات'' سے نوازا گیا ہے اور کوئی استثنا نہیں کیا گیا۔

معاشرے کے دوسرے شعبوں کی طرح اہل دین میں بھی یقیناً زوال رونما ہو گیا ہے اور نااہل افراد کی اس میں دورائے ہیں اور بحیثیت مجموعی اہل دین طبقہ علمی اور عملی اور سیرت و کردار کے پہلو سے انحطاط کا شکار ہو گیا ہے لیکن صرف اہل دین طبقہ ہی نہیں، دوسرے طبقات میں بھی علم و عمل اور سیرت و کردار کا زوال رونما ہوا ہے۔

دوسری چوک جو مفتی صاحب سے ہوئی ہے، یہ ہے کہ اس دور کے زوال دیدہ یا نام نہاد علما کا موازنہ ان صوفیائے کرام سے کیا ہے جو صدیوں پہلے گزر چکے ہیں۔ آج کے نام نہاد صوفیا کی طرف مفتی صاحب کی نظر کیوں نہیں اٹھی۔ کیا وہاں زوال و انحطاط نہیں ہے اور کیا وہاں سیرت و کردار کا کوئی بحران نہیں؟ اگر محترم مفتی صاحب غیر جانبدارانہ نظر ڈالتے تو انھیں اندازہ ہوتا کہ بڑے بڑے جبوں اور عطر میں بسے ہوئے پر تکلف لباس میں کتنا تعفن ہے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

محترم ممتاز مفتی صاحب نے جن علماء پر تنقید کی ہے، وہ علماء نہیں، نیم خواندہ اور ضرورت مند لوگ ہیں۔ وہ بدکردار اور بے عمل ہیں لیکن اس میں معاشرے کا بھی ہاتھ ہے۔ عام طور پر مسجد، اس کا نظام اور اس کی دیکھ بھال ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہوتی۔ جو طالب علم یا موقع پرست ضرورت مند روٹی اور چند ٹکوں پر آ جائے، ہم سمجھتے ہیں وہی ٹھیک ہے۔

شیخ امتیاز احمد

ملتان روڈ، لاہور

ممتاز مفتی صاحب کے منفرد سلسلہ تحریر کی دوسری کڑی دیکھنے کے بعد شدت سے انتظار ہونے لگا ہے۔ ان کے اسلوب تحریر کا امتیازی پہلو یہی ہے کہ وہ ٹھوس موضوعات پر بھی بہت سلیس اور بے تکلفی کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔ بات چیت کا یہ انداز بڑی بڑی حقیقتوں سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ ''تلاش'' کے سلسلہ تحریر میں ایک جملہ بھی بھرتی کا نہیں۔

خالد ہمایوں

لاہور

قومی ڈائجسٹ شمارہ اکتوبر 1993ء کے مضامین میں سے تلاش، خاکے، الیکشن ریکارڈ (مفتی، یونس بٹ، امین) کس کو کس پر ترجیح دی جائے، ایک سے بڑھ کر ایک۔ آپ نے دل خوش کر دیا۔ انعام کے لالچ سے قطع نظر، قومی ڈائجسٹ کو ڈائجسٹوں کا بادشاہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اللہ کرے زورِ ڈائجسٹ اور زیادہ۔

عبدالوحید ملک

گلشن اقبال، کراچی

قومی ڈائجسٹ شمارہ اکتوبر 1993ء کے مضامین میں سے میری پسند کا بہترین مضمون ''تلاش'' از ممتاز مفتی ہے۔ ممتاز مفتی کی تحریروں میں ایسا سفاکانہ سچ ہوتا ہے کہ ان پر جھوٹ کا گمان ہوتا ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ ایک سچے اور کھرے فنکار۔ قدرت نے انھیں فی الواقع بہت سی خوبیاں عطا کی ہیں۔ ان سے مستقل لکھوانے کا بندوبست کر کے آپ نے یقیناً معرکے کا کام کیا ہے۔

محمد شفیع بلوچ

موضع درگاہی شاہ، تحصیل و ضلع جھنگ

قومی ڈائجسٹ شمارہ اکتوبر 1993ء کے مضامین میں سے میری پسند کا بہترین مضمون ''تلاش'' از ممتاز مفتی ہے۔ اتنے بزرگ مصنف میں شباب کی تازگی اور بچوں جیسی جستجو قابل قدر اور نسبتاً نایاب بھی ہے۔ ممتاز مفتی واقعی بڑے آدمی ہیں۔

افضل اقبال (ڈاکٹر)

سٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

☆